بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

اللہ نے کن باتوں کو حرام کیا ہے

''کہہ دو کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو، ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ اور سرکشی کو اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور اس کو بھی کہ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں۔'' (سورۃ اعراف: ۷۔۳۳)

ظالموں کا بدلہ

''بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ ہی وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے (جو ناممکن ہے) اور اسی طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیتے ہیں۔ ان کے لیے جہنم کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر جہنم ہی اوڑھنا ہے۔ اسی طرح ہم ظالموں کو بدلہ دیتے ہیں۔ (سورۃ اعراف: ۷۔۴۰)

رسول ﷺ کا فرمان

درخت لگانے کا اجر

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی اُگاتا ہے، تو اس میں سے کوئی پرندہ یا چوپایہ (جانور) جو کچھ کھاتا ہے وہ اس لگانے والے کی طرف سے صدقہ ہوتا ہے اور اسے اس کا ثواب ملتا ہے۔

(بخاری کتاب: ۴۱۔ باب: ۱، مسلم کتاب المساقات باب ۲)

مومن کا قتل

حضرت ثابت بن ضحاکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''مومن پر لعنت بھیجنے کا گناہ مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ نیز مومن پر کفر کی تہمت لگانے یعنی کافر کہنے کا گناہ بھی مومن کو قتل کرنے کے برابر ہے۔'' بخاری کتاب: ۷۸۔ باب: ۴۴، مسلم کتاب الایمان۔ باب ۴۵)

اُردو ڈائجسٹ

دسمبر 2014ء
صفر المظفر 1436ھ
جلد نمبر 54 شمارہ نمبر 12

www.urdudigest.pk urdudigest.com

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: سید عاصم محمود
سب ایڈیٹر: غلام سجاد
مجلس تحریر: حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمٰی اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
پروف خوان: خالد محی الدین
ڈیزائنر، کمپوزر: عبدالرحمٰن، اشرف سکندر

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: محمد سلیمان احمد 0300-4116792
لاہور: ندیم حامد گوجرانوالہ: احسان اللہ بٹ
اسلام آباد: مجید سلیم کراچی: شازیہ قمر 0345-2558648

سالانہ خریداری

560 روپے کی بچت کے ساتھ
subscription@urdu-digest.com خریداری کے لیے رابطہ
19/21 ایکز سکیم سمن آباد، لاہور فون: 92 42 37589957
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
بیرون ملک 160 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 • فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

قیمت 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

”انقلابی تبدیلی“

لاہور میں جماعت اسلامی کے تین روزہ اجتماع نے پورے ملک سے آئے جماعت کے کارکنوں اور ووٹروں کے دلوں میں جذبہ اور ولولہ تازہ کر دیا ہے۔ آپ کو فروری ۲۰۱۴ء میں مولانا سراج الحق کا امیرِ جماعت بننے سے پہلے اُردو ڈائجسٹ کے لیے انٹرویو یاد ہو گا جس کے ذریعے بہت سے قارئین کو پہلی مرتبہ اُن کی سحرانگیز شخصیت کو جاننے کا موقع ملا۔ بظاہر شرمیلے نظر آنے اور دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے والے مولانا سراج الحق کی شخصیت عام آدمی کے لیے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ اُن کا ماضی غربت کے اندھیروں میں گزرا۔ بکریاں چرانے سے لے کر محنت مزدوری کرنے تک تمام مراحل سے گزر کر وہ امارت کے منصب تک پہنچے ہیں۔ انھوں نے خیبر پختونخوا میں وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اُن کی پشت پر ایک فکری اور تنظیمی طاقت بھی موجود ہے۔ اُنکی سے ملتی جلتی خصوصیات کی بنا پر ہی چائے بیچنے والے نریندرا مودی کو بزنس ورلڈ اور عوام نے بھارت کا اقتدار سونپا ہے۔

اجتماع کے آخری روز مولانا سراج الحق نے اپنے خطاب میں موجودہ نظام کو بھی للکارا اور مودی کے علاوہ امریکی صدر اوباما بھی اُن کی شعلہ بیانی سے محفوظ نہ رہے۔ انھوں نے عوام کو شکوے سے لبریز نصیحت بھی کی کہ ووٹ ڈالتے اور اپنے نمائندوں کو منتخب کرتے وقت شرافت، دیانت اور اہلیت کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اور برملا کہا کہ ہماری پشت پر بندوق ہے نہ دولت...... انھوں نے عوام کے بے شمار مسائل کا تفصیل سے ذکر کیا اور نوید دی کہ اسلامی نظام کے نفاذ ہی سے تمام مسائل حل ہوں گے اور دعویٰ کیا کہ ان کے پاس اس نظام کو نافذ کرنے کے لیے ٹیم موجود ہے اور تجربہ اور صلاحیت بھی۔ ان کے خطاب میں سچائی جھلک رہی تھی لیکن تقریباً اسی طرح کے انقلاب کا دعویٰ ڈاکٹر طاہر القادری اور عمران خان بھی کر رہے ہیں......

مگر سوال یہ ہے کہ یہ ”تبدیلی“ یا ”انقلاب“ کیسے لایا جائے؟ دراصل ہمارا معاشرہ کسی بھی طرح کی انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہی نہیں۔ ہمارا ماضی اس بات کا گواہ ہے کہ جنرل ایوب خاں اور جنرل پرویز مشرف نے کمال اتاترک کے ماڈل کو بنیاد بنا کر نظام میں بڑی

تبدیلی لانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ جنرل ضیاالحق نے اسلام کے نام پر کئی سال حکومت کی لیکن تبدیلی کا موتی ہاتھ نہ آ سکا۔ ذوالفقار علی بھٹو غریب عوام کے کندھوں پر بیٹھ کر روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ تو لگاتے رہے لیکن سوائے صنعتوں اور تعلیمی اداروں کو قومیانے اور کاروباری افراد کو نفرت کا نشان بنانے کے قوم کو کچھ نہ دے سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کی ساٹھ فیصد آبادی دیہات سے وابستہ ہے۔ جہاں لوگ آج بھی ذات برادری مسلک اور قبائل کی بنیاد پر گروہوں میں تقسیم ہیں۔ جبکہ شہروں میں مقیم آبادی کا بڑا حصہ بھی اس تقسیم کے اثرات سے محفوظ نہیں۔ عوام ان گروہوں سے جڑ کر خود کو محفوظ اور توانا محسوس کرتے ہیں جہاں ان کے مفادات کا بڑی حد تک تحفظ کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ کسی بھی انقلاب یا تبدیلی کو ناکام بنانے میں سرگرم ہو جاتے ہیں جو ان کے مفادات سے ٹکراتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام جماعتیں جو ملک میں "انقلابی تبدیلی" لانا چاہتی ہیں وہ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہوں اور عوام کے سامنے اس "تبدیلی یا انقلاب" کا پورا پروگرام اور عملی خاکہ پیش کریں۔ اس پر تمام مکاتب فکر اور شعبوں کے تھنک ٹینک سیر حاصل بحث کر کے لوگوں کے خدشات دور کریں اور پھر اس پر عمل درآمد کے لیے آئین میں تبدیلیوں کا پیکج تیار کیا جائے۔ دھرنوں اور جلسوں کے ساتھ ساتھ فکری سوچ بچار کرنا بھی ضروری ہے تاکہ تبدیلیوں کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹوں اور ان کے سدباب کی نشاندہی ہو سکے۔ اس دوران حکومت کے ساتھ بیٹھ کر "میثاق معیشت" بھی کیا جائے تاکہ آنے والے دنوں میں حکومت یکسوئی سے معاشی نظام چلائے اور عوام کی تکالیف میں کمی لائی جا سکے۔ جذباتی نعروں، استعفوں، دھرنوں، جلسوں اور میڈیا ٹاک شوز میں مسائل صرف اجاگر کرتے رہنے سے انقلاب لانا ممکن نہیں بلکہ اس متواتر منفی "ہیمرنگ" سے عوام میں فرسٹریشن اور ہیجان بڑھتا جائے گا نتیجتاً تبدیلی کی تڑپ رکھنے والے کروڑوں نوجوان اپنے مستقبل سے مایوس ہو جائیں گے اور ان کا اپنی ذات برادری، قبیلہ یا مسلک سے تعلق مزید گہرا ہوتا چلا جائے گا۔

"انقلاب" کی داعی جماعتوں کی طرف سے کسی بھی طرح کی جلد بازی یقیناً "تبدیلی" کے راستے دشوار تر بنائے گی اور ملک میں انتشار پھیلانے کا موجب بنے گی۔

طیب اعجاز قریشی
tayyab.aljaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اٹھائیے

فہرست

فہرست

اسلامی زندگی کی کہکشاں

الرزاق

تعمیرات

جنگ ستمبر ۱۹۷۱ء

فہرست

اُردو ادب

طب و صحت

رنگارنگ تحریریں

مستقل سلسلے

الیکشن کمیشن کا مستقبل

جمہوریت میں عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے اور اُن کے ذریعے حکومت کو حکمرانی کا مینڈیٹ دیتے ہیں۔ یوں پُرامن انتخابات ہی پُرامن انتقالِ اقتدار کی ضمانت ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے دستور میں الیکشن کمیشن کو شفاف' منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کرانے کی ذمے داری سونپی گئی ہے اور اس کام کے لیے اُسے لامحدود اختیارات بھی تفویض کیے گئے ہیں' مگر وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں بالعموم ناکام رہا اور اس کی انتظامی نااہلی اور کم نگاہی کی افسوس ناک مثالیں سامنے آتی رہی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ذمے داریوں کے انبار کے مقابلے میں اس کی استعدادِ کار محدود ہونا ہے۔ دوسرا اہم سبب اس کی غیر موزوں ہیئت ترکیبی ہے۔ انتخابات کا انعقاد سرتاپا ایک انتظامی معاملہ ہے جس سے اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے حامل افراد ہی ٹھیک طور پر نبرد آزما ہو سکتے ہیں' مگر جب ۱۹۷۳ء کا دستور تدوین کے مراحل میں تھا تو جسٹس حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ نے عدلیہ کے وقار میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا اور یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ عدلیہ کی زیرِنگرانی انتخابات بڑی حد تک غیر جانب دار' آزاد اور منصفانہ ہوں گے' چنانچہ آئین میں اعلیٰ عدالتوں کے ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل ایک الیکشن کمیشن فراہم کیا گیا جس میں شروع ہی سے خرابی کی ایک صورت مضمر تھی۔

ہم اپنے اداریوں میں اس خرابی کی نشاندہی کرتے آئے ہیں کہ ہمارا الیکشن کمیشن اپنی موجودہ شکل میں عالمی معیار کے مطابق انتخابات کرانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا' اس لیے آئین میں ترمیم کر کے اس کی ہیئت جلد سے جلد تبدیل کی جائے۔ جن دنوں چوری چھپے اٹھارھویں ترمیم کا مسودہ تیار ہو رہا تھا جس میں دستور کی ۱۰۳ کے لگ بھگ شقیں تبدیل کی جانے والی تھیں' ہم نے الیکشن کمیشن کی ہیئت ترکیبی میں ناگزیر ردوبدل کا مشورہ دیا اور اس ضمن میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل افیئرز (پائنا) کے تحت متعدد سیمینار بھی منعقد ہوئے جن میں سول سوسائٹی کی ممتاز شخصیات کے علاوہ آئین اور قانون کے ماہرین بھی شریک ہوئے تھے۔ اٹھارھویں ترمیم کی تیاری میں چونکہ غیر معمولی رازداری سے کام لیا گیا' اس لیے اس پر کھلی بحث نہ ہو سکی اور ترامیم تجویز کرنے والی کمیٹی کے ارکان پر یہ خوف طاری رہا کہ اگر الیکشن کمیشن سے جج نکال دیے گئے' تو چند روز بعد افتخار محمد چودھری پورے آئینی پیکج ہی کو مسترد کر دیں گے اور یوں صوبائی خودمختاری کا انتہائی حساس معاملہ سبوتاژ ہو جائے گا۔ غضب یہ کہ اس اٹھارھویں ترمیم کے ذریعے چیف الیکشن کمشنر کو بالکل بے دست و پا کر دیا گیا جس کے مہلک نتائج کا ہم ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے بعد سے سامنا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ چیف الیکشن کمشنر ریٹائرڈ جسٹس فخر الدین۔ جی۔ ابراہیم' جو اپنی دیانت اور اصول پسندی کی عظیم شہرت رکھتے تھے' وہ الیکشن کمیشن کے ارکان کے سامنے بالکل بے بس نظر آئے اور اُن کا انتخابی مشینری پر سے کنٹرول ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس قدر عمر رسیدہ تھے کہ آرمی چیف جنرل پرویز کیانی کو بھی نہ پہچان سکے جن کے ... تو انھوں نے اہم امور پر دو گھنٹے گفتگو کی تھی۔ اب یہ بھی

انکشاف ہوا ہے کہ ریٹرننگ آفیسرز جو انتخابی نتائج کی تیاری میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، ان پر الیکشن کمیشن کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ان حالات میں انتخابی بے ضابطگیوں کا ارتکاب کسی قدر ایک ناگزیر عمل معلوم ہوتا ہے۔

اب ہم ایک ایسے نازک موڑ پر آکھڑے ہیں جب الیکشن کمیشن کا وجود ہی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ چیف الیکشن کمیشن کا آئینی عہدہ ڈیڑھ سال سے خالی رہا جبکہ قائم مقام چیف الیکشن کمشنر کام چلاتے رہے ہیں۔ اس دوران وزیراعظم اور قائد حزب اختلاف نے اس اہم عہدے کے لیے کسی شخصیت پر اتفاق کرنے کا عمل شروع ہی نہیں کیا اور جب سپریم کورٹ نے اپنے جج کو واپس بلانے کی دھمکی دی جو قائم مقام الیکشن کمشنر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے' تو مشاورت کا سلسلہ بہت دیر سے شروع ہوا۔ ایک شخصیت پر اتفاق بھی ہو گیا تھا' مگر عمران خاں کے ایک غیر ذمے دار بیان کے بعد اس شخصیت نے ذمے داریاں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عدالت عظمیٰ نے اب ۵ دسمبر کی آخری ڈیڈ لائن دی ہے' مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھی ریٹائرڈ جج کانٹوں کا تاج پہننے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ اگر ہو بھی گئے' تو بنیادی مسئلہ اپنی جگہ قائم رہے گا کہ جج صاحبان ایک روز میں اتنے بڑے ملک میں حسن و خوبی سے انتخابات کرانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

اب ہماری سیاسی قیادت کو وقتی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر فیصلے کرنے کی روایت قائم کرنا ہو گی۔ تقریباً سبھی جماعتیں اس امر پر متفق ہیں کہ الیکشن کمیشن کو اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور اچھی شہرت کے حامل افراد پر مشتمل ہونا چاہیے جیسا کہ بھارت میں ہے۔ جب یہ عمومی اتفاق رائے موجود ہے' تو دستور میں مطلوبہ ترمیم چند روز کے اندر کی جا سکتی ہے۔ اٹھارھویں ترمیم صرف دو روز کے اندر منظور کر لی گئی تھی۔ آئین میں ترمیم کے بعد چناؤ کا دائرہ وسیع ہو جانے کی صورت میں چیف الیکشن کمشنر کا تقرر نسبتاً آسان اور برمحل ہو گا' البتہ مشاورت ''ان کیمرا'' ہونی چاہیے اور کسی بھی صاحب کو برسرعام بیان دینے کی اجازت میسر نہ ہو۔ مناسب یہ ہو گا کہ الیکشن کمیشن کے ارکان بھی مستعفی ہو جائیں تاکہ اُن کی جگہ وہ اشخاص لائے جا سکیں جن پر بڑی سیاسی جماعتوں کا اتفاق ہو۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد الیکشن کمیشن پر جو بارگراں ڈال دیا گیا ہے' اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُسے مالی اور افرادی وسائل بھی فراہم کرنا ہوں گے اور جدید ٹیکنالوجی سے استفادے کے لیے اسے ماہرین کی بھی ضرورت ہو گی۔ الیکٹرانک مشینوں کا استعمال بھی گہرے غور و خوض کا تقاضا کرتا ہے۔ الیکشن کمیشن میں اصلاحات پورے انتخابی عمل کے اندر اصلاحات کا ایک اہم حصہ ہیں جن کی موثر عمل درآمد کے لیے دوسرے ممالک میں ہونے والے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ہم اگر مضبوط بنیادوں پر الیکشن کمیشن کی تشکیل اور اسے حقیقی معنوں میں آزاد اور خود مختار بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انتخابات کے وقت نگران حکومتیں قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ ۲۰۱۳ء میں نگران حکومتوں کا تجربہ حد درجہ ناکام ثابت ہوا ہے جو الیکشن کمیشن کو موثر اعانت فراہم کرنے میں بُری طرح ناکام رہی ہیں۔ ہم بڑی جدوجہد کے بعد ایک ایسے وزیراعظم دریافت کر سکے تھے جن کی عمر ۹۰ سال کے لگ بھگ تھی اور جنھیں اپنے انتخابی حلقے کا بھی علم نہیں تھا۔ ان نگران حکومتوں کی ناتجربے کاری اور انتظامی بدنظمی نے بھی انتخابات پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہمیں ان سنگین مسائل کا حل ہلڑ بازی کے بجائے آئینی طریقوں سے نکالنا اور انتخابات کو بازیچہ اطفال بنانے سے کلی طور پر اجتناب کرنا ہو گا۔

الطاف حسن قریشی

انگریزی اور فرانسیسی لٹریچر کی شناور

تربیت یافتہ پائلٹ

سیاسی جدوجہد میں قید و بند

سے گزرنے والی ایم کیو ایم کی سینیٹر

محترمہ نسرین جلیل

انٹرویو: الطاف حسن قریشی، طیب اعجاز قریشی

نسرین

جلیل سے بہت پہلے میری ان کے والد جناب ظفرالحسن لاری سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم جب مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو وہ یہاں بطور ڈپٹی کمشنر تعینات تھے۔ تب تو اُن سے ملنے کی ہمت نہ کر سکا' لیکن جب ۱۹۵۲ء میں میری محکمہ انہار سیکرٹریٹ لاہور میں تعیناتی ہوئی' تو اس وقت تھل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی قائم ہو چکی تھی اور ظفرالحسن اس کے پہلے سربراہ تھے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ ایک روز محکمہ انہار کے اعلیٰ افسروں سے ملنے سیکرٹریٹ آئے' تو ہمارے ٹیلی گراف آفس میں بھی آ گئے۔ اُن سے تھل کے مستقبل پر بات ہوئی کہ ان دنوں وہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا' جنھیں سیراب کرنے کے لیے نہر تعمیر کی جا رہی تھی۔ انھوں نے مژدہ سنایا کہ ایک وقت آئے گا جب یہ علاقہ گل و گلزار بن جائے گا اور یہاں کی زمین سونا اُگلنا شروع کرے گی۔ ہمیں ان کی روشن آنکھوں نے بہت متاثر کیا اور ان کے اس عزم نے ہمارے اندر وطن کی تعمیر کا جذبہ تیز تر کر دیا کہ پاکستان کو ایک عظیم الشان ریاست بنا کے دم لیں گے۔

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں تین مسلم نوجوانوں نے ایک ہی سال اپنے اپنے مضمون میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی اور بعدازاں انھوں نے عملی زندگی میں نہایت بلند مقام حاصل کیا۔ نوجوان ظفر احمد انصاری نے ایم اے فلسفے میں ٹاپ کیا تھا جو بعد میں مولانا ظفر احمد انصاری کے نام سے معروف ہوئے۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ میں تحریک پاکستان کے لیے بہت فکری کام کیا' پاکستان کی دستور سازی میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور پوری اسلامی دنیا میں دینی عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ جناب ظفرالحسن نے ایم اے اکنامکس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ آئی سی ایس میں آ گئے اور پاکستان کے اندر انفراسٹرکچر کی تعمیر میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیے۔ تیسرے نوجوان غالباً اقبال حسین تھے جو پولیٹکل سائنس میں اوّل آئے اور انڈیا میں سپریم کورٹ کے جسٹس کے عہدے تک پہنچے تھے۔

جناب ظفرالحسن سے ملاقات ہوئے چار عشرے بیت گئے۔ ایک دن میں نے اخبارات میں پڑھا کہ ایم کیو ایم نے جنرل سیٹ پر نسرین جلیل کو سینٹ کا ممبر منتخب کر لیا ہے جو ایک پڑھی لکھی سیاسی شخصیت ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ظفرالحسن کی صاحبزادی ہیں جن کی پیدائش لاہور میں ہوئی تھی۔ اُن کے ساتھ میری پہلی ملاقات اپنے عزیز دوست حسن امام کے ذریعے ہوئی جو سرکاری طور پر اُن کے ساتھ وابستہ تھے۔ انھوں نے مجھے ایک بار اپنے گھر عشائیے پر دعوت دی اور میں نے اپنے محترم دوست ڈاکٹر شفیق احمد کے ہمراہ اس میں شرکت کی جہاں جلیل صاحب کے علاوہ غازی صلاح الدین صاحب سے بھی نہایت خوشگوار ماحول میں ملاقات ہوئی۔ پھر نائن زیرو پر بھی نسرین جلیل صاحبہ سے کئی بار ملنا جلنا رہا۔ مجھ پر یہ راز بھی کھلا کہ انھوں نے طیارے اڑانے کی تربیت بھی حاصل کر رکھی ہے۔ مجھے ان میں بہت ساری خوبیاں نظر آئیں اور یہ لگا کہ وہ ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں اور اُن کی ذات میں حیرت انگیز راز اور کمالات چھپے ہوئے ہیں۔ اُن سے انٹرویو کے لیے درخواست کی تو وہ خوشی سے رضامند ہو گئیں اور میں اور عزیزم طیب اعجاز ۲۱ نومبر کی صبح گیارہ بجے ان کی اقامت گاہ پر پہنچ گئے جو ڈیفنس کراچی میں واقع ہے۔

گفتگو عمران خاں کے دھرنوں اور جلسوں سے شروع ہوئی۔ نسرین جلیل صاحبہ نے کہا کہ اُن سے کچھ آگاہی تو آئی ہے اور لوگوں میں بات کرنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوا ہے، لیکن پی ٹی آئی کے پڑھے لکھے لوگ اب پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے ہیں۔ چند روز پہلے مجھے نیشنل بینک کے پریذیڈنٹ ملے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ عمران خاں کی حمایت میں کمی آئی ہے کیونکہ وہ متضاد باتیں اور نازیبا زبان استعمال کرنے لگے ہیں۔ نوجوان اس اُمید پر کھنچے آتے تھے کہ تبدیلی آئے گی مگر وہ دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے دائیں بائیں وہی جانے پہچانے لوگ ہیں جو اسٹیٹس کو کی علامت ہیں۔ طیب اعجاز نے رائے دیتے ہوئے کہا کہ بیداری سے زیادہ لوگوں میں ہیجان پیدا ہوا ہے اور دھرنوں اور جلسوں میں کنسرٹ نوجوانوں کے لیے تفریح کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی جماعتوں کی بے عملی سے جو بہت بڑا خلا پیدا ہوا تھا اس میں ان دنوں محض جذبات کی حکمرانی ہے۔

نسرین صاحبہ کے تکلف برطرف اندازِ گفتگو سے اُن کے ابتدائی زندگی کے حالات خاندانی اور تعلیمی پس منظر معلوم کرنے کی خواہش کا مبلانے لگی۔ انھوں نے کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر اپنی زندگی کے اوراق پلٹنا شروع کر دیے:

"یوپی کے اندر الٰہ آباد کے قریب ایک گاؤں لار واقع ہے۔ ہمارے اجداد کا تعلق وہیں سے ہے۔ گاؤں میں چونکہ صرف آٹھویں جماعت تک تعلیم تھی اس لیے وہاں کے بچے پڑھنے کے لیے باہر اپنے رشتے داروں کے پاس جاتے تھے۔ میرے بڑے ابا تب وکیل تھے۔ رشتے داروں کے بچے پڑھنے کے لیے آتے، تو ان کے پاس ٹھہرتے۔ ان کی بھی وہی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی جو وہ اپنے بچوں کے ساتھ کرتے تھے۔ میرے والد صاحب نے ۱۹۳۲ء میں آئی سی ایس کا امتحان دیا۔ وہ الٰہ آباد اور علی گڑھ یونیورسٹی سے پڑھے تھے۔ اس وقت آئی سی ایس کے امتحان میں صرف چار لڑکے پاس ہوئے۔ تین ہندو اور ایک مسلمان جو کہ میرے والد تھے۔ انگریز اس وقت مسلمانوں کو کم تعداد میں آئی سی ایس میں لیتے تھے۔ بعد میں سرسید احمد خان کی کوششوں سے انھوں نے اپنی پالیسی میں کسی قدر تبدیلی پیدا کی چنانچہ قرنی صاحب اور ہلالی صاحب اس پالیسی کے تحت لیے گئے جو میرٹ کے حوالے سے بہت پیچھے تھے۔ میرے والد پہلے یوپی میں افسر لگے، لیکن بعد میں پنجاب بھیج دیے گئے۔ اس وقت آئی سی ایس آفیسرز کو آکسفورڈ میں تربیت کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ وہ جب واپس آئے تو ڈھول بجا کے بڑے خوب صورت انداز میں ان کا استقبال کیا گیا تھا۔ دور دور سے لوگ انھیں دیکھنے آئے تھے۔ میری والدہ کی بچپن ہی میں والد صاحب سے منگنی طے پا گئی تھی۔ اس وقت لڑکیوں کے اسکول نہیں ہوتے تھے چنانچہ میری والدہ کی

بھی واجبی سی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ لندن سے واپسی پر والد صاحب کی شادی ہوئی۔ والدہ بتاتی تھیں کہ آپ کے ابو کا پالا انگریزوں سے زیادہ واسطہ پڑتا اور اکثر کھانوں پر جاتے' تو انھیں بھی ساتھ لے جاتے۔ وہ گاؤں سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے اکثر روتی رہتیں کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی سرزد نہ ہوجائے۔

"والدہ بتاتی ہیں کہ ایک بار ہم کھانے پر جارہے تھے۔ ظفرالحسن نے مجھے کہا کہ آپ برقع نہیں پہنوگی' تو میں رونے لگی۔ پھر میں نے اپنے والد کو خط لکھا کہ میرے خاوند کہتے ہیں کہ برقع مت پہنو۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ جو ظفرالحسن کہتے ہیں' وہی کرو۔ امی میں بڑی ہمت تھی کہ گاؤں کی لڑکی ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلی اور اُٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے سب رنگ ڈھنگ سیکھے۔ گھڑسواری بھی سیکھی اور خچروں اور گدھوں پر سفر کرنے کی مشقت بھی برداشت کی۔ مرتے دم تک میری والدہ نت نئی چیزوں میں بڑی دلچسپی لیتی تھیں۔ وہ مجھ سے پوچھتیں کہ یہ فیکس مشین کیسے کام کرتی ہے۔"

نسرین صاحبہ نے بڑی سادگی سے گھریلو ماحول کی منظرکشی کی تھی اور اپنی والدہ کے بارے میں دلچسپ باتیں بتائی تھیں۔ انھیں سن کر ہمارے تجسس میں اضافہ ہوتا گیا اور اُن سے پوچھا کہ آپ کتنے بہن بھائی ہیں اور آپ کب پیدا ہوئیں اور تعلیم کہاں حاصل کی؟ انھوں نے جواب میں کہا:

"ہم چار بہن بھائی ہیں' میں نمبر تین ہوں۔ میرے بڑے بھائی کا نام محمد پرویز ہے۔ انگریزی "سن اخبار" ان کا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں ان کا ڈیکلریشن منسوخ کردیا گیا۔ بعدازاں ملک میں جب پہیہ جام ہڑتال ہوئی تو وہ بحال ہوا۔ میری بڑی بہن یاسمین لاری آرکیٹیکٹ ہیں۔ انھوں نے شاہی قلعے کی صفائی وغیرہ کروائی ہے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کی پہلی آرکیٹیکٹ خاتون ہیں۔ میری سب سے چھوٹی بہن کینیڈا کے شہر میسی ساگا میں ٹیچر ہے۔ اب تو وہ ریٹائر ہو چکی ہے۔ اب یہاں صرف میری بہن یاسمین لاری اور میں رہتی ہوں۔ بھائی کو ملک چھوڑنا پڑا' کیونکہ ضیاالحق ان کے پیچھے پڑگئے تھے۔"

"میں ۱۹۴۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئی اور جس دن پاکستان بنا' اسی روز میرے والد لاہور کے ڈپٹی کمشنر بنا دیے گئے۔ اس سے پہلے وہ اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر تھے۔ ہمارا گھر جیل روڈ پر تھا۔ والد صاحب نے ہمیں مقامی اسکول' ادبستان صوفیہ میں داخل کرادیا۔ ہم چار نمبر بس یا تانگے میں اسکول جاتے' کیونکہ گاڑی استعمال کرنے کی ہمیں اجازت نہیں تھی۔ آٹھویں تک ہم نے وہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد والد صاحب نے لندن میں ایک گھر لیا اور وہاں ہم چاروں بہن بھائیوں کو پڑھنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس وقت بڑے بھائی کی عمر ۱۸ برس' بڑی بہن کی ۱۶ سال' میری ۱۲ سال جبکہ مجھ سے چھوٹی بہن دس سال کی تھی۔"

کہانی میں حیرت انگیز موڑ آرہے تھے جو ہماری دلچسپی کا باعث بنتے جارہے تھے۔ اُن سے پوچھا کہ آپ کے والد نے اتنا بڑا فیصلہ کس طرح کیا اور آپ بہن بھائیوں نے لندن میں کیسا وقت گزارا؟ نسرین صاحبہ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا:

"اُن کو شاید ہم پر پورا اعتماد تھا۔ آج تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے بڑے بھائی اور بہن کالج میں تھے۔ بڑے

بھائی نے ایڈوانس لیول اور آپا نے اولیول کا امتحان دیا' جبکہ میں اور چھوٹی بہن اسکول میں تھیں۔ ہفتے میں دو دفعہ آپا ہمیں دیکھنے آتی۔ لندن میں والد کے دوست نسیم صاحب روزنامہ ڈان کے نمائندے تھے۔ وہ ہمارا خیال رکھتے اور آتے جاتے بھی رہتے۔ والد صاحب پی آئی اے کے پہلے ایم ڈی بن گئے تھے اور ہماری والدہ مہینے میں دو بار چکر لگا لیتی تھیں۔ پی آئی اے کے جتنے بلیو پرنٹس ہیں' وہ میرے والد کے بنائے ہوئے ہیں۔ پہلا جہاز بھی اُنھی نے خریدا تھا۔"

"ہم چھوٹی بہنیں لندن میں صرف دو سال رہیں۔ بڑے بھائی نے لندن اسکول آف اکنامکس سے اور آپا نے آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کی۔ ہم چونکہ چھوٹے تھے' اس لیے ہمیں واپس بلا لیا گیا۔ ہم چار بہن بھائی تھے' اس لیے ہمیں کبھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا۔ لندن میں ہم دونوں چھوٹی بہنوں کو اسکول سے تین بجے جبکہ بڑے بہن بھائی کو سات بجے چھٹی ہوتی تھی۔ مڈل میں ہونے کی وجہ سے میری یہ ذمے داری ہوتی کہ گھر کا سودا سلف لاؤں اور کھانا بناؤں۔ میں کھانے بنانے کے طریقے والی کتابیں لے آئی اور اُنھیں پڑھ کے کھانا بنانے کی کوشش کرتی' مگر اکثر اوقات کھانا جل جاتا اور میں دیگچی اُٹھا کے باہر رکھ دیتی۔

"ہمارے گھر میں چھوٹی سی لائبریری تھی جس میں اردو کی کتابیں تھیں۔ مثلاً نسیم حجازی، اے آر خاتون، ابن صفی کے ناول وغیرہ۔ اردو تو بچپن ہی میں بہت پڑھی تھی' مگر انگریزی پڑھنے کا شوق "To be continued" سے شروع ہوا۔ رسالوں میں لکھا ہوتا ہے "جاری ہے یا اگلے شمارے میں پڑھیے۔" تو وہاں سے تجسس پیدا ہوا کہ آگے کیا ہو گا۔ اس طرح انگریزی پڑھنا شروع کی۔ اسکول میں ایک تہ خانہ تھا جس میں صرف میگزین رکھے ہوتے۔ اُن سے انگریزی پڑھنے کی طرف رجحان پیدا ہوا۔ میرے بھائی اور ابا چونکہ سگریٹ پیتے تھے' اس لیے مجھے بھی سگریٹ پینے کا شوق ہوا۔ لندن میں پیسے پاس ہوتے تھے' ایک بار اسٹور سے سگریٹ لے آئی اور باتھ روم میں بند ہو کے پی' مگر مزہ نہ آنے پر دوبارہ سگریٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔"

> عمران خاں کے دائیں بائیں وہی لوگ کھڑے ہیں جو پاکستان میں "اسٹیٹس کو" کی علامت بن چکے

نہایت دلچسپ واقعات بیان کیے جا رہے تھے اور سادگی میں پرکاری کا لطف آ رہا تھا۔ پھر نسرین صاحبہ نے اپنے تعلیمی سفر کی روداد آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"کراچی آنے کے بعد جی سی اسکول میں داخلہ لیا' پھر میٹرک پاس کر لیا اور کراچی ہوم اکنامکس کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہمارے بھائی کراچی آئے' تو انھوں نے کہا' تم ہوم اکنامکس کیوں پڑھ رہی ہو' کوئی کام کا مضمون پڑھو۔ گھر کا کام تو تمھیں امی بھی سکھا دیں گی۔ اس پر کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے انگلش لٹریچر میں آنرز کیا۔ گھر سے یونیورسٹی جاتی' تو راستے میں کراچی ایرو کلب کا میدان آ جاتا۔ وہاں دیکھتی کہ جہاز نیچے اوپر آ جا رہے ہیں۔ میں نے گھر والوں سے پائلٹ بننے کے بارے میں پوچھا' تو سب نے ہاں کر دی۔ ہمارے ہاں کوئی تفریق نہیں تھی کہ یہ لڑکا ہے، یہ لڑکی ہے، یہ کرو، وہ نہ کرو۔ ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ والدہ کہتی تھیں کہ بس کچھ کر لو اور میری طرح پیچھے نہ رہ جاؤ۔ وہ ہماری حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا' تو انھوں نے بھی اجازت دے دی۔

اس وقت جہاز کی تربیت لینے والے طالب علموں کو بڑی رعایت تھی۔ ایروکلب والے صرف ۲۰ روپے گھنٹہ لیتے تھے۔ اس وقت وہاں ۲۱ نیپالی پائلٹ تربیت لے رہے تھے کہ پی آئی اے کی شہرت اچھی تھی۔ میری تربیت بھی نیپالی پائلٹوں کے ساتھ ہوئی۔ یہ دو سال کا کورس تھا' چنانچہ میں یونیورسٹی جاتی اور جہاز اڑانا بھی سیکھتی رہی۔ صبح ۷ بجے گھر سے نکلتی تو جاتے وقت پہلے اڑان کی تربیت پاتی پھر یونیورسٹی چلی جاتی۔ کبھی کبھار یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے بھی طیارہ اُڑا لیتی۔ یونیورسٹی میں، میری سیکنڈ پوزیشن آئی۔ ہمارے گھر کے ماحول میں ہر کام کرنے کی اجازت تھی اور ہم سے توقع کی جاتی کہ ہمارا رویہ ہر اعتبار سے درست ہو گا۔''

نسرین صاحبہ نے گھریلو ماحول میں جس آزادی کا نقشہ کھینچا' اس پر طیب اعجاز نے کہا کہ آپ وضاحت سے بیان کیجیے کہ اتنی آزادی ملنے کے باوجود آپ کا قدم کبھی نہ ڈگمگایا اور کسی بھی غلط رجحان کو پرورش پانے کا موقع نہیں ملا۔ ہمارے آج کے ماحول میں تو بچوں پہ قدم قدم پر روک ٹوک ہے اور امتحانات میں اچھے گریڈ لینے کی دوڑ لگی رہتی ہے۔

محترمہ نسرین جلیل نے جواب میں کہا:

''شاید اس لیے کہ ہمارے ساتھ بچوں کی طرح سلوک نہیں کیا جاتا تھا اور حد سے زیادہ لاڈ پیار بھی نہیں تھا۔ کھانے کا وقت ہے' تو بچے بھی بڑوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ مجھے یاد ہے، ایک دفعہ والد، والدہ اور آپا ایک مشاعرے میں جا رہے تھے۔ میں نے ضد کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ والد صاحب نے کہا کہ پہلے کوئی شعر سناؤ۔ مجھے شعر کا مطلب ہی نہیں آتا تھا۔ آپا نے کہا: ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' میں نے کہا، یہ تو مجھے بھی آتا ہے، لیکن انھوں نے کہا، آپ کو شعر کا مطلب نہیں آتا' اس لیے تم گھر ہی پر رہو گی۔ ان دنوں مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ ہم جب بچے تھے اور لاہور میں رہتے' تو والد صاحب کے ایک دوست نیاز صاحب تھے۔ وہ بھی ڈپٹی کمشنر تھے۔ انھی کے نام پہ حیدر آباد میں نیاز اسٹیڈیم تعمیر ہوا ہے۔ ان کے بچے ہوتے اور ابو کے اور دوستوں کے بچے بھی آ جاتے۔ چناں چہ ہم مل کے ڈرامے کرتے تھے اور بیڈمنٹن کھیلتے۔ میں تو اسکول میں بھی کھلنڈری بہت تھی۔ لیکن میری آپا یاسمین لاری وہ بہت ذہین اور پڑھائی میں سنجیدہ تھیں۔ اسکول میں ہر انعام انھی کے حصے میں آتا۔ اس وقت جب میں انگلش لٹریچر پڑھتے ہوئے پائلٹ کی تربیت حاصل کر رہی تھی' تب ساتھ ہی ساتھ فرانسیسی زبان کی کلاسیں بھی لے رہی تھی۔

> ذوالفقار علی بھٹو نے میرے بھائی، محمد پرویز کے انگریزی اخبار ''سن'' کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا تھا

''ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گھر میں باہر سے ایک مہمان آئے۔ میں نے ان کے سامنے کہا کہ ''اوہو آج تو میں اپنی فرانسیسی کی کلاس گول (Bunk) کر جاؤں گی۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر آپ کو داخلہ لینے کی ضرورت کیا تھی؟ اس پہ مجھے شرمندگی ہوئی اور محسوس ہوا کہ میرا رویہ مناسب نہیں تھا۔ آپ نے خود اپنی مرضی سے داخلہ لیا اور پھر آپ کلاس لینے نہیں جا رہی ہیں تو یہ بری بات ہے۔ پھر درمیان میں ایک سال کے لیے میں فرانسیسی سیکھنے فرانس چلی گئی۔''

''یہ تو آپ ایڈونچر پر دوسرا ایڈونچر کیے چلی جا رہی ہیں۔'' میں نے بے ساختگی سے کہا اور فرانس میں قیام کے واقعات

بیان کرنے پر اصرار کیا۔ نسرین صاحبہ نے بے اختیار لہجے میں جواب دیا: ''میں پیرس میں رہی، وہاں فرانسیسی زبان سکھانے والے ادارے ''الیاس فرانسز'' میں داخلہ لے کر کلاسیں لینے لگی۔ اس دوران یہ ہوا کہ اسٹیٹ بینک کے گورنر نے پابندی لگا دی کہ پاکستان سے باہر پیسے نہیں بھیجے جائیں گے' تو میرے لیے بڑی مشکل پیدا ہوئی۔ پیرس میں ''شانزے لیزے اسٹریٹ'' کے قریب میرا کمرہ واقع تھا۔ میرے پاس صرف اتنے پیسے تھے کہ ایک مہینہ گزار سکوں۔ چنانچہ میں دوپہر میں پنیر اور ایک گلاس دودھ لیتی تھی پیسوں کے حساب سے۔ اس وقت میری عمر صرف اٹھارہ سال تھی اور مجھے اپنی ذات پر مکمل اعتماد تھا۔ ایک لڑکی وہاں کر بھی کیا سکتی تھی جہاں دوستیاں بھی آسان نہیں ہوتیں۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ وہاں صادقین سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کے دوست میرے بھائی کے جاننے والے تھے۔ وہ مجھے کیفے میں لے جاتے' وہاں بیٹھ کے بیئر پیتے اور لوگوں کی تصویریں بناتے۔ ساتھ ہی ساتھ مجھ سے کہتے جاتے کہ نسرین بی بی میں جب مر جاؤں گا تو آپ لوگوں کو بتائیں گی کہ میں صادقین کو جانتی تھی۔ میں اس وقت صادقین کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں تھی۔''

''ہمارے گھر میں آزادی احساس تحفظ کے ساتھ حاصل تھی۔ مثلاً آپ کہیں گئے' تو گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اور کام کر کے واپس آ گئے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ مارے مارے پھر رہے ہیں اور بالکل ہی آزاد ہیں۔ اگر میں یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی اور میرے ساتھ کے طلبہ و طالبات رات کو وقت پر گھر آ رہے تھے' پارٹیوں میں نہیں جا رہے تھے یا آوارہ گردی نہیں کر رہے تھے' تو میں بھی ایسا کچھ نہیں کرتی تھی۔ مجھے سڑک عبور کرنا نہیں آتا تھا۔ اگر آپ کو شانزے لیزے پار کرنا ہے' تو اس کے نیچے سے گزرنا ہوتا۔ میں اتنی انجان تھی کہ سڑک پر چلنا شروع کر دیتی اور ہارن بجنے لگتے۔ انسان تجربات سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ بہرحال میں وہاں سے واپس آئی اور اپنی تعلیم مکمل کر کے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں انگلش لٹریچر میں ڈگری لی۔ اگلے سال میری شادی ہو گئی۔ وہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔''

میری بڑی بہن، یاسمین لاری آرکیٹیکٹ ہیں۔ انھیں پاکستان کی پہلی خاتون آرکیٹیکٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے

نسرین صاحبہ نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ہمیں بھی چائے پیش کی۔ وہ جب دو چار چسکیاں لے چکیں' تو ہم نے پوچھا، وہ قصہ کیا تھا؟ انھوں نے بے تکلف موڈ میں جواب دیا:

''ایک روز والد صاحب نے کہا کہ ہم تمھاری اپنے دوست کے بیٹے سے منگنی کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ کر دیجیے۔ میرے بھائی کے پاس اسپورٹس کار تھی اور میں اس میں یونیورسٹی جاتی۔ میں نے دیکھا کہ جن صاحب سے میری منگنی ہونے والی ہے' وہ بھی کسی سے اسپورٹس کار مانگ کے لائے ہیں۔ مجھے ان کی یہ بات بری لگی کہ جو چیز آپ کی نہیں' وہ آپ کیوں مانگ کر لا رہے ہیں۔ میں نے امی سے کہا کہ اس شخص سے میری شادی نہ کیجیے' کیونکہ میرا شوہر ایسا ہونا چاہیے جس کا میں احترام کر سکوں۔ اس بات پر میرے والد نے مجھ سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بات نہیں کی اور پھر آہستہ آہستہ معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ اس کے بعد امی کو جلیل اچھے لگے تو ان سے رشتہ کر دیا۔''

''جلیل میرے بھائی کے دوست تھے اور کسی کام سے گھر آئے' تو ان ہی سے ملاقات ہو گئی۔ جلیل اکثر مذاق سے کہتے

تھے کہ تمھاری امی کو میں اچھا لگا، وہ خود تو شادی کر نہیں سکتی تھیں اس لیے تمھاری مجھ سے کرا دی۔ امی نے پھر جلیل سے پوچھا کہ تم کتنے بہن بھائی ہو، ابو کیا کرتے ہیں اور خاندان کون سا ہے، پھر انھوں نے خود رشتے کا پیغام بھی بھجوا دیا۔ یہ میری امی کا اپنا طریقہ تھا ورنہ تو لڑکی والوں کی طرف سے پیغام بھجوانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جلیل اس وقت اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ شادی کے بعد ہم ہانگ کانگ شفٹ ہو گئے اور سال بھر وہاں رہے۔ پھر واپس کراچی آ گئے۔"

مہم جوئی کی کہانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ سیاست میں کیسے آئیں؟ انھوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دینا شروع کیا:

"میں گھریلو ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ عوامی بہبود کا کام بھی کرتی تھی کہ مثال کے طور پر لوگوں کو ادویہ دے دیتی اور انھیں استعمال کرنے کا طریقہ بتاتی۔ ٹوکن کے طور پر ایک دو روپے ان سے لیتی۔ میری سہیلیاں بھی بہبود کا کام کرتی تھیں۔ پھر ہم مختلف علاقوں میں گئے تو دیکھا کہ وہاں بڑی غربت ہے۔ لوگ ان پڑھ ہیں اور کس قدر مشکل حالات میں ہیں۔ تب خیال آیا کہ ہمیں اپنے وطن کے لیے جو کچھ ہو سکے، وہ ضرور کرنا چاہیے۔ گھر میں بھی ملکی حالات پر بات چیت ہوتی تھی۔ مدنی صاحب کی بیٹیاں ہماری دوست تھیں۔ انھوں نے ہمیں کہا کہ یوسف جمال کے ہاں سیاسی میٹنگ ہے، تم بھی چلو۔ ہم نے کہا ضرور چلیں گے۔"

"یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے۔ جب اُن کے ہاں گئے تو ایک بڑے سے کمرے میں میٹنگ ہو رہی تھی اور جناب الطاف حسین تقریر کر رہے تھے۔ ان کی باتوں میں ہمیں سچائی نظر آئی۔ جلیل نے ان سے کہا کہ ہمیں آپ کی باتیں پسند آئی ہیں۔ ہم بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا فون نمبر دے دیا کہ اس پر رابطہ کریں۔ ہم فون کرتے رہے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر کمال اظفر سے پوچھا کہ رابطے کا کیا طریقہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حق پرست کمیٹی ایم کیو ایم کے لیے فنڈز اکٹھے کر رہی ہے جس میں بیگم سلمیٰ احمد بھی موجود ہیں۔ بہرحال ہم بھی اس کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ اس وقت الطاف حسین بیمار تھے۔ ہم نے شہر کے مخیر حضرات کی ایک فہرست تیار کی۔ ہم ان کو جا کے بتاتے کہ ایم کیو ایم ہماری جماعت ہے۔ یہ الیکشن لڑ رہی ہے۔ اس کے یہ مقاصد ہیں تو آپ ہمیں چندہ دیں۔ جو چندہ ہم ایک دن میں اکٹھا کرتے، وہ اسی دن الطاف بھائی کو پہنچا دیتے۔ اس طرح ہمارا اُن سے براہ راست تعلق قائم ہو گیا۔ ہم پھر آگے بڑھتے گئے۔ جلیل کو تو الطاف بھائی نے فوراً قبول کر لیا کہ وہ ایک صنعتکار تھے اور فیکٹری چلا رہے تھے۔ وہ انڈس کیمیکل فیکٹری کے مالک تھے جو اس وقت پاکستان کی سب سے بڑی کیمیکل فیکٹری تھی۔ اُن کے پاس چونکہ تجربہ بھی تھا اور وہ باہر بھی جاتے رہتے تھے اس لیے الطاف بھائی کے حلقے میں جلد آ گئے جبکہ میں ابھی پیچھے رہی۔ انھی دنوں کسی نے کہا کہ یہ خواتین کلب جانے کے بجائے نائن زیرو آ جاتی ہیں۔"

کراچی یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہوئے ہی میں نے ہوابازی سیکھی اور ایک دن طیارہ اڑا لیا

وہ حالِ دل بیان کرتے کرتے کیک کی طرف متوجہ ہوئیں۔ میں نے چائے کا ایک جرعہ لیتے ہوئے پوچھا کہ آپ کو یہ احساس کہتری تو ہوا ہو گا اور یہ خیال بھی آیا ہو گا کہ جلیل کی وجہ سے میں ایک مصیبت میں پھنستی جا رہی ہوں اور مجھے کنارہ

کشی اختیار کر لینی چاہیے؟ نسرین صاحبہ نے بڑے تحمل سے بیتے ہوئے لمحات کا ذکر شروع کیا:

"اس زمانے میں عدم تحفظ کی بہت دھند چھائی ہوئی تھی اس لیے میں ہر جگہ اُن کے ساتھ ساتھ ہی رہتی۔ ایک دفعہ رات گئے الطاف بھائی سے ملنے گئے، تو اُنھوں نے اِن کو اندر بلا لیا اور میں ویٹنگ روم میں بیٹھی رہی۔ رات کے بارہ بج گئے، مگر جلیل نہیں آئے۔ میں غصے میں وہاں سے نکل کھڑی ہوئی اور ٹیکسی لے کے گھر آ گئی۔ جلیل بڑے پریشان ہوئے کہ مجھے اکیلے کہیں جانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ حالانکہ میں بیرون ممالک میں بھی رہی تھی، لیکن کراچی میں کسی چیز کا علم نہیں تھا۔ بہرحال میں ناراض ہو کے گھر آ گئی۔ جلیل جب آئے تو انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ہم ایم کیو ایم میں شامل نہیں ہوتے کیونکہ الطاف بھائی تمہارے بارے میں سمجھتے ہیں کہ تم کچھ کر نہیں سکتی۔ میں نے کہا کہ ہم پارٹی نہیں چھوڑیں گے، چنانچہ ہم الطاف بھائی کے پاس گئے تو انھوں نے کہا کہ آپ پارٹی کے ممبر بن جائیں۔"

"ہم اس وقت حق پرست کمیٹی میں تھے اور وہ بھی ختم ہو گئی تھی، لیکن ہم پھر بھی جا رہے تھے کہ ہمیں مشورہ دینے کی لت پڑ چکی تھی۔ پھر میں نے بھی آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔ کبھی چائے بنا دی اور کبھی دفتر کی صفائی کرا دی۔ پھر میں گاہے گاہے الطاف بھائی کو بتانے لگی کہ لاڑکانہ میں کیا ہو رہا ہے اور اس حلقے میں کیا ہو رہا ہے۔ ایم کیو ایم میں زیادہ تر خواتین نچلی سطح سے ہیں، تعلیم یافتہ بھی ہیں، مگر انھیں سیاسی تجزیے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ پھر میں نے ایم کیو ایم کا انگریزی میں نیوز لیٹر نکالنا شروع کیا اور اپنے لیے خود کام تلاش کر لیا۔"

میں نے اپنی والدہ سے کہا، میری شادی ایسے شخص سے کیجیے گا جس کا میں احترام کر سکوں

"کیا آپ بچوں کو وقت دیتی تھیں یا اپنے بچوں کو اسی طرح آزاد رکھا جس طرح آپ کے والدین نے آزادی دے رکھی تھی؟ طیب اعجاز نے سوال کیا۔ نسرین جلیل نے بلاتوقف کہا:

"میں نے اپنے بچوں کو ویسا ہی آزاد رکھا، جبکہ لوگ کہتے تھے کہ وہ خراب ہو جائیں گے اور تم اتنا وقت ایم کیو ایم کو دیتے ہو، روز وہاں جاتے ہو، یوں بچوں پر برا اثر پڑے گا، مگر ہم دیکھتے تھے کہ لوگ دھڑا دھڑ آ رہے ہیں، وقت دے رہے ہیں اور لوگوں کے مسائل بھی حل کر رہے ہیں۔ ہمیں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ لوگ دوسروں کے مسائل حل کرنے میں بے لوث تھے۔

"۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی اور مہاجر قومی موومنٹ کے درمیان معاہدہ ہوا جس سے مہاجر قوم کا ایک تشخص قائم ہوا۔ الطاف بھائی نے جب کراچی یونیورسٹی میں تحریک شروع کی، تو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کے اسٹال پر جائیں۔ وہ پنجابی تھے نہ پختون نہ سرائیکی، تو پھر وہ کیا ہیں؟ اسی شناخت کے لیے انھوں نے ۱۹۸۶ء میں نشتر پارک میں جلسہ کیا تھا، حالانکہ اس دن موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ لوگ جمع ہوئے اور نشتر پارک کھچا کھچ بھر گیا تھا۔

"آپ ذرا غور کریں کہ ایسے لوگ پارٹی میں ہیں جو انتخابات میں ایک پیسہ خرچ نہیں کرتے۔ تبھی تو انھیں اپنے لیے پیسے بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب جلیل صوبائی اسمبلی کے رکن بنے یا میں سینٹ میں گئی، تو ہمارے گھر سے ایک بھی پیسہ نہیں لگا۔ ہماری فارم کی فیس بھی پارٹی نے ادا کی تھی۔ جلیل نے ۱۹۹۰ء میں الیکشن جیتا اور ایم پی اے منتخب ہوئے۔

الطاف بھائی نے انھیں وزیرِتعلیم بنایا۔ میں تب تک گراس روٹ لیول ہی پر کام کرتی رہی یعنی یہی کہ چائے بنانا اور ٹیلی فون ایکسچینج پر بیٹھ جانا۔ الطاف بھائی کو محسوس ہوا کہ میری انگریزی اچھی ہے۔ لہٰذا پھر جتنے بھی معاہدے ہوتے تو میں کسی ذاتی مفاد کے بغیر اُن کی مدد کرتی۔ حالانکہ ہمیں لوگوں اور خاندان والوں کی باتیں بھی سننے کو ملتی تھیں کہ بچے خراب ہو جائیں گے کہ وہ ابھی چھوٹے تھے۔ خدا کا شکر کہ جس طرح سے ہم پلے بڑھے تھے ہمارے بچے بھی ویسے ہی پل گئے۔"

محترمہ نسرین جلیل ایم کیو ایم کے ساتھ اپنی وابستگی کی اندرونی کہانی بیان کر رہی تھیں جو فی الواقع ایثار کی ایک عمدہ مثال تھی اور اس سے اُن کے اخلاص اور پارٹی کی داخلی ورکنگ کا اندازہ ہوتا تھا۔ مروت میں اُن سے میں یہ نہیں کہہ سکا کہ پولنگ اسٹیشن تو آپ کے سیکٹر کمانڈر کی تحویل میں ہوتے ہیں، آپ کا مینڈیٹ بڑی حد تک جعلی ہوتا ہے اور آپ کو انتخابات میں خرچ کرنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ اب یہ راز سبھی کو معلوم ہے۔ میں نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیے بغیر اُن سے پوچھا کہ سنا ہے آپ کے خاندان کو سیاسی بنیادوں پر غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ انھوں نے تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا:

"ذوالفقار علی بھٹو نے جب کئی نجی اثاثہ جات قومی تحویل میں لیے اس وقت ۲۲ خاندانوں کا بہت چرچا تھا۔ اس میں سے ایک گھرانہ ہمارا بھی تھا۔ ہمارے ادارے، خیبر انشورنس کمپنی، خیبر ٹیکسٹائل کارخانے اور انڈس کیمیکل قومی تحویل میں لے لیے گئے۔ اس کے بعد جب ۱۹۹۲ء میں فوجی آپریشن ہوا تو جلیل کو انڈر گراؤنڈ جانا پڑا اور ہمیں یہ گھر چھوڑنا اور چوکیدار کو بھی ہٹانا پڑا۔ میں مصیبت کے ان دنوں میں اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ لندن چلی گئی اور ہم الطاف بھائی کے پاس رہے۔ میرے بڑے بیٹے اور بیٹی کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے وہ اپنے دوستوں کے گھر کراچی ٹھہرے رہے۔ ایک بیٹی کو میں نے اپنی بہن کے پاس کینیڈا بھیج دیا۔ ہماری غیر موجودگی میں فوجی چھاپے مارتے اور ہمارے خلاف جھوٹے مقدمات بناتے رہے حالانکہ میں تو سیاست میں خدمتِ خلق کے ارادے سے آئی تھی۔ ۱۹۹۴ء میں سینٹ کی جنرل سیٹ پر منتخب ہوئی۔ ان دنوں دو خواتین جنرل سیٹ پر آئی تھیں، ایک میں اور دوسری فضا جونیجو۔ اس کے بعد کچھ عرصہ جیل میں رہی۔"

> شروع میں الطاف بھائی سمجھتے تھے کہ میں کوئی کام نہیں کر سکتی، لہٰذا وہ مجھے میٹنگ میں نہ بلاتے

"کس جرم کی پاداش میں آپ جیل گئی تھیں؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے بتدریج احساس ہوتا جا رہا تھا کہ میں ایک "فولادی خاتون" سے ہم کلام ہوں۔ محترمہ نسرین جلیل نے دھیمے لہجے میں اپنی بپتا سنانی شروع کی:

"جب ہمارے تمام اثاثے قومیا لیے گئے تو ہم نے اپنا گھر بیچ دیا اور ڈیفنس میں اپنی بہن کے گھر سترہ سال گزارے۔ اس کے بعد جلیل نے اپنی گاڑی اور کچھ پلاٹس بیچ کر ایک مشین سے دوبارہ کاروبار شروع کیا لیکن انھیں ۱۹۹۲ء میں انڈر گراؤنڈ جانا پڑا کیونکہ ہم ایم کیو ایم کے ساتھ اپنی وفاداری نبھا رہے تھے اور جبر کے ماحول نے ہمارے ارادے بڑے مضبوط کر دیے۔"

"۱۹۹۲ء میں جب آرمی آپریشن شروع ہوا تو انھوں نے ۷۲ مچھلیاں پکڑنے کا اعلان کیا۔ دراصل وہ ایم کیو ایم کو ہائی

جیک کر لینا' الطاف حسین کو مائنس کر کے حقیقی والوں کو اُن کی جگہ لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے دفاتر پر قبضہ اور پوری پوری آبادیوں کا محاصرہ کر لیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور مردوں کو گھروں سے نکال کر اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر انھیں گھنٹوں دھوپ میں بٹھایا گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہاں ٹارچر سیل ہیں اور جناح پور بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں' یہ سب کچھ جھوٹ ثابت ہوا۔ ہمارے پندرہ ہزار سے زائد جوان شہید کر دیے گئے اور ہر کارکن کے خلاف مقدمے درج ہوئے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ آپ وزیر بھی رہیں' لیکن الطاف بھائی سے اپنی وفاداری ختم کر دیں۔''

''الطاف بھائی تو ۱۹۹۱ء میں لندن چلے گئے' کیونکہ یہاں ان کی جان کو خطرہ تھا کہ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ جب آرمی آپریشن شروع ہوا' تو میں بھی لندن چلی گئی۔ ۱۹۹۴ء میں جب مجھے سینیٹر بنایا گیا' تو میرے خلاف ۱۲ جھوٹے مقدمے درج تھے جن میں بسوں کو جلانا بھی شامل تھا۔ فاروق ستار بھائی، کنور خالد بھائی اور شعیب بخاری وغیرہ ہمارے سبھی اہم رہنماؤں کے خلاف مقدمات بنائے گئے۔ ہم نے پھر گرفتاریاں پیش کر دیں۔ ان میں میرے علاوہ آفتاب شیخ اور اشتیاق اظہر بھی تھے۔ ہم تین سال جیل میں رہے۔ میں چھ ماہ جیل میں اور اڑھائی سال اس گھر میں نظر بند رہی۔ ۱۹۹۷ء میں نواز شریف حکومت میں رہائی نصیب ہوئی۔''

نسرین صاحبہ کی درد بھری کہانی نے دل پر گہرا اثر کیا' لیکن خارزار سیاست میں بڑی بڑی آزمائشیں آتی ہیں۔ سینٹ کا ذکر آیا تو میں نے پوچھا کہ سینٹ میں آپ کا تجربہ کیسا رہا اور آپ اس ادارے کو مؤثر بنانے کے لیے کیا تجاویز دے سکتی ہیں؟ انھوں نے ایک تجربے کار پارلیمنٹرین کے انداز میں جواب دیا:

''پہلی بات یہ کہ سینٹ کے ادارے کا ہونا بہت ضروری ہے' کیونکہ یہاں تمام صوبوں کی مساوی نمائندگی ہے' لیکن اس کو مزید مؤثر اور معتبر بنانے کے لیے اس میں فنانس بل کی منظوری کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ اسے مؤثر بنانے کے لیے عوامی سماعت کی میٹنگوں (Public hearings) کی روایت قائم کرنا ہو گی۔ امریکہ میں سینٹ کا وقار اسی قسم کی میٹنگوں ہی سے قائم ہے۔ وہاں ہر سینیٹر کو ریسرچر بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں بھی ریسرچ کے لیے لوگ دے رہے ہیں اور اس ضمن میں یورپین یونین مدد کر رہی ہے۔ میں اگر سینٹ میں آئے ہوئے کسی ایک شخص کا بھی مسئلہ حل کر سکوں' تو مجھے بڑا اطمینان ملتا ہے۔''

> جب میں ۱۹۹۴ء میں سینیٹر بنی، تو میرے خلاف ۱۲ جھوٹے مقدمات درج ہو چکے تھے

عزیزم طیب اعجاز نے محترمہ نسرین جلیل کی استقامت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ جیسی خواتین ہماری بچیوں اور عورتوں کے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جماعت اسلامی کی سمیحہ راحیل قاضی کے علاوہ تحریک انصاف میں بھی خاصی پڑھی لکھی خواتین نظر آ رہی ہیں جیسے عندلیب عباس، شیریں مزاری وغیرہ۔ ایم کیو ایم میں بھی خواتین سرگرم ہیں۔ نسرین صاحبہ نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

''اگر کسی سیاسی لیڈر کی بہن، بھانجی یا بھتیجی پارٹی یا پارلیمنٹ میں نامزد کی جائے گی تو آپ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ عام خاتون کو موقع دینے سے ہی بات بنے گی۔ تحریک انصاف نے کہا تھا کہ ہم نوجوانوں کو اسمبلیوں میں لائیں گے'

تو وہ کتنے نوجوان لا سکے اسمبلی میں؟ انھیں انہی افراد کو لانا پڑا جو جیت سکتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ایم کیو ایم میں قرابت داروں اور پیسے والوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ۱۹۸۴ء میں مہاجر قومی موومنٹ بنی تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک ہمارے ہاں ساری قومیتوں کے لوگ موجود ہیں۔ نبیل گبول کو ہم نے اردو بولنے والوں کے گڑھ سے جتوایا۔ اس سے پہلے بھی ایک سندھی کو جتوایا تھا۔ ہمارے ہاں پشتون ہیں، پنجابی بھی اور ہمارے لوگ آئیڈیالوجی پر ووٹ دیتے ہیں۔ وہ نسرین جلیل، نبیل گبول یا کسی شخصیت کو ووٹ نہیں دیتے۔ جب لوئر مڈل کلاس کے لوگ اسمبلی میں جائیں گے تو وہ اپنے نہیں بلکہ عوام کے لیے کام کریں گے۔"

اب نسرین صاحبہ کو ایک حساس اور مشکل سوال کا سامنا تھا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ تحریک انصاف نے کراچی میں بہت ووٹ لیے ہیں۔ آپ کی جماعت ان سے کوئی خوف محسوس تو نہیں کر رہی؟ انھوں نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا:

"میں اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ لوگ تبدیلی چاہتے ہیں۔ ایم کیو ایم ایسی جماعت ہے کہ اگر اسے کام کرنے دیا جائے، تو یہ بہت کچھ ڈیلیور کر سکتی ہے۔ لیکن سندھ کا المیہ یہ ہے کہ وہاں "سٹیٹس کو" کے تسلسل پر بہت زور دیا جاتا ہے اور شہری اور دیہی آبادی کی مردم شماری نہیں کرائی جاتی، کیونکہ ان کی آبادی برابر برابر ہے۔ اگر یہاں پر ایک لاکھ کا انتخابی حلقہ ہے تو اندرون سندھ صرف چالیس ہزار کا۔ اسمبلی کی نشستیں اندرون سندھ زیادہ ہیں۔ ایک تہائی اگر شہری نشستیں ہیں، تو دو تہائی دیہی نشستیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیشہ دیہی سندھ ہی کا وزیراعلیٰ آئے گا، حالانکہ دیہی سندھ میں بھی ہماری بہت سیاسی حمایت ہے۔ مجوزہ انتخابی اصلاحات بہت خوش آئند ہیں۔ وہ اگر نافذ ہو جاتی ہیں، تو میری رائے میں Electables کے ووٹ بینک پہ اثر پڑے گا، کیونکہ لوگ اپنی مرضی سے ووٹ ڈالنے کے مجاز ہوں گے۔ جب تک یہ اجارہ داری ختم نہیں ہوتی، تب تک آپ صحیح معنوں میں جمہوریت ملک میں نہیں لا سکتے۔ کراچی میں یہ ممکن ہے کہ یہاں وڈیرا شاہی یا اجارہ داری نہیں ہے۔ اب اگر ایم کیو ایم کو ۸۵ فیصد ووٹ ملتا ہے، تو یہ لوگوں کو ہضم نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایم کیو ایم اپنے جامے میں رہے۔ ایک حد تک اس کو ووٹ پڑیں، باقی دوسری پارٹیوں کو ملنے چاہئیں۔"

> ایک سیاسی لیڈر اپنی بہن، بھانجی یا بھتیجی کو پارلیمنٹ بھجوا دے، یا کوئی عہدہ دے ڈالے تو تبدیلی لانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے

میں نے ان سے اسی قبیل کا ایک اور سوال پوچھا:

"اگر متناسب نمائندگی کا نظام نافذ کیا جائے، تو کیا وہ زیادہ بہتر نہیں رہے گا؟ اب تو یہ ہو رہا ہے نا کہ ۲۰ فیصد ووٹ لینے والا اُمیدوار جیت جاتا ہے، کیونکہ باقی ۸۰ فیصد میں زیادہ تر لوگ ووٹ نہیں ڈالتے یا اُمیدواروں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔"

انھوں نے اختصار سے جواب دیا:

"ہاں میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ وہ یقیناً بہتر ثابت ہوگا۔"

اب نسرین جلیل ایک اور سخت سوال کی زد میں تھیں:

"آپ نے ایم کیو ایم کے بارے میں بہت اچھی باتیں کی ہیں، لیکن جماعت سے باہر لوگوں میں اس کا تاثر کچھ اچھا

نہیں۔ کیا آپ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس کرتی ہیں؟"

انھوں نے پہلو بدلتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"دیکھیں جب پوری ریاستی مشینری ایک جماعت کا چہرہ کالا کرنے پر لگ جائے، تو میج داغدار تو نظر آئے گا۔ یہ آن دی ریکارڈ بات ہے کہ لوگ برملا کہتے ہیں، آپ دہشت گرد ہیں، آپ کے ٹارچر سیل ہیں اور آپ جناح پور بنا رہے ہیں جب کہ یہ سب باتیں غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایم کیو ایم نسلی سطح (Ethnicity) پہ کام کرتی ہے جبکہ پشتون کراچی میں سالہاسال سے رہ رہے ہیں۔ جب ایم کیو ایم نہیں تھی تب بھی یہ مسئلہ درپیش تھا۔ ۱۹۸۶ء میں قصبہ علی گڑھ میں تین سو اردو بولنے والے مار دیے گئے تھے۔ اس کے بعد عبدالولی خان نے الطاف بھائی سے باقاعدہ ملاقات کی اور دونوں نے یہ طے کیا کہ آپس میں بھائی چارے سے رہیں گے۔ چند سال پہلے پشتون بھی مارے جا رہے تھے اور اردو بولنے والے بھی۔ آخر میں پتہ چلا کہ اس سب کے پیچھے طالبان تھے، لیکن بدنامی ایم کیو ایم کی ہوئی۔"

محترمہ کی پُرتاثیر گفتگو کے بعد میں نے انھیں دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ تو ایک رخ ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایم کیو ایم کراچی اور سندھ تک محدود رہنے کے بجائے پورے پاکستان کی پارٹی بنے، کیونکہ جب ایک پارٹی پورے ملک میں کام کرتی ہے، تو اسے بہت سارے مفادات کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور اس میں ایک توازن پیدا ہوتا ہے۔ ذمے دار شہری ہونے کے ناتے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کو پورے ملک میں سرگرم رہنا چاہیے کہ اس سے قوم کے اندر یکجہتی پیدا ہوتی ہے اور ملکی مفادات کا تحفظ بھی ممکن ہے۔ لیکن آپ کے بارے میں ایک تاثر میڈیا کے علاوہ عام لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے کہ آپ جب اقتدار میں آئے تو بھتہ خوری کی خطرناک رسم شروع کر دی گئی۔ دوسرا تاثر یہ کہ آپ نے تشدد کی راہ بھی اختیار کی۔ الطاف بھائی نے کئی بار کہا کہ آپ ٹی وی وغیرہ بیچ کر اسلحہ خریدیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ باقی ملک سے کٹ گئے اور آپ کے بارے میں یہ تاثر قائم ہوا کہ جمہوریت کے بجائے یہاں الطاف حسین کی فسطائیت قائم ہے۔ تیسرا تاثر یہ کہ وہ مہاجر جو ایک زمانے میں ہر شعبے میں درجہ کمال رکھتے تھے، وہ علم و تحقیق سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں اور اب سی ایس ایس کے امتحانات میں کراچی کا کوئی امیدوار ٹاپ نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ ان چیزوں پر آپ کو غور کرنا چاہیے اور اصلاحی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔"

ایم کیو ایم کو اگر کام کرنے کا
موقع دیا جائے، تو یہ ملک میں
انقلابی تبدیلیاں لا سکتی ہے

نسرین جلیل صاحبہ نے کہا کہ پہلے گرم چائے کی ایک پیالی پیتے ہیں کہ ہم دو گھنٹوں سے باتیں کرتے آ رہے ہیں۔ چائے نے بڑا لطف دیا اور اسی اثنا میں دفعتاً مجھے وہ ملاقات یاد آ گئی جو الطاف بھائی سے لندن میں ہوئی تھی۔ میں نے چائے ختم کرتے ہی اس یادگار ملاقات کا تذکرہ شروع کر دیا: غالباً یہ ۱۹۹۵ء کے اوائل کی بات ہے۔ ان دنوں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان سخت ٹھنی ہوئی تھی اور سیاسی فضا بڑی مکدر تھی۔ ایک روز ہمارے محترم دوست جناب مصطفیٰ صادق (مرحوم) صبح سویرے میرے غریب خانے پر آئے اور کہنے لگے کہ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ ان معاملات میں بڑی دلچسپی لیتے اور مذاکرات کو نتیجہ خیز بنانے کا ملکہ رکھتے تھے۔ طے پایا کہ لندن

جا کر الطاف بھائی سے بات چیت کی جائے اور اس سے پہلے وزیراعظم بےنظیر صاحبہ کو ذہنی طور پر مفاہمت کے لیے تیار کیا جائے۔ ہم دونوں وزیراعظم سے ملے جو اسی رات انڈونیشیا روانہ ہونے والی تھیں۔ انھوں نے ہماری تجویز کو بہت سراہا اور یقین دلایا کہ وہ مفاہمت کا خیرمقدم کریں گی۔ ہم لندن جا کر الطاف صاحب سے ملے۔ پہلے تو وہ یہ سمجھے کہ شاید ہم اسٹیبلشمنٹ کے آدمی ہیں، چنانچہ وہ ہم پر بہت غرائے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم کسی کی طرف سے نہیں آئے اور مفاہمت پیدا کرنے کا جذبہ ہمیں یہاں لے آیا ہے۔ اُن کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہوا، تو انھوں نے ایم کیو ایم پر ڈھائے جانے والے مظالم کی طویل داستان شروع کر دی۔ ہم نے اُن کی جائز باتوں کی تائید کی۔ ان سے ہماری گھنٹوں بات چیت ہوئی۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ کی پالیسی سے مہاجرین کو کتنا فائدہ اور کتنا نقصان ہوا۔ جب آپ دیانتداری سے بیلنس شیٹ بنائیں گے، تو ساری بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔ تند و تیز باتوں میں انھوں نے کہا، فوج کے ساتھ ہماری مفاہمت کرانے میں کردار ادا کریں۔ انھیں بتایا کہ ہمارا فوج کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور ایک سیاسی جماعت کو سیاسی جماعتوں ہی سے معاملات طے کرنے چاہئیں۔ الطاف بھائی نے آخر میں کہا کہ اگر پیپلز پارٹی ہمیں کھا لیں جمع کرنے سے نہیں روکتی، تو اس کے ساتھ بات چیت ہو سکتی ہے۔ ہم واپس آ کر بینظیر صاحبہ سے ملے اور الطاف بھائی کی طرف سے خیرسگالی کا پیغام دیا، مگر کراچی میں ان کے رفقا مفاہمت پر آمادہ نہ ہوئے۔ میرا قائد تحریک سے کیا ہوا انٹرویو روزنامہ جنگ میں ۲۳ مارچ کی اشاعت میں چھپ گیا تھا۔

> جب پوری ریاستی مشینری ایک جماعت کا منہ کالا کرنے لگے، تو اس کا امیج داغ دار ہی نظر آئے گا

''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے نوجوان تعلیمی میدان میں ہمیشہ ٹاپ کرتے تھے اب انھیں کیا ہو گیا ہے؟ کہیں تو کچھ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ میں ایم کیو ایم کے بارے میں اچھے جذبات رکھتا اور یہ کہتا ہوں کہ ہیجان اور بیداری میں فرق کیا جانا چاہیے۔ بیداری کے ساتھ شعور اور نظم و ضبط بے حد ضروری ہیں۔ اگر آپ کہیں اسے بھی توڑ دو اُس کو بھی توڑ دو، تو اپنا ہی امیج برباد کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی جماعت میں عسکری ونگ نہیں ہونی چاہیے۔

نسرین جلیل صاحبہ میری باتیں اطمینان کے ساتھ سنتی رہیں اور آہستگی سے کہنے لگیں:

''الطاف صاحب! دیکھیں اگر آپ کے ہاں چوری یا ڈاکا پڑتا ہے، تو سب سے پہلے آپ کو اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ اپنے پاس رکھنے کا خیال آتا ہے۔ تاکہ اگر کوئی حملہ کرے تو کم سے کم آپ اپنا دفاع کر سکیں۔ جب ایم کیو ایم اور الطاف بھائی نہیں تھے، تب بھی بشریٰ زیدی کا سانحہ پیش آیا تھا اور پشتونوں نے ہمارے علاقے میں قتل عام کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ٹی وی بیچ کے اسلحہ خرید لیں۔ دوسری قابل ذکر بات یہ کہ ہمیں اس شہر میں رہنا ہے اور ہمارے بچے یہاں پر ہیں۔ ہم کیوں یہاں زیادتی کرنا چاہیں گے؟ اب یہاں طالبان ہیں، داعش بھی آ چکی ہے اور آپریشن بھی ہو رہا ہے۔ آپ ان کی طرف توجہ دینے کے بجائے ایم کیو ایم کے آدمیوں کو پکڑ رہے ہیں اور ہمارے علاقے سے نو افراد اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ایک دھوبی کے بچے سے مار مار کر پوچھ رہے ہیں کہ تم

کس کس دھندے میں ملوث ہو؟ اگر آپ اس طرح کسی قوم یا جماعت کو چور، ڈاکو یا قاتل سمجھنے لگیں گے تو پھر دو ایک روز بن بھی جائے گی۔“

”ایک دن میرے پاس علاقہ علی ہجویری کی ایک شکایت آئی کہ ایک بندہ بھتہ لینے آیا ہے اور ۵۰ ہزار روپے مانگ رہا ہے۔ میں نے کہا پولیس بلاؤ اور اس کے حوالے کر دو۔ پولیس آئی تو پتہ چلا کہ اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہمارے لوگ بھی غلط کام کر رہے ہوں گے کہ وہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں لیکن ریاست کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ہمیں ٹارگٹ بنائی چلی جائے۔“

”مگر آپ تو ہر حکومت میں شامل رہے اور ریاست کے وسائل سے اپنی سیاسی طاقت میں اضافہ کرنے اور حکومتی اداروں میں اپنے لوگ بھرتی کراتے رہے۔“ میں نے لطافت میں کثافت کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔

نسرین صاحبہ نے اپنی جماعت کا دفاع کرتے ہوئے کہا: ”الطاف صاحب! کس حکومت کی بات کرتے ہیں آپ؟ نواز شریف کی حکومت میں حکیم سعید کے قتل کا الزام ہم پر لگا جبکہ ایک معروف صحافی ادریس بختیار نے ثبوت کے ساتھ کہا کہ ایم کیو ایم اس میں ملوث نہیں تھی۔“

جنرل پرویز مشرف چاہیں، تو وہ ایم کیو ایم میں شامل ہو جائیں، مگر وہ پارٹی صدر نہیں بن سکتے

فضا کے اندر پھیلے ہوئے تاثر کو سوال کی زبان دیتے ہوئے طیب اعجاز نے پوچھا: کیا آپ مشرف صاحب کو اپنے ساتھ ملانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں؟ نسرین جلیل صاحبہ نے پلٹ کر سوال کر ڈالا کہ مشرف صاحب ایم کیو ایم میں کیسے فٹ ہوں گے؟ اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ”ایسی سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ الطاف صاحب کو ہٹاؤ اور مشرف کو لے آؤ۔ بھائی جان، خدا کے لیے ہماری جان چھوڑ دو۔ مشرف اگر شامل ہونا چاہتا ہے تو بے شک ہو جائے لیکن یہ توقع نہ رکھے کہ اسے پارٹی کا صدر بنا دیا جائے گا۔ میری وفاداری الطاف حسین سے ہے مشرف سے نہیں۔ الطاف بھائی ہی ہماری پارٹی ہیں۔“

میں نے محترمہ کی صلاحیتوں کو داد دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو قیادت کے منصب پر فائز ہونا چاہیے کہ آپ کے اندر ٹیلنٹ بھی ہے اور آپ کا کتاب کے ساتھ رشتہ بھی قائم ہے۔

نسرین جلیل صاحبہ نے نپے تلے الفاظ میں کہا: میری عمر ۷۰ برس ہے میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی اور میرے اندر کوئی خواہش بھی نہیں ہے۔“

موضوع کو بدلتے ہوئے میں نے ان سے ایک ہلکا پھلکا سوال کر ڈالا۔ ”سیاست میں تو آپ کا وقت گزرتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے مشاغل کیا کیا ہیں؟

نسرین جلیل صاحبہ نے دوٹوک جواب دیا ”میں کتابیں پڑھتی ہوں۔“

”کیا پڑھتی ہیں شوق سے، فکشن، ناول یا کلاسیک؟“

خصوصی اعلان

سپریم کورٹ آف پاکستان کے پندرھویں چیف جسٹس، جناب سعید الزمان صدیقی قانونی و دانش ورانہ حلقوں میں معزز و محترم مقام رکھتے ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں جنرل مشرف کے پی سی او پہ حلف نہ اٹھا کر آپ نے آئین و قانون کا بول بالا کیا تھا۔ ہم نے چیف جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی سے ایک چشم کشا اور انکشافات سے بھرپور انٹرویو کیا ہے۔ نئے سال کے پہلے شمارے میں یہ منفرد انٹرویو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ (ادارہ)

"ابھی کراچی پر دو اچھی کتابیں آئی ہیں (Karachi Orderd Disorder and the Struggle for the Cityby Laurent Gayer Pakistan A Hard Country by Anatol Lieven,) انھیں پڑھ رہی ہوں۔ آپ بھی انھیں ضرور پڑھیے گا۔ کتاب میں ایم کیو ایم کے بارے بھی لکھا ہے کہ اس میں کیا کیا خرابی ہے۔ لیکن میرے نزدیک ایم کیو ایم ہی ایسی جماعت ہے جو کچھ ڈیلیور کر سکتی ہے۔

طیب نے کہا: الطاف حسین صاحب کی پاکستان واپس آنے کی امید ہے آپ کو؟

نسرین جلیل: "ہم لوگ سیکیورٹی کی وجہ سے انھیں یہاں آنے سے منع کر رہے ہیں اور ان کی صحت بھی ان دنوں کچھ اچھی نہیں۔"

ہم نے اُٹھتے ہوئے انھیں اردو ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ پیش کیا۔ پوچھنے لگیں کہ یہ کب سے شائع ہو رہا ہے؟ انھیں بتایا کہ اس کی اشاعت کو ۵۴ سال ہو چکے ہیں۔ اب تو یہ ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ یہ ٹیکسٹ فارم میں بھی ہے اور ڈیجیٹل فارم میں بھی لاکھوں لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ فیس بک پر قریباً ۵ لاکھ افراد پوری دنیا سے ہمارے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں۔ ہم دنیا بھر میں اردو زبان کے فروغ کے لیے انتھک محنت کر رہے ہیں۔

انھوں نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے کہا کہ ایم کیو ایم کا امیج بہتر بنانے میں ہم سے تعاون کیجیے۔ میں نے کہا امیج بہتر بنانے کے لیے آپ کو طاقت کی سیاست کو خیرباد کہنا اور فوج کو ٹیک اوور کی دعوت دینے سے الطاف بھائی کو مکمل اجتناب کرنا ہوگا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے مقام سے گر جاتے اور حاسدوں کی نظر میں ظریف دکھائی دیتے ہیں۔ ایم کیو ایم بلاشبہ درمیانے طبقے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت ہے جو ایک صحت مند انقلاب لا سکتی ہے لہٰذا اس قیمتی متاع کو اندرونی خلفشار سے گزند نہیں پہنچنی چاہیے۔ وہ جب مجھے سیڑھیوں تک چھوڑنے آئیں تو ایک شعلہ سا لپکا کہ ان کے وجود میں اہلِ لاہور کی وضع داری اور کشادہ دلی رچی بسی ہے۔

پاکستانی ہوابازوں کا لازوال کارنامہ

ہیلی کاپٹر جنھیں بھارتی نہ پکڑ سکے

پاک فوج کے دلیر پائلٹ دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اپنے بھی "مشینی ساتھی" ڈھاکہ سے بحفاظت وطن واپس لے آئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شفاعت اللہ شاہ

۶/ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ ہوائی اڈے کی تباہی کے بعد مشرقی پاکستان میں فوجی نقل و حرکت، ہتھیاروں کی فراہمی، زخمیوں کی مدد اور جنگی مہمات کا واحد ذریعہ ۴ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن رہ گیا جس نے ہنگامی حالت کے آغاز سے لے کر اختتام تک چٹاگانگ، بیراب بازار، فینی (Feni)، باریسال اور بلونیا کے علاقوں میں اپنے صرف چار MI-8 ہیلی کاپٹروں اور تین چھوٹے ہیلی کاپٹروں سے ۸۶۱ جنگی مشن بڑی دلیری اور مہارت سے انجام دیے۔

۱۴/ دسمبر کی شام مشرقی پاکستان میں بری فوج کے کمانڈر جنرل نیازی نے ایڈمرل محمد شریف، ایئر

مارشل انعام الحق اور میجر جنرل راؤ فرمان علی خان کی موجودگی میں حکم دیا کہ ۱۶؍دسمبر سے پہلے اپنے سب جنگی جہاز، ٹینک، توپیں، ہیلی کاپٹر اور بھاری اسلحہ تباہ کر دیا جائے۔ مزید یہ کہ تمام پاکستانی یونٹ اپنی اپنی جگہ بھارتی فوج کے سامنے ۱۶؍دسمبر کو ہتھیار ڈال دیں۔ یہ حکم سب کے لیے نہایت مایوس کن تھا۔

۴ ایوی ایشن اسکواڈرن کے سربراہ کرنل لیاقت بخاری نے جنرل نیازی کو مشورہ دیا کہ ہیلی کاپٹروں کو تباہ کرنے کے بجائے ہم انھیں برما کے راستے پاکستان لے جا سکتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں پاک فضائیہ کے سربراہ انعام الحق نے تکنیکی وجوہ کی بنا پر اسے ناقابلِ عمل، نہایت مشکل، خطرناک، اور خودکش منصوبہ قرار دیا۔ کیونکہ ہیلی کاپٹروں میں ایسے آلات نصب نہ تھے کہ وہ تاریکی میں کسی ریڈیو کی مدد لیے بغیر ہوابازوں کو بحفاظت برما پہنچا سکیں۔ بغیر کسی روشنی کے دوران پرواز ہیلی کاپٹر ٹکرانے کا خدشہ بھی تھا۔

چھوٹے ہیلی کاپٹروں میں دو گھنٹے کی پرواز ممکن تھی برما کے شہر اخیاب پہنچتے ہوئے چار گھنٹے لگ جاتے۔ علاوہ ازیں بھارتی بحریہ کا طیارہ بردار جہاز "وکرانت" بھی کاکس بازار میں لنگر انداز تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی پاکستانی ہیلی کاپٹر مشرقی پاکستان سے نکلنے نہ پائے۔ آخر مشرقی پاکستان میں پاک بحریہ کے کمانڈر ریئر ایڈمرل شریف نے مشورہ دیا کہ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن کو اپنے ہیلی کاپٹروں اور منصوبے کا سب سے زیادہ تجربہ ہے۔ اگر وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے تو ہمیں بات مان لینی چاہیے۔

جنرل نیازی نے جی ایچ کیو میں چیف آف جنرل اسٹاف، جنرل گل حسن سے فون پر رابطہ کیا۔ انھوں نے بغیر کسی جھجک کے فوراً ہیلی کاپٹروں کو پاکستان لانے کی اجازت دے دی۔ اب جنرل نیازی نے کرنل لیاقت بخاری کو ہدایت کی کہ وہ میجر جنرل محمد رحیم خان کو جو دشمن کے ہوائی حملہ میں شدید زخمی ہو چکے تھے اور کچھ پاکستانی خواتین و بچے بھی ساتھ لے جائیں۔ دراصل منصوبے کے مطابق حکومت برما پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا تھا کہ یہ فوجی ہیلی کاپٹر ہیں۔ ان کی شناخت چھپانے کے لیے پاکستانی عملے نے ہیلی کاپٹروں پر کندہ تمام فوجی نشان اور نمبر تارکول سے ڈھانپ دیے۔

پرواز کا وقت ۱۵؍دسمبر کو تین بجے شب مقرر کیا گیا تاکہ مشرقی پاکستان کا تمام علاقہ رات کی تاریکی میں طے ہو اور پو پھٹنے سے پہلے ہیلی کاپٹر برما کی سرحد میں داخل ہو جائیں۔ چھوٹے ہیلی کاپٹروں میں دو گھنٹے بعد پٹرول ڈالنے کی ضرورت تھی۔ ان کے ساتھ زائد پٹرول ڈبوں میں بھر کر رکھ دیا گیا تاکہ راستے میں کسی محفوظ جگہ اتر کر پٹرول ڈالا جا سکے۔

دشمن کی فضائی برتری اور ڈھاکہ ہوائی اڈہ تباہ ہونے کی وجہ سے عملے نے سبھی ہیلی کاپٹر ڈھاکہ چھاؤنی کے گاف کورٹس میں اونچے اونچے درختوں کے نیچے چھپا دیے تھے۔ ہر شب انھیں نکال کر ہواباز اپنا اپنا مشن پورا کرتے اور صبح کی روشنی سے پہلے ہی انھیں ڈھانپ دیتے۔ یہ کام اسکواڈرن کے عملے نے ایسی مہارت سے انجام دیا کہ پوری جنگ میں بھارتی فضائیہ اپنی مکمل برتری، جدید فضائی کیمروں اور بنگالی جاسوسی نیٹ ورک کے باوجود ایک بھی ہیلی کاپٹر نہ ڈھونڈ سکی۔ پٹرول ٹینک اندرون ہی میں واقع ہونے کے باعث ہر بڑے ہیلی کاپٹر میں صرف ۱۶ مسافروں کی گنجائش تھی۔ چھوٹے ہیلی کاپٹروں میں پٹرول کے ڈبے رکھے جانے تھے، لہٰذا کسی مسافر کے لیے جگہ نہ بن سکی۔

جب رات ہوا باز دو بجے کے قریب ہیلی کاپٹروں کے قریب پہنچے تو وہاں مرد و زن اور بچوں کا ہجوم دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ دراصل ڈھاکہ چھاؤنی میں تب تک خبر پھیل چکی تھی کہ ہیلی کاپٹر پاکستان جا رہے ہیں۔ مرد و خواتین اپنے اپنے بچوں اور سامان کے ساتھ ہیلی کاپٹروں میں گھس بیٹھے تھے۔ کوئی پٹرول ٹینک پر بیٹھا تھا تو کوئی دروازے سے لٹکا ہوا تھا۔ ہر ایک کو یہ سمجھانا نہایت دشوار مرحلہ بن گیا کہ ایک ہیلی کاپٹر میں صرف ۱۶ مسافر بیٹھنے کی جگہ ہے ورنہ وہ زیادہ بوجھ کی وجہ سے پرواز نہ کر سکے گا۔ کوئی بھی اترنے کے لیے تیار نہیں تھا اور پرواز کا وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آخر تگ و دو کے بعد انھیں قائل کیا گیا کہ اگر نظم و ضبط سے کام نہ لیا تو خواتین و بچے بھی نہیں جا سکیں گے۔ پھر بھی ہر ہیلی کاپٹر میں ۱۶ کے بجائے ۳۵ کے قریب مسافر بٹھانے پڑے۔

تمام خواتین و بچے سہمے ہوئے تھے۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے عزیزوں کے بغیر دیارِ غیر میں کن حالات سے دوچار ہوں گے اور پیچھے رہنے والوں پر کیا بیتے گی۔ کچھ خواتین زار و قطار رو رہی تھیں۔ کچھ قرآنی آیات کی تلاوت کرنے میں مصروف تھیں۔

۱۶ کے بجائے ۳۵ مسافروں کے ساتھ اونچے درختوں کے درمیان مکمل تاریکی میں پرواز کرنا نہایت ہی خطرناک مرحلہ تھا۔ ٹھیک رات ساڑھے تین بجے پہلے ہیلی کاپٹر میں بیٹھے کرنل لیاقت بخاری، میجر ریاض الحق اور میجر علی قلی خان نے اللہ کا نام لے کر اس تاریخی پرواز کا آغاز کیا۔ ہیلی کاپٹر وزن کے باعث انجن کی پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے آہستہ آہستہ درختوں کو پیچھے چھوڑتا اور بچتا ہوا تاریکی میں بلند ہونے لگا۔ یوں پرواز کا مشکل ترین آغاز بخیر و عافیت طے پا گیا۔

> ۴ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن پاک فوج کا واحد یونٹ ہے جس نے مشرقی پاکستان میں سقوط ڈھاکہ کے منحوس دن دشمن کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اس کے جوانوں نے ۱۳۹ پاکستانی خواتین و بچے اور اپنے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے براستہ برما بحفاظت پاکستان پہنچائے۔
>
> اسکواڈرن نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء سے ۱۵ دسمبر تک کرنل لیاقت بخاری (ستارہ جرأت) کی قیادت میں دن رات ''۸۶۱'' اہم و خطرناک جنگی معرکوں میں حصہ لیا۔ دشمن کی تمام تر ہوائی و زمینی برتری اور ہیلی کاپٹروں میں اشد ضروری فضائی و زمینی آلات کی نایابی کے باوجود چٹاگانگ، بیراب بازار اور بلونیا جیسے تاریخی آپریشن نہایت کامیابی اور کم تر نقصانات سے انجام دیے۔ ۴ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن کو بعد ازاں بہادری اور مشرقی پاکستان میں نہایت عمدہ کارکردگی پر ''Battle Honour'' کے ایوارڈ کے لیے چنا گیا اور ''Gallants'' کا خطاب دیا گیا۔

پانچ منٹ بعد دوسرے ہیلی کاپٹر میں میجر اکرم اور میجر علی جواہر نے اپنی پرواز شروع کی۔ پانچ منٹ بعد تیسرا ہیلی کاپٹر میجر باجوہ اور میجر ظہور نے ہوا میں بلند کیا۔ پانچ منٹ بعد ہی چوتھا ہیلی کاپٹر بھی محوِ پرواز ہوگیا۔ چاروں ہیلی کاپٹروں کی بحفاظت پرواز پر سب نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ چھوٹے اور آخری ہیلی کاپٹروں میں کیونکہ وزن کا مسئلہ نہ تھا لہٰذا ان کی پرواز نسبتاً آسان رہی۔ ان کے لیے سب سے خطرناک مرحلہ دو گھنٹے پرواز کے بعد رات کی تاریکی میں کسی انجانی جگہ اتر کر پٹرول

بھرنا تھا۔ پورے مشرقی پاکستان میں ہر جگہ بھارتی فوج اور مکتی باہنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں دشمن کے علاقے میں اتر کر ہیلی کاپٹروں میں پٹرول ڈالنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ بہرحال دونوں چھوٹے ہیلی کاپٹر میجر نعمان محمود اور میجر پیٹرک کی قیادت میں پروگرام کے مطابق پرواز کر گئے۔

اس طویل پرواز کے دوران ہیلی کاپٹروں میں وہ ضروری آلات نصب نہ تھے جن سے تاریکی میں راستہ ڈھونڈنے میں مدد ملتی یا تصدیق ہو سکتی کہ وہ ٹھیک سمت پر ہیں۔ اسی لیے زیادہ اونچی پرواز سے پرہیز کیا گیا ورنہ دشمن کے ریڈار سے بچنا آسان ہو جاتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بھارتی ریڈار انھیں شناخت نہیں کر سکا۔ موسم یا ہوا کی رفتار اور سمت جاننے کا بھی کوئی آلہ نہیں تھا۔ گھرے بادلوں کی وجہ سے درست راستہ متعین کرنے میں بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال ہیلی کاپٹروں نے پہاڑوں کے بیچ درختوں سے بچتے ہوئے نہایت نیچی پرواز جاری رکھی۔ ہیلی کاپٹروں کو صرف وقت اور سمت پر بھروسہ کر کے منزل تک پہنچنا تھا۔

جب بھی ہیلی کاپٹر کسی شہر یا قصبے کے قریب سے گزرتے، نیچے سے دشمن فائرنگ کر دیتے۔ چونکہ ہیلی کاپٹر میں کوئی بلب نصب نہ تھا، اس لیے اندھیرے میں دشمن کے سبھی نشانے خطا گئے۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہ کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر منزل پر پہنچ گئے۔ دشمن کو اس پرواز آزادی کی بھنک بھی نہ پڑی۔ وہ منصوبے کے عین مطابق مشرقی پاکستان کی سرحد پار کر کے برما داخل ہو گئے۔ صبح ساڑھے چھے بجے پہلا ہیلی کاپٹر اخیاب، برما کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ ہوائی اڈے کا عملہ ان کے آنے سے بے خبر تھا۔ لہٰذا وہاں کوئی بھی

بریگیڈیئر لیاقت بخاری نے ۱۹۷۱ء میں ۴ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن کی ڈھاکہ میں بطور لیفٹیننٹ کرنل کمان سنبھالی۔ انھوں نے ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت کی لڑائی کے دوران بے مثال دلیری دکھانے کے صلے میں ستارہ جرأت حاصل کیا۔

موجود نہ تھا۔ سب پاکستانیوں کے چہروں پر اطمینان اور خوشی کی لہر چمک اٹھی۔ خواتین دوپٹے اٹھا اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کرتی اور عملے کو دعائیں دیتی رہیں۔ پانچ منٹ بعد دوسرا پھر تیسرا اور چوتھا ہیلی کاپٹر بھی منزل مقصود پر بحفاظت آن پہنچا۔

اب اخیاب ہوائی اڈے کے عملے کو تشویش ہوئی کہ اتنے ہیلی کاپٹر بغیر کسی اطلاع کے کہاں سے آ گئے؟ کچھ ہی دیر بعد ہوائی اڈے کا ایک افسر کرنل لیاقت بخاری کے پاس آیا اور آنے کا مقصد پوچھا۔ انھوں نے اپنا تعارف بحیثیت ''چیف پاکٹ پلانٹ پروٹیکشن'' کرایا اور بتایا کہ وہ ڈھاکہ سے پاکستانی خواتین و بچے لائے ہیں۔ اور جلد بنکاک چلے جائیں گے۔ برمی افسر اس

جواب سے مطمئن ہو کر لوٹ گیا۔ چھوٹے ہیلی کاپٹر سست رفتاری اور راستے میں رک کر پٹرول بھرنے کے باعث ایک گھنٹا تاخیر سے پہنچے۔

اُدھر ڈھاکہ میں ۱۶؍ دسمبر کی دوپہر بھارتی جنرل جان جیکب اپنے ہیلی کاپٹر میں سقوطِ ڈھاکہ سے متعلقہ کاغذات لیے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ اس وقت ۴ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن کے میجر توحید الحق وہیں موجود تھے۔ انھیں جنرل نیازی کے حکم پر انتظامی ضروریات کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ پاک فوج ہتھیار ڈالنے والی ہے اور فوجی قواعد و ضوابط کے تحت ہر شخص جنگی قیدی بننے سے فرار کی کوشش کرسکتا ہے، لہٰذا وہ بھی برما پرواز کر جائیں۔

میجر توحید الحق نے اپنے منصوبے کا ذکر اپنے ساتھیوں میجر ظریف، میجر خالد جعفر اور میجر مسعود انور سے بھی کیا جنھوں نے فوراً اس کی تائید کر دی۔ اس طرح باقی ماندہ چھوٹا ہیلی کاپٹر بھی دن کی روشنی میں دشمن کی آنکھوں کے سامنے پرواز کر کے برما کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب اس نے ڈھاکہ سے پرواز کی، کسی بھارتی یا بنگالی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستانی ہواباز اس وقت پرواز کا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ وہ ہیلی کاپٹر کو بھارتی سمجھتے رہے۔

شام چھے بجے ان چاروں ہوا بازوں کو اچانک اکیاب میں دیکھ کر ۴ اسکواڈرن کے سب ہوا باز خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اس طرح ۴ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن کے تمام ہواباز اور ہیلی کاپٹر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دشمن کی اسیری سے بحفاظت نکل آئے۔ یہی نہیں، انھوں نے ۱۳۹ خواتین اور بچوں کی قیمتی زندگیاں بھی بچالیں۔

۴ آرمی ایوی ایشن اسکواڈرن پاک فوج کا واحد یونٹ ہے۔ جس کے عملے کو اللہ تعالیٰ نے اتنی ہمت و بصیرت دی کہ وہ جنگ میں نہایت بہادری سے لڑنے کے بعد دشمن کے چنگل سے نکل کر بغیر ہتھیار ڈالے اپنے سارے ہیلی کاپٹر اور ۱۳۹ خواتین و بچوں کو عزت و آبرو کے ساتھ پاکستان واپس لے آیا۔ ◆◆◆

اٹل فیصلہ

۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور کو کوئی مسلمان فراموش نہیں کرسکتا۔ وہ ایک اہم اور تاریخی اجلاس جس میں حصول و قیام پاکستان کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کی اہمیت یوں بھی بڑھ گئی تھی کہ اس کے انعقاد سے دو دن قبل لاہور میں سر سکندر حیات خاں کی وزارت اور خاکساروں کے درمیان شدید تصادم ہو گیا تھا۔ مرکزی حکومت نے اپنے وزیر قانون چودھری ظفر اللہ خان کی زبانی قائداعظمؒ کو کہلایا کہ وہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے کیونکہ اس سے نقضِ امن کا سخت اندیشہ ہے اور قائداعظمؒ کی زندگی خطرے میں ہے۔ یہ وقت تھا جب کہ ہندوستان کے طول و عرض سے لوگ جوق در جوق دہلی میں جمع ہو رہے تھے تاکہ اسپیشل ٹرین سے سفر کر کے اجلاس لاہور میں شریک ہوں۔ قائداعظمؒ کی خود اعتمادی اور راہنمائی کی آزمائش تھی۔ انھوں نے ہم چند مخصوص لوگوں سے مشورہ طلب کیا۔ قائداعظمؒ کے ارادے اور طبیعت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے التوا کے خلاف رائے دی۔ انھوں نے اس پر عمل کرتے ہوئے وہی فیصلہ کیا جو ایک بڑے دور اندیش راہنما کا شیوہ ہونا چاہیے یعنی انھوں نے قطعی طے کرلیا اور حکم صادر کر دیا کہ یہ اجلاس ہو کر رہے گا اور وہ خود بھی اس میں شرکت کریں گے۔

(نواب صدیق علی خان)

سرما آتے ہی بہت سے لوگ اس موسم کی مخصوص بیماریوں مثلاً کھانسی، نزلہ، زکام اور بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں تو انسان کی طبیعت زیادہ نہیں بگڑتی اور وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔ ذیل میں موسم سرما کے عام امراض کا معلومات افزا تذکرہ پیش ہے۔

اس تذکرے میں خصوصاً ان ادویہ کی خوبیاں و خامیاں بتائی گئی ہیں جو سرمائی بیماریوں میں مستعمل ہیں۔

کھانسی

کھانسی روکنے والی دوائیں عموماً شربت کی شکل میں

نزلہ، زکام اور کھانسی

جاڑے کی بیماریوں کا مقابلہ کیجیے

موسم سرما میں حملہ آور ہونے والے امراض سے بچاؤ کی سہل تدابیر و مشورے

ڈاکٹر آصف محمود جاہ

ہوتی ہیں۔ یہ دوائیں دو طرح سے اثر کر کے کھانسی روکتی ہیں۔

ا۔ پہلی قسم میں کھانسی کے وہ شربت شامل ہیں جو بلغم کے اخراج میں مدد کر کے کھانسی روکتے ہیں۔ مثلاً: ہائیڈریلین (Hydryline)، پلمونول (Pulmonol) ایمونیم کلورائیڈ (Ammonium Choloride)۔

۲۔ دوسری قسم کے شربت کھانسی روکنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فالکوڈین (Pholodine) اور ایکٹیفیڈ ڈی ایم (Actifed DM)۔

ادویہ کے مضر اثرات

غنودگی، بے خوابی، اعصابی نظام میں گڑ بڑ، سانس لینے میں دشواری۔

احتیاط:

☆ یہ دوا زیادہ مقدار میں استعمال نہ کی جائے۔

☆ دوا لینے کے فوراً بعد گاڑی چلانے یا مشین پر کام کرنے سے پرہیز کیجیے۔

☆ بچوں کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا دی جائے۔

درج ذیل حالتوں میں خاص احتیاط سے استعمال کریں: ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، دل، جگر یا گردوں کی بیماری۔

دوا کی نوعیت اور ضرورت

انسانی جسم کا مدافعتی نظام بہت مضبوط ہے۔ جب بھی جسم پر کوئی مرض حملہ کرے تو سب سے پہلے اسی نظام کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے۔ کھانسی آنا بھی اس مدافعتی نظام کا ایک حصہ ہے۔ کھانسی کے ذریعے جمی ہوئی بلغم باہر نکلتی ہے جس سے سانس لینا آسان ہو جاتا ہے۔ کھانستے رہنے سے سانس کی نالی صاف رہتی ہے۔ بلغم کا اخراج نہ ہو تو سانس کی نالیاں تنگ ہو جاتی اور یوں سانس پھولنے اور دمہ کی بیماری کے حملے ہونے لگتے ہیں۔ ایسی کھانسی روکنے کے لیے کسی قسم کی دوا نہ کھائیے۔

اصل میں کھانسی کی دوا صرف اس وقت استعمال کیجیے جب اس کے ساتھ دوسری تکالیف ہوں یعنی بخار یا کوئی اور چھوت جن کا علاج بہت ضروری ہے۔

بعض اوقات گرم پانی اور نمک کے غرارے کرنے یا پھر بھاپ لینے سے کھانسی دور ہو جاتی ہے۔ مختلف قسم کی نت نئی دوائیں حقیقتاً کھانسی روکنے میں ذرا بھی مدد نہیں کرتیں۔ ان کا بے جا استعمال صرف پیسے کا ضیاع ہے۔ اس لیے ان کے استعمال سے پرہیز کیجیے۔

آسان اور متبادل علاج

کھانسی کم کرنے یا روکنے والے مختلف شربت دیکھنے میں بہت بھلے لگتے ہیں۔ جیب پہ بھی خاصا بوجھ ڈالتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے بچنا بہتر ہے۔ تھوڑی بہت کھانسی ہونا فائدہ مند ہے۔ اس سے سانس کی نالی صاف ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ کھانسی کی صورت میں مندرجہ ذیل گھریلو علاج فائدہ مند ہے:

☆ نیم گرم پانی میں نمک یا ڈسپرین ڈال کر غرارے کریں۔

☆ صبح دوپہر شام دو چمچ شہد میں چار دانے پسی ہوئی سیاہ مرچ ملا کر استعمال کریں۔

☆ صبح دوپہر شام ملٹھی استعمال کریں۔

☆ رات کو سونے سے پہلے کھلے برتن میں گرم پانی ڈال کر اس میں بینزوین ٹنکچر (Benzoin Tincture) کے چند قطرے یا نمک ملا کر بھاپ لیں۔

☆ زکام کی صورت میں گرم چنے لے کر ان کی بھاپ لیں۔

☆ شہد ملا انگور کا رس' کھانسی کا موثر ترین علاج ہے۔(ایک پیالی رس، ایک چمچ شہد)

☆ میٹھے بادام کی چھ سات گریاں پانی میں بھگوئیں۔ صبح چھلکا اتار کر چینی اور مکھن کے ساتھ ملا کر آمیزہ بنائیں اور کھا لیجیے۔ خشک کھانسی کے لیے مجرب نسخہ ہے۔

زکام

زکام کے علاج میں نت نئی دوائیں استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں سے چند مشہور دوائیں درج ذیل ہیں:

کولڈین (Coldene)، ایکٹیفائڈ۔ پی (Actified-p) اور ایرینیک (Arinac)۔

مضر اثرات:

☆ متلی، قے، چکر آنا، اونگھ، نیند آنا۔

احتیاط:

☆ ایسی دوائیں کھانے کے فوراً بعد گاڑی چلانے، تیرنے یا مشین پر کام کرنے سے پرہیز کریں۔

☆ حاملہ عورتیں اور بچے کو دودھ پلانے والی مائیں استعمال نہ کریں۔

دوا کی نوعیت اور ضرورت

زکام کے لیے مختلف قسم کی ادویہ کا بے جا استعمال ہوتا ہے۔ بعض نام نہاد حکیم اور جعلی ڈاکٹر ذرا سے زکام میں مختلف ادویہ کی کاک ٹیل بنا کر دیتے ہیں۔ اس میں درد دور کرنے کی دوا، الرجی والی اینٹی بائیوٹک اور سٹیرائیڈ شامل ہوتے ہیں۔

گو ایسی ادویہ سے فوری افاقہ ہوتا ہے لیکن ان کے مضر اثرات کی وجہ سے بعد میں خاصے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ زکام یا فلو ایک وائرس کی وجہ سے ہوتا ہے جس میں ادویہ کے استعمال کا ذرا بھی فائدہ نہیں۔ زکام کے دوران ناک میں ڈالنے یا بند ناک کھولنے والی ادویہ سے حتی المقدور پرہیز کریں۔ ان سے بلڈ پریشر ہونے اور خون کی نالیاں سکڑنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

بہتر ہے کہ ادویہ کے استعمال سے بچا جائے۔ تاہم زکام کی وجہ سے اگر سردرد یا بخار ہو تو اس صورت میں پیراسٹامول یا ڈسپرین لینے میں کوئی حرج نہیں۔ نیز مندرجہ ذیل آسان گھریلو نسخوں پر عمل کریں:

☆ بھاپ لینے سے وائرس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

☆ وٹامن سی کا استعمال بھی فائدہ مند ہے۔ اس سلسلے میں کنو اور مالٹے کا رس پیجیے۔

☆ یخنی لیجیے اور جوشاندہ وغیرہ استعمال کریں۔

☆ کھانسی اور گلے کی خراش کی صورت میں غرارے کریں۔

☆ ملٹھی استعمال کریں۔

گلے کے امراض

دوران موسم سرما گلے کی سوجن، گلا پکنے، درد اور خارش میں مختلف قسم کی ادویہ مستعمل رہتی ہیں۔ ان میں دافع درد الرجی دور اور سوجن کم کرنے والی ادویہ شامل ہیں۔

دوا کی نوعیت اور ضرورت

گلے کی مختلف تکالیف کے لیے دوائیں استعمال کرتے وقت یہ تعین کرنا بہت ضروری ہے کہ دوا کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں؟ معمولی گلا خراب ہونا یا گلے میں خارش ہو جانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ کھانے پینے میں احتیاط نہ کرنے اور بہت زیادہ ٹھنڈی، زیادہ گرم اور چٹ پٹی تیز مسالے والی چیزیں کھانے سے بھی گلا خراب ہو جاتا ہے۔

یہ بیماری ایک آدھ دن بعد خود بخود ٹھیک ہو جاتی

ہے۔ گلے میں چھوت ہونے کی صورت میں اینٹی بائیوٹک دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ضروری ہے کہ پہلے ڈاکٹر سے مشورہ کرلیا جائے۔ گلے کی معمولی تکلیف بعض اوقات صرف غرارے کرنے سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تکلیف برقرار ہے تو ڈاکٹر کے مشورے سے علاج کیجیے۔

آسان اور متبادل علاج

گلے کی تکالیف دور کرنے کے مندرجہ ذیل آسان آزمودہ نسخوں پر عمل کریں۔

☆ نیم گرم پانی میں نمک ملا کر باقاعدگی سے غرارے کریں۔

☆ ادرک کے رس میں شہد ملا کر چاٹنے سے بھی گلا ٹھیک ہو جاتا ہے۔

☆ ذرا سی سونف منہ میں ڈال کر دن میں کئی بار چبائیں اور اس کا رس نگل لیں۔

☆ آواز بیٹھ جانے کی صورت میں آدھا لیٹر پانی میں تھوڑی سی سونف ڈال کر پکائیے۔ چوتھا حصہ رہ جائے تو اسے اتار حسب ذائقہ چینی ملا کر دو تین بار دن میں استعمال کیجیے۔ آواز ٹھیک ہو جائے گی۔

☆ ایک چمچ سرکہ پانی میں ڈال کر غرارے کریں۔

☆ ایک لیموں پانی میں دس منٹ تک ابالیں۔ اس کا رس نکال کر ایک گلاس میں ڈالیں۔ اس میں دو چمچ گلیسرین ڈال کر اچھی طرح ہلائیں۔ پھر دو چمچ شہد ڈالیں اور گلاس پانی سے بھر لیں۔ کھانسی کا قدرتی شربت تیار ہے۔ گلے کی خرابی سے ہونے والی کھانسی کے دوران پانچ دن تک دو چمچ صبح، دوپہر، شام استعمال کریں، ان شاء اللہ افاقہ ہوگا۔

☆ ملٹھی اور سونف کا استعمال بھی کھانسی روکنے میں مد ثابت ہوتا ہے۔

دمہ

دمے کے علاج میں بھی مختلف قسم کی دوائیں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ مختلف قسم کے انہیلر (Inhaler) بھی مستعمل ہیں۔ چند مشہور دوائیں درج ذیل ہیں:

وینٹولین (Ventoline)، تھیوگریڈ (Theograde)، وینٹولین انہیلر، وینٹائڈ انہیلر (Ventide Inhaler) وغیرہ۔

مضر اثرات:

☆ متلی، قے، بے چینی، گھبراہٹ

☆ پٹھوں میں رعشہ، سر درد، پریشانی

☆ دل کی رفتار میں اضافہ، بلڈ پریشر میں کمی

☆ زود حساسیت

احتیاط:

☆ ہائی بلڈ پریشر، دل کی تکلیف اور السر کے مریض ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق استعمال کریں۔

☆ خواتین دوران حمل اور بچے کو دودھ پلانے کی مدت کے دوران استعمال نہ کریں۔

☆ اگر دوا کھانے کے بعد ہاتھ پاؤں کانپنے لگیں تو ان کا استعمال بند کر دیں۔

دوا کی نوعیت اور ضرورت

دمہ بچوں اور بڑوں کے لیے تکلیف دہ بیماری ہے۔ اس میں بار بار سانس اکھڑتا ہے جو بعض حالتوں میں خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

دمہ بعض اوقات الرجی پیدا کرنے والی اشیا مثلاً گرد، ننھے کیڑوں، پولن گرین یا کھانے پینے کی اشیا کی

وجہ سے جنم لیتا ہے یا پھر چھوت سے۔ اس باعث سانس کی نالیوں میں بلغم جمع ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں سب سے بہتر علاج الرجی جنم دینے والے عناصر سے پرہیز اور چھوت کو کنٹرول کرنا ہے۔

ادویہ کے استعمال میں سب سے ضروری امر یہ ہے کہ استعمال کرنے سے پہلے ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے۔ بعض نام نہاد حکیم اور ڈاکٹر دمے میں فوری طور پر سٹیرائیڈز کا استعمال شروع کرا دیتے ہیں جس کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ مختلف قسم کی اینٹی ویکسین بھی بنائی جاتی ہیں۔ لیکن تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ یہ ویکسین زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔

آسان اور متبادل علاج:

اگر آپ ''دمہ'' کا شکار ہیں تو گھبرایئے نہیں، اس کا حل موجود ہے۔ سب سے پہلے ان چیزوں کو جاننے کی کوشش کیجیے جن سے آپ پر دمہ کا حملہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان عوامل سے بچیے، مثلاً مٹی، گرد وغیرہ سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل گھریلو نسخوں پر عمل کریں، ان شاء اللہ افاقہ ہوگا۔

☆ کھانے پینے کی ایسی تمام اشیا سے پرہیز کیجیے جن کے کھانے سے آپ کو الرجی ہو یا دمہ کا حملہ جائے۔

☆ روز مرہ کی خوراک میں انگور، کھجور اور امرود باقاعدہ استعمال کریں۔

☆ تلسی کے پتے، ادرک، پیاز لے کر ان کا رس نکالیں اور اس میں شہد کے دو چمچ ملا دیجیے، دو دو چمچ صبح دوپہر شام استعمال کریں۔

☆ سبزیاں زیادہ استعمال کریں۔ گاجر کے موسم میں اس کا رس نوش کیجیے۔

☆ لیموں کے رس میں ادرک اور شہد ملا کر استعمال کریں۔

☆ سبزیوں کی یخنی صبح شام لیں۔

☆ سادہ غذا لیں، مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں، تلی ہوئی چیزوں اور زیادہ گھی و تیل والی تمام اشیا کے استعمال سے بچیے۔

☆ مشروبات اور سگریٹ نوشی سے مکمل کنارہ کشی کریں۔

☆ روزانہ دو چمچ شہد کا استعمال دمہ اور سانس کی دیگر بیماریوں میں موثر ثابت ہوتا ہے۔

☆ تین یا پانچ انجیر گرم پانی سے صاف کر کے رات بھر گھڑے کے پانی میں ڈال کر رکھیں۔ نہار منہ انجیریں کھا کر پانی بھی پی لیں۔ صرف پندرہ دن یہ عمل کریں، بیماری سے افاقہ ہوگا۔

◆◆◆

زیر نظر مضمون ڈاکٹر آصف محمود جاہ کی کتاب ''دوا، غذا اور شفا'' سے اخذ کردہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسٹم افسر ہونے کے علاوہ مشہور سماجی کارکن اور مصنف بھی ہیں۔ کہیں قدرتی آفت حملے کرے، تو سب سے پہلے مصیبت زدگان کی مدد کرنے پہنچتے ہیں۔

دوا، غذا اور شفا میں ڈاکٹر صاحب نے ۸۰ سے زائد بیماریوں کی مختصر معلومات اور علاج میں استعمال ہونے والی ادویہ کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ گھر کا ہر فرد عام بیماریوں کی ماہیت سے واقف ہو سکے۔ اس کتاب کو عمدہ انداز میں نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۱۳۰ روپے ہے۔ اپنی صحت کی فکر کرنے والے مرد و زن اس کتاب کو اپنے لیے مفید پائیں گے۔

ایک استاد کا لاجواب فلسفۂ حیات

مومن کبھی ریٹائر نہیں ہوتا

باعمل اور سچے والد کی خدمت میں ایک بیٹے کا سبق آموز نذرانۂ عقیدت

عامر عتیق صدیقی

میرے والد گرامی عتیق الرحمان صدیقی ۴ ستمبر ۲۰۱۴ء بروز جمعرات ہمیں سوگوار چھوڑ کر ۷۶ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔ وہ دسمبر ۱۹۹۸ء میں بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ ۴۳ سال تک صوبہ سرحد کے مختلف تعلیمی و تدریسی اداروں میں متعدد حیثیتوں سے تدریسی و انتظامی فرائض انجام دیے۔ ملازمت کا زیادہ حصہ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن فار ایلیمنٹری ٹیچرز ہری پور میں گزارا۔

اس دوران تربیت اساتذہ و نصاب سازی کے حوالے سے ملکی و غیر ملکی منصوبوں میں بھی کام کیا اور پیشہ ورانہ بہتری اور فکری و نظریاتی حوالوں سے اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ وقت کی پابندی، ڈسپلن، قانون کا احترام، اپنی ذمے داریوں اور فرائض سے آگاہی، قول و فعل میں یکسانیت، اپنے منصب کے وقار کا لحاظ، مسلسل مطالعہ، گردوپیش سے باخبری، پیشہ ورانہ اور نت نئی تعلیمی و تدریسی مہارتوں و تکنیکوں سے آگاہی ایک استاد کے لیے ضروری تصور کرتے تھے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بارے میں کہا کرتے "یہ زندگی سے ریٹائر ہونا نہیں۔ ایک بندۂ مومن کبھی ریٹائر نہیں ہوتا، وہ اپنے حصے کا کام کرتا چلا جاتا ہے۔" یہی جملے آپ کی زندگی کے مصداق تھے۔ سبکدوشی کے بعد باقاعدگی سے قومی اخبارات و رسائل میں دینی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مسلسل مطالعہ قرآن و حدیث، لٹریچر، اخبارات و رسائل ان کی سرشت میں تھا۔ ۱۹۸۵ء سے علالت (۲۰۱۴ء) تک ایلیمنٹری کالج ہری پور کی مسجد میں فی

سبیل اللہ خطابت کی ذمے داریاں نبھائیں۔ پروگراموں میں درس قرآن اور دوسرے موضوعات پر تقاریر کرتے۔ وہ دل کو موہ لینے والی، ادبی حسن سے مرصع اور فکری گہرائی و گیرائی سے لبریز ہوتیں۔ مسلکی و فروعی اختلافات ان کا موضوع نہ ہوتے۔ آپ کی تحریر کردہ سات کتب مثلاً نقوش سیرت ﷺ، چراغ مصطفوی ﷺ، شوق حرم وغیرہ منظر عام پر آئیں جن پر قومی اخبارات و جرائد میں تبصرے چھپے۔

آپ باعمل، سچے اور دوٹوک مسلمان تھے۔ اپنے شاگردوں اور اولاد کی تعلیم و تربیت میں یکساں فکر رکھتے۔ کہتے کہ تعلیم انسان کا زیور ہے، یہ جتنی اچھی اور زیادہ ہو، ایک انسان کے لیے اعزاز کا باعث ہے۔ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولتے اور گالی بکنے کو بہت برا تصور کرتے۔ کہتے کہ اولاد انتہائی قیمتی متاع ہے۔ والدین جہاں ان کی جسمانی ضرورتوں و خواہشوں کا اہتمام کرتے ہیں، وہاں ان کی روحانی و فکری غذا اور تربیت کا بندوبست کرنا بھی ان پر لازم ہے۔ جبکہ اساتذہ اس انداز میں اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوں کہ نونہالان قوم کے اندر غور و فکر، تحقیق و جستجو اور تنقیدی نکتہ نگاہ پروان چڑھے، وہ دور حاضر کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں اور فکری و نظریاتی اعتبار سے اپنی شناخت رکھتے ہوں۔

راقم الحروف جب پرائمری کا طالب علم تھا تو اس دوران والد گرامی ہاسٹل سپرنٹنڈنٹ کی اضافی ذمہ داری نبھا رہے تھے۔ ایک شام میں ان کے ساتھ ایلیمنٹری کالج کے دارالاقامہ برائے طلبہ گیا۔ دفتر سے والد صاحب بسلسلہ کسی کام اٹھ کر باہر گئے۔ میز پر نیلی، سرخ سیاہی و قلم وغیرہ پڑے تھے۔ راقم نے جیب سے اپنا قلم نکالا اور میز پر رکھی دوات سے سیاہی بھرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد والد صاحب تشریف لائے اور پوچھا ''کیا کر رہے ہو؟''

راقم نے عرض کیا ''قلم میں سیاہی نہیں تھی، یہاں سے ڈال لی۔'' انھوں نے فوراً کہا ''یہ ہماری نہیں...... سرکاری ہے۔ میں یہاں کا کام اس سے کرتا ہوں۔ آپ فوراً سیاہی واپس دوات میں ڈال دیں اور صحن میں پانی والے نلکے سے قلم دھو کر آئیں۔''

اسی طرح علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی ایڈ کرنے کے دوران ایک دفعہ راقم کا نام محترم (ٹیوٹر) والد کے پاس آ گیا۔ آپ نے وقت مقررہ پر مشق دینے کو کہا۔ راقم نے پانچ میں سے چار سوالات حل کر کے والد صاحب کو مشق جمع کرا دی۔ ان دنوں مشق جمع ہونے کے پندرہ دن بعد نتیجہ یونیورسٹی روانہ کیا جاتا تھا۔ والد صاحب نے راقم کو کہا کہ وہ رزلٹ کل بھجوا رہے ہیں لہٰذا باقی ماندہ سوال کا جواب رات تک انھیں جمع کرا دیا جائے۔ کسی مصروفیت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ والد گرامی نے میری پروا کیے بغیر ۸۰ نمبروں والا نتیجہ ہی بھیج دیا۔ وہ میرٹ اور عدل و انصاف کے اصولوں پر اپنے پرائے سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔

بات ہمیشہ نپی تلی اور سلیقے سے کرتے اور سخت بات بھی اس انداز سے کرتے کہ مخاطب کو بری نہ لگتی اور اسے اپنی غلطی و کمزوری کا احساس ہو جاتا۔ خودداری، وضعداری اور دوسروں کی عزت نفس کا احساس آپ کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ صاف ستھرا اور باوقار لباس زیب تن کرتے۔

آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی دی ہوئی تربیت، تعلیمات، واعظ و نصیحت اور بیش بہا تحریریں ہمارا حقیقی ورثہ اور اثاثہ ہیں...... اللہ کریم انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کی مغفرت کرے اور ہمیں ان کے فکری ورثے کا امین ہوتے ہوئے یہ توفیق عطا فرمائے کہ معرکہ خیر و شر میں خیر کا دامن تھامتے ہوئے اسی کے غلبے کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔ ♦♦♦

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item/percentage rates above or below Market Rate System enforced since, 01.7.2004 with amended MRS Bi-annual period (1st August 2014 to 31 January 2015) District Vehari from the approved Contractors of LG&CD Department, Vehari for the year 2014-2015.

Tender documents can be obtained from the office of the Assistant Engineer, LG&CD Vehari on presentation of attested copies of enlistment/upto date renewal letters fees receipt, Pakistan Engineering Council license 2014 (Original), authority letter on letter paid of the contractor / firm, Identity card of Contractor / Managing Partner of the firm alongwith registered power of attorney, production of CDR of 2% earnest money and on payment of tender fee mentioned against each scheme.

Tenders will be issued upto **11-12-2014** in the office of the Assistant Engineer, LG&CD Department, Vehari and will be received on **13-12-2014** at 02:00 PM and opened on the same date at 02:30 PM in the presence of tendering opening committee and the contractors or their representatives. Conditional tenders will not be entertained.

The lowest bidder whose bid will be less more than 5% of the estimated cost of the work will have to deposit 10% Performance security in shape of CDR that will be returned on successful completion of the contract failure to deposit the performance security within 15 days would result into forfeited of 2% earnest money without any further notice.

2% earnest money and tender fee will be received in shape of CDR of each work separately.

The procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal. The procuring agency shall upon request communicate to any supplier or contractor who submitted a bid or proposal, the grounds for its rejection of all bids or proposals, but is not required to justify those grounds.

Completion Time: **As per work order**

Sr. No.	Name of scheme	Approved cost in Rs.	Earnest Money	Tender Fee	A.A No. & Date	Technical Sanction No. & Date
	PP-232					
1.	Const: of soling and drains Chak No. 227/EB and sewerage & drains 185/EB.	2000000	2%	1000	DO(P)1/06-7 Vehari/2014 dated 19.11.2014	67-71/XEN/CDM/ VR/SPDP 2014-15, Dated 20.11.2014
2.	Const: of soling and drains Mouza Jamlera, 175/EB, 375/EB and Monument DPS Chowk Gaggoo.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
3.	Const: of soling and drains Chak No. 359/EB, Sheikh Fazal and soling Basti Khalid Councilor Chak No.373/EB.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
4.	Const: of soling and drains Chak No. 403/EB and soling Dera Joyian wala 407/EB, 409/EB and Basti Gujran wali 411/EB.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
5.	Const: of soling and drains Chak No. 215/EB, 120/EB and soling & sewerage 114/EB.	2000000	2%	1000	-do-	-do-

	PP-233					
6.	Const: of soling, sewerage line and Tuff tile street Maqsood Gujjar and Farman Abad Chak No.435/EB.	2000000	2%	1000	DO(P)1/06-7 Vehari/2014 dated 12.11.2014	SE/LG&CD/5(28)-1/2014-15, dated 18.11.2014
7.	Const: of soling, resoling Chak No.493/EB, soling resoling and drains 469/EB, slab culverts and drains 495/EB and soling, resoling and drains 491/EB	3000000	2%	1500	-do-	49-66/XEN/CDM/VR/SPDP 2014-15, Dated 18.11.2014
8.	Const: of slab and drains Chak No.261/EB Basti Dehar and soling, resoling and drainage 463/EB Burewala.	3000000	2%	1500	-do-	-do-
9.	Const: of soling and resoling Ishtiaq Nagar, Laat Bhattian, Sadam Town and link Rajbah 5-L Burewala.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
	PP-234					
10.	Const: of soling and drainage UC No.21 Luddan.	2000000	2%	1000	DO(P)1/06-7 Vehari/2014 dated 12.11.2014	-do-
11.	Const: of soling and drainage UC No.22 Dad Kamara.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
12.	Const: of soling and drainage UC No.23 Budh Ghulam.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
13.	Const: of soling and drainage UC No.25 Karim wah.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
14.	Const: of soling and drainage UC No.26 Akbar Shah.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
	PP-235					
15.	Const: of soling, drain, sewerage and sullage carrier Chak No.515/EB and Zafar Colony Burewala.	6000000	2%	3000	DO(P)1/06-7 Vehari/2014 dated 12.11.2014	-do-
16.	Const: of soling, sewerage, drains, sullage carrier Chak No.557/EB Machiwal	2000000	2%	1000	-do-	-do-
17.	Const: of soling, sewerage, drains, sullage carrier Pakhi More.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
	PP-236					
18.	Const: of waiting shed Main Gate District Jail Vehari and Installation of CC footage Cameras Vehari City.	2000000	2%	1000	DO(P)1/06-7 Vehari/2014 dated 12.11.2014	SE/LG&CD/5(28)-2/ 2014-15, dated 18.11.2014
19.	Const: / Installation of Filtration Plant Govt. Boys Degree College Vehari.	2000000	2%	1000	-do-	SE/LG&CD/5(28)-4/ 2014-15, dated 18.11.2014
20.	Const: of soling, drains, sewerage and resoling UC No.14	2000000	2%	1000	-do-	49-66/XEN/CDM/VR/SPDP 2014-15, dated 18.11.2014
21.	Const: of soling, drains, sewerage and resoling UC No.20.	2000000	2%	1000	-do-	-do-
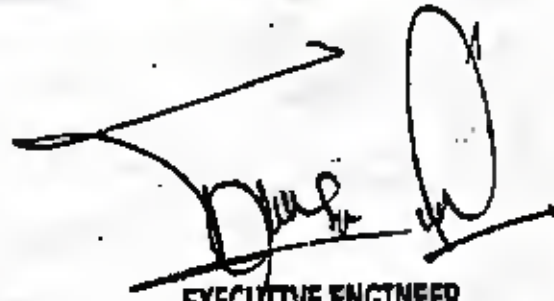
22.	Const: of M/R, soling, sewerage and sullage carrier UC No.5	2000000	2%	1000	-do-	-do-
	PP-237					
23.	Const: of soling and sullage carrier Mouza Borana and Dhaliu UC No.33.	2000000	2%	1000	DO(P)1/06-7 Vehari/2014 dated 12.11.2014	-do-
24.	Const: of soling, Pulli, sullage carrier and sewerage Basti Mamoor Waseer Hari Chand, Malik Wahin, Adda Ammi Pur, Alam Pur Minor UC No.33.	3000000	2%	1500	-do-	-do-
25.	Installation of street light and const: of soling and Pulli Rajbah Karmapur Hassan Shah UC No.34.	3000000	2%	1500	-do-	SE/LG&CD/5(28)-3/ 2014-15, dated 18.11.2014
26.	Const: of M/R Bhatta Umer Din to M/R Noor Shah Hari Chand Road.	2000000	2%	1000	-do-	49-66/XEN/CDM/ VI/SPDP 2014-15, Dated 18.11.2014
	PP-238					
27.	Const: of Metalled Road Tibba Mitru road to Basti Naly wala Mouza Chakdar.	10000000	2%	5000	DO(P)1/06-7 Vehari/2014 dated 19.11.2014	SE/LG&CD/5(28)-1/2014-15, dated 20.11.2014

CONDITION:
The Tender Form for scheme mentionedat Sr. No.19 will be issued to only those Contractors / Firms who fulfill following terms and conditions.

(i) Authorization سرٹیفیکیٹOEMلاٹ تیار کردہ USAویسٹرن یورپ RO
(ii) NSFسرٹیفیکیٹ Multibore UF Membrane.
(iii) کمشن سرٹیفیکیٹ و تنصیب شدہ فلٹریشن پلانٹ گورنمنٹ آرگنائزیشن
(iv) لاگ 6، لاگ 4، Removalسرٹیفیکیٹ برائے UF Membrane تھرڈ پارٹی خودمختار لیبارٹری یا یورپین

IPL-15092

EXECUTIVE ENGINEER
LOCAL GOVT: & COMMUNITY DEVELOPMENT,
MULTAN CIRCLE MULTAN
(067-3364009)

مادی دنیا میں رہتے بستے

جنت میں جانے کا آسان نسخہ

قرآن پاک کی روزانہ تلاوت روزِ حشر گناہوں کے سامنے ڈھال بن سکتی ہے

جاوید احمد صدیقی

۶۴۰ء کا واقعہ ہے۔ بازنطینی بادشاہ ہرقل (Haraclius) نے خلیفہ راشد دوم، حضرت عمر فاروقؓ کو ایک خط روانہ کیا۔ اس میں لکھا ''میرے سر میں اکثر درد رہتا ہے۔ براہ کرم کوئی علاج بتایئے؟''

حضرت عمر فاروقؓ نے اسے ایک ٹوپی بھیجی اور ہدایت لکھی کہ اسے ہر وقت سر پر پہنے رکھو۔ ان شاء اللہ سر درد جاتا رہے گا۔ چناں چہ قیصر روم (ہرقل) وہ ٹوپی سر پر پہننے لگا۔ کبھی اتارتا تو درد پھر شروع ہو جاتا اور پہننے کے بعد درد غائب! چند بار یہ ماجرا پیش آیا، تو قیصر روم کا تجسس اتنا بڑھا کہ آخر اس نے ٹوپی کو چیر دیا۔ اندر سے ایک رقعہ نکلا۔ دیکھا تو اس پہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا ہوا تھا۔

یہ کلمہ اسے ایک درباری کی زبانی معلوم ہوا جو عربی جانتا تھا۔ یہ بات بادشاہ قیصر روم کے دل میں گھر کر گئی۔ کہنے لگا ''دین اسلام کس قدر مکمل اور مسلمانوں کی کتاب کتنی معزز ہے کہ محض ایک آیت بھی باعثِ شفا ہے۔ پھر پورا دین باعثِ نجات کیوں کر نہ ہو گا؟ مورخین لکھتے ہیں کہ اسی بات سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، مگر اقتدار کی تمنا بعدازاں اس پر غالب آ گئی۔ (لطائف قرآن)

تلاوت کلام پاک کا جہاں اتنا بڑا اجر ہے، وہیں اس کی ایک ایک آیت، آیت شفا ہے۔ بسم اللہ پڑھنے کا

ثواب اور فوائد ان گنت ہیں۔ حضرت عمرؓ کا درج بالا واقعہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ دردِ سر دور کرنے کا مقدس نسخہ ہے۔

مسلمانوں پہ جہاں اللہ نے ہزاروں مہربانیاں فرمائی ہیں، وہیں حضور پاک ﷺ کی اُمت پر قرآن حکیم جیسی انمٹ کتاب اتار کر قیامت تک انھیں دنیا میں سرخرو فرما دیا۔

قرآن حکیم کا ایک ایک حرف نہ صرف باعث ثواب و بابرکت ہے بلکہ اس کی تلاوت بھی سکونِ دل کا باعث بنتی ہے۔ علما نے فرمایا ہے: ''اے مسلمانو! قرآن حکیم پر تمھارا یہ حق ہے کہ سال میں کم از کم دو دفعہ پڑھ کر ختم کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی تلاوت پر بھی آسانیاں بخش دی ہیں اور حکم ہے کہ ''اسے جتنا آسانی سے روز پڑھ سکتے ہو، پڑھو۔''

سبحان اللہ، کوئی زور اور کوئی سختی نہیں! قیامت کے دن مسلمانوں کے لیے قرآن حکیم کا پڑھنا بخشش کا باعث بنے گا۔ جنت میں جانے کا اس سے آسان نسخہ کیا ہو سکتا ہے؟ تب تلاوت قرآنی مسلمانوں کے گناہوں کے آگے ڈھال بن جائے گی۔ کاش ہم یہ بات ذہن نشین کر لیں۔ بزرگان میں سے کئی نے روایت کیا ہے کہ بے شمار لوگ جب ویران جگہوں پر تلاوت قرآن پاک فرماتے، تو نہ صرف مسلمان بلکہ چرند پرند بھی ہمہ تن گوش ہو جایا کرتے۔

قرآن حکیم کی سورتیں اور آیات خاص طریقہ پر پڑھنے سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ سورۂ یٰسین کی اپنی افادیت ہے۔ سورۂ واقعہ کا اپنا اثر ہے۔ سورۂ رحمٰن بھی شفایابی کے مختلف مرحلوں میں پڑھی جاتی ہے۔ کسی نے ایک صحابیؓ سے پوچھا کہ آپ کا آخری وقت ہے، آپ پیچھے گزارے کے لیے گھر میں کچھ جمع کر کے چھوڑے جا رہے ہیں؟

انھوں نے فرمایا ''بھئی حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ ہر روز سورۂ واقعہ پڑھ لیا کرو کبھی تنگی رزق نہ ہوگی۔ میرے گھر والے سورۂ واقعہ پر ایمان رکھتے ہیں اور وہی پروردگار دینے والا ہے۔ میری کیا مجال کہ اولاد کو کھلا سکوں یا ان کے لیے وفات تک کا رزق جمع کر کے چھوڑ جاؤں؟'' سبحان اللہ

قرآن پاک کی تعلیمات آشکار کرتی ہیں کہ اسلام نہ صرف مکمل دین ہے بلکہ یہ زندگی کے ہر پہلو اور معاشرتی مسائل کا احاطہ کر کے سیدھے راستے پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اپنی صحیح نشوونما اور کمال و ارتقا میں سنت نبویہ کے آب حیات کا محتاج ہے اور حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا محور بھی یہی قرآن حکیم رہا۔ اسی لیے ہم جب اپنے شب و روز اور زندگی کے اعمال کو سیرت کے مرکز حیات سے وابستہ کر دیں جو لامحالہ قرآن حکیم کی تربیت ہے، تو ہماری زندگی میں محبوبیت و رضا خداوندی کی لہریں دوڑنے لگی ہیں۔

تلاوت قرآن باعث برکت ہے۔ ایک پہاڑی علاقے میں ایک بزرگ اپنے نوجوان پوتے کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ہر روز صبح سویرے قرآن کی تلاوت کیا کرتے۔ پوتا بھی ہمیشہ ان جیسا بننے کی کوشش کرتا۔ ایک دن پوتا کہنے لگا ''دادا، میں بھی آپ کی طرح قرآن پاک پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی۔ اور جو سمجھ آئے، جیسے ہی قرآن بند کروں، بھول جاتا ہوں۔ ایسے میں قرآن پڑھنے سے ہم کیا سیکھتے ہیں؟''

دادا نے خاموشی سے کوئلوں والی ٹوکری میں سے کوئلے نکال انگیٹھی میں ڈالے۔ پھر ٹوکری پوتے کو دے کر کہا ''جا پہاڑ کے نیچے بہتی ندی سے مجھے پانی کی ٹوکری بھر کر لا دے۔''

لڑکے نے دادا کی بات پر عمل کیا۔ لیکن واپس پہنچنے تک سارا پانی ٹوکری کے سوراخوں میں سے بہ گیا۔ دادا

مسکرائے اور کہا "تم اس دفعہ اور زیادہ تیز قدم اٹھانا۔" یہ کہہ کر پوتے کو واپس بھیج دیا۔ لیکن اس بار وہ بالٹی میں پانی لے آیا۔

دادا نے کہا "مجھے بالٹی نہیں ٹوکری میں پانی چاہیے۔ تم ٹھیک سے کوشش نہیں کر رہے۔" اسے پھر نیچے بھیج کر وہ دروازے میں کھڑے دیکھنے لگے کہ پوتا کتنی سعی کرتا ہے۔ لڑکے کو علم تھا کہ سوراخوں بھری ٹوکری میں پانی بھرنا ناممکن ہے۔ بہرحال دادا کو دکھانے کے لیے ٹوکری پانی سے بھری اور انتہائی سرعت سے واپس دوڑ پڑا۔ لیکن پہنچنے تک ٹوکری میں سے پھر پانی بہ چکا تھا اور وہ خالی تھی۔

لڑکے نے کہا "دیکھا دادا جان، اس میں پانی بھرنا بے سود ہے۔"

دادا کہنے لگے "بیٹا! ٹوکری کی طرف دیکھو۔"

اب نوجوان کو پہلی بار احساس ہوا کہ ٹوکری پہلے سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ وہ پرانی اور گندی ٹوکری اندر باہر سے صاف ستھری ہو چکی تھی۔ دادا نے کہا "بیٹا! ذرا دیکھو، کوئلوں سے سیاہ ہوئی ٹوکری بار بار پانی کے دھونے سے منزہ ہو گئی۔ اسی طرح جب ہم تلاوت قرآن کریں، تو چاہے اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ پائیں، تلاوت ہمیں اندر اور باہر سے ایسے ہی پاک صاف کر دیتی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ ہماری زندگی بدل دیتا ہے۔"

قرآن پاک کی تلاوت کے آداب ہیں۔ مثال کے طور پر باوضو ہو کر انتہائی توجہ و احترام سے قبلہ رخ بیٹھیے۔ پڑھنے میں جلدی نہ کریں بلکہ ترتیل و تجوید سے پڑھنے کی پوری کوشش کیجیے۔ آیات رحمت و آیات عذاب پر اسی طرح کا ردعمل ظاہر کیجیے۔ اونچا پڑھنے سے ریا کا احتمال یا دوسرے مسلمان کی تکلیف و حرج کا اندیشہ ہو تو آہستہ پڑھیے۔ جتنا ہو سکے خوش الحانی سے پڑھنے کی سعی کریں۔

بزرگوں کا دامن

بچپن میں شیخ سعدی اپنے والد کی انگلی پکڑے ہوئے کسی میلے میں جا رہے تھے۔ راستے میں کسی جگہ بندر کا کھیل دیکھنے میں ایسے لگے کہ والد کی انگلی چھوٹ گئی۔ والد اپنے دوستوں کے ساتھ آگے نکل گئے اور سعدی تماشا دیکھتے رہے۔ کھیل ختم ہوا تو والد کو سامنے نہ پا کر بے اختیار رونے لگے۔ آخر اللہ اللہ کر کے والد بھی انہیں ڈھونڈتے ہوئے آ نکلے۔ انہوں نے سعدی کو روتا دیکھ کر ان کے سر پر ہلکا سا چپت مارا اور کہا "نادان بچے! جو بے وقوف بزرگوں کا دامن چھوڑ دیں، اسی طرح روتے ہیں۔"

سعدی کہتے ہیں کہ میں نے سوچا تو دنیا کو ایسا ہی پایا، ایک میلے کی طرح! آدمی اس میلے میں مجھ جیسے نادان بچوں کی طرح ان بزرگوں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، جو اچھے اخلاق سکھاتے اور دین کی باتیں بتاتے ہیں، تب اچانک اسے دھیان آتا ہے کہ زندگی غفلت میں گزر گئی، پھر روتا اور پچھتاتا ہے۔

(نازیہ اشرف، عارف والا)

باطنی آداب یہ ہیں...... کلام پاک کی عظمت دل میں رکھیے کہ کیسا عالی مرتبہ کلام ہے۔ اللہ حق سبحانہ و تقدس کی عالی شان اور رفعت و کبریائی کو دل میں جگہ دیجیے۔ دل کو وساوس اور خطرات سے پاک رکھیں۔ معانی پہ تدبر رکھیں اور لذت و شوق سے قرآن پڑھیں۔

یہ یاد رہے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے تلاوت کیجیے۔ حضرت ابن عباسؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپؐ کا ارشاد عالی ہے "شریف ترین مجلس وہ ہے جس میں قبلہ کی طرف منہ کر کے تلاوت قرآن کی جائے۔"

(طبرانی و ابن عدی)

بندوں کو دل کھول کر نوازنے والے

قدرت کے مخفی ہاتھ

وہ پانچ چشم دید واقعات جو اللہ تعالیٰ کی رزاقیت وکرم کے منہ بولتے ثبوت بن گئے

حبیب اشرف صبوحی

اللہ کریم کے بے شمار صفاتی ناموں میں سے ایک اسم "الرزاق" بھی ہے، یعنی رزق دینے والا! رب کائنات قرآن پاک میں جگہ جگہ فرماتے ہیں کہ اللہ رزق دینے والا ہے۔ اللہ بے حساب رزق دینے والا ہے۔ وہ جس کا چاہے رزق کشادہ کرے اور جس کا چاہے کم کر دے۔ اللہ سب سے اچھا رزق دینے والا ہے۔ دیگر رزق دینے والے خود سے کچھ دینے پہ ہرگز قادر نہیں، انھیں بھی اللہ رب العزت نے ہی یہ توفیق بخشی کہ وہ مخلوقِ خدا کی ظاہراً یا مخفی مدد کر سکیں۔

ہمارے اردگرد بھی ہزاروں واقعات ایسے بکھرے ہوئے ہیں جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی رزاقیت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ اپنے مشاہدات کی روشنی میں چند واقعات کا ذکر پیش ہے۔

ڈیرہ غازی خان کا لڑکا

میں نے ایک کمپنی میں چالیس سال ملازمت کی ہے اور حال ہی میں سبکدوش ہوا

ہوں۔ ایک روز دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک لڑکا آیا جس کی عمر انیس بیس سال کے قریب تھی۔ سلام کے بعد تعارفی کارڈ پیش کیا۔ وہ ہمارے ادارے کے جنرل منیجر کا تھا۔ کارڈ پر مجھے پیغام دیا گیا تھا ''اِس کی مدد کرو۔'' میں نے لڑکے کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پوچھا کہ تمھیں کس قسم کی مدد درکار ہے؟ اس نے کہا ''مجھے ملازمت چاہیے۔''

میں نے اسے بتایا ''میں اس حیثیت میں نہیں کہ کسی کو ملازمت پر لگا یا نکال سکوں۔ جنرل منیجر خود بڑے اختیارات کا مالک ہے۔ کراچی سے پشاور تک سارے دفاتر اس کے ماتحت ہیں۔ جب وہ تمھیں ملازمت نہیں دے سکتا تو میں کیسے دلوا سکتا ہوں؟ اس نے تمھیں ٹالنے کی کوشش کی ہے۔''

میں نے پھر اس سے پوچھا کہ تم جنرل منیجر صاحب کے پاس کس طرح پہنچے؟ اس نے بتایا ''میرا تعلق ڈیرہ غازی خاں سے ہے۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا۔ چھوٹی چار بہنیں ہیں۔ میٹرک کرنے کے بعد میں لاہور آیا اور ایک بیکری میں ملازم ہو گیا۔ رات کو بیکری ہی میں سوتا ہوں۔ کام مشکل طلب ہے۔ مگر میں مزید پڑھ رہا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل ایف اے کا امتحان دیا ہے۔ ہمارے گاؤں کا ایک ٹھیکیدار جنرل منیجر کی کوٹھی بنا رہا ہے۔ اسی کے وسیلے سے جنرل منیجر سے ملا۔ انھوں نے آپ کے پاس بھیج دیا۔''

یہ سن کر میں نے کہا ''بھائی! رزق دینے والی صرف اللہ کی ذات ہے، نہ میں ہوں اور نہ جنرل منیجر! فی الحال میں اس حیثیت میں نہیں کہ تمھیں روزگار دے سکوں۔''

اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی اور بددل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی مایوسی اور چہرے کے تاثرات دیکھ اور گھریلو حالات سن کر مجھ میں رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور پوچھا ''تم نماز پڑھتے ہو؟''

اس نے کہا کہ کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر تم رزق پانے اور اپنے مسائل کا حل چاہتے ہو تو آج سے نماز شروع کر دو۔ ایک چھوٹا سا وظیفہ بھی بتایا اور کہا کہ پندرہ روز بعد آنا۔ ان شاء اللہ رب کریم کوئی سبیل نکال دے گا۔

جب وہ چلا گیا تو میں سوچنے لگا کہ پندرہ روز بعد میں اسے کہاں سے روزگار دلواؤں گا؟ اس کی زیادہ تعلیم ہے اور نہ کوئی تجربہ، جسمانی طور پر بھی کمزور ہے۔ یہ حالات مدنظر رکھتے ہوئے میں دعا کرتا رہا کہ اسے بہتر رزق مل جائے۔ چند روز بعد مجھے جنرل منیجر کا خط ملا کہ ادارہ آپ کے دفتر میں ٹیلی فون ایکسچینج لگا رہا ہے۔ اس کے لیے جگہ، فرنیچر وغیرہ کا انتظام کر کے فوری طور پر مطلع کیجیے تاکہ کام شروع کیا جائے۔

میں نے تمام سامان کا انتظام کر کے جنرل منیجر کو لکھ دیا ''ہم نے مطلوبہ اشیا خرید لی ہیں۔ اب ٹیلی فون ایکسچینج چلانے کے لیے ایک آپریٹر (Operator) کی ضرورت ہے۔ اس کا بھی بندوبست ہو چکا۔ اس کے تقرر کی اجازت مرحمت فرمائیے۔'' چند روز بعد اس کی منظوری آ گئی۔

جب وہ لڑکا آیا تو میں نے کہا کہ تمھاری نوکری کا انتظام ہو چکا۔ تم نے ٹیلی فون آپریٹر بننا ہے۔ جو لوگ ایکسچینج لگانے آئیں گے، تم ان سے کام سیکھ لینا۔ آسان کام تھا۔ اس نے چند ہی روز میں کام سیکھ لیا اور مستعدی سے اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا۔

میں نے اس سے کہا ''دیکھو تم نے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور رب تعالیٰ نے تمھارے رزق کا انتظام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو تاکہ تمھارے رزق میں مزید

اضافہ ہو سکے۔" اس نے میری بات پر عمل کیا اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ کئی ماہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک رات اتفاقاً بجلی ضرورت سے زیادہ آئی، تو ٹیلی فون ایکسچینج ہائی وولٹ کے باعث جل گیا۔ اسے ٹھیک کرنے کی خاطر ہزارہا روپے درکار تھے۔ کچھ دفتری مسائل کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ یوں اس لڑکے کا روزگار جاتا رہا۔

اس دوران وہ ایف۔اے پاس کر چکا تھا۔ میں نے ساتھی آفیسر کو کہہ کر اُسے اس کے شعبے میں بھرتی کرا دیا۔ لڑکا وہاں محنت سے کام کرتا رہا اور بی۔اے کر لیا۔ اس واقعہ کا دلخراش پہلو یہ ہے کہ یہ لڑکا چار سال بعد کسی کام کے سلسلے میں جنرل منیجر کے پاس گیا۔ اس نے پرانے ٹھیکیدار کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا "آپ نے اپنا تعارفی کارڈ مجھے حبیب صاحب کے نام دیا تھا۔ انھوں نے مجھے روزگار دلوا دیا۔ میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور ملازمت بھی کرتا رہا۔ اب میں ایم۔اے کر رہا ہوں۔ آپ کے تعاون پہ شکرگزار ہوں۔ ایک مہربانی اور کریں کہ مجھے مستقل کر دیں تاکہ میرا مستقبل محفوظ ہو جائے۔"

جنرل منیجر نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ جب تم ڈیلی ویجز پر ملازم ہوئے تو تم نے کتنے روپے دیے؟"

لڑکے نے کہا "میں نے کسی کو ایک پیسا بھی نہیں دیا۔"

انھوں نے کہا "کمپنی میں ڈیلی ویجز پر ملازم کرانے کا معاوضہ ۵۰ ہزار روپے ہے۔ اگر کسی نے نہیں لیے تو یہ روپے مجھے لا کر دو ورنہ میں تمھیں نوکری سے نکال دوں گا۔"

یہ سن کر لڑکا قدرتاً پریشان ہو گیا۔ میرے پاس آ کر رونے لگا کہ اب کیا ہو گا؟ میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟

میں نے کہا "تمھیں ان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے کرپٹ کردار سے سب لوگ واقف ہیں۔ اب تم انھیں جا کر بتاؤ، میں نے ایک جگہ کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ اب ان سے درخواست کی ہے کہ پہلے مجھے دے دیں۔ لہٰذا دو ماہ بعد کمیٹی مل جائے گی۔ تب میں آپ کو پیسے دوں گا۔"

چناں چہ وہ جنرل منیجر کے پاس گیا اور دو مہینے بعد ۵۰ ہزار روپے دینے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ ڈیڑھ ماہ بعد ہی ادارے نے اچانک جنرل منیجر کو زبردستی ریٹائر کر دیا۔ یوں اس کی جان بخشی ہو گئی۔ وہ لڑکا ماشاءاللہ ایم۔اے کر گیا۔ شادی ہو گئی، بال بچے دار ہوا۔ اب اللہ کے فضل سے خوش حال زندگی گزار رہا ہے۔

سودے سلف والا اخبار

میرے بڑے بھائی انجینئر ہیں۔ عرصہ دراز پہلے لاہور میں ایک انجینئرنگ کمپنی میں کام کرتے تھے۔ اس کمپنی کے حالات اچانک خراب ہو گئے۔ وہ اپنے ملازمین فارغ کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر بھائی نئی ملازمت پانے کے لیے کوششیں کرنے لگے۔ ایک روز میں بازار سے کچھ سودا خرید کر لایا۔ دکاندار نے ایک انگریزی اخبار میں لپیٹ کر سودا دیا تھا۔ گھر آ کر سامان کھولا اور اخبار حسب معمول پھینک دیا۔

اتفاق سے میری نظر ایک اشتہار پر پڑی۔ معلوم ہوا، کراچی کی ایک کمپنی کو نیا جنرل منیجر درکار ہے۔ جب میں نے اشتہار پڑھا، تو عہدے کے لیے درکار تعلیم اور تجربہ بھائی صاحب رکھتے تھے۔ میں نے اخبار انھیں دکھایا، تو وہ خوش ہوئے۔ انھوں نے فوراً درخواست ملازمت وہاں بھیج دی۔ خدا کی شان دیکھیے، انھیں وہ ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں سے بطور منیجنگ ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔

اور ملازمت مل گئی

میں بسلسلہ خریداری کیمیکل فروخت کرنے والی ایک دکان میں جاتا تھا۔ وہاں کا سیلز مین باصلاحیت لڑکا تھا۔ بڑی محبت سے پیش آتا۔ اسے اپنے کام پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ مجھے سات سال سے ملازمت کر رہا تھا اور ساتھ ہی پڑھائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ ایک دن اس نے بتایا کہ وہ دوران ملازمت بی۔اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کر چکا۔ لیکن سفارش نہ ہونے کی وجہ سے اسے کسی اچھی جگہ روزگار نہیں مل رہا۔ اس کی تمنا تھی کہ میں اپنی کمپنی میں کوئی جگہ تلاش کروں۔

میں نے اسے بتایا، ہماری کمپنی میں سفارش چلتی ہے۔ اور میں اس پوزیشن میں نہیں کہ تمھاری سفارش کر سکوں۔ بہرحال تم ایک درخواست دو، میں اسے آگے پہنچا دوں گا۔ چناں چہ اس نے مجھے درخواست دے دی۔ ایک دن مناسب موقع دیکھتے ہوئے اس لڑکے کی درخواست اپنے جنرل منیجر کو دی اور سفارش بھی کر ڈالی۔

اتفاق سے لڑکے کا تعلق راجن پور سے تھا۔ ہمارے جنرل منیجر بھی اسی علاقے کے تھے۔ وہ لڑکا کسی حوالے سے ان کا جاننے والا بھی نکل آیا۔ انھوں نے اس کے لیے کوشش کی اور روزگار کی صورت نکل آئی۔ وہ کئی سال اچھے عہدے پر فائز رہنے کے بعد حال ہی میں ریٹائر ہوا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بعد وہ میرا اور جنرل منیجر کا شکر گزار رہے گا۔

اللہ کا کرم

ہمارے مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی تعمیر ہو رہی تھی۔ میرے ذمے وہاں ضروری سامان پہنچانا تھا۔ اس مقصد کے لیے مجھے دو پک اپ گاڑیاں دی گئیں۔ صبح ایم۔ڈی مجھے پیسے وغیرہ دیتے، میں شام کو حساب کر کے باقی رقم حوالے کر دیتا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے دو ڈرائیور ڈیلی ویجز پر گزشتہ پانچ سال سے ملازم تھے۔ ان کی ملازمت مستقل ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ایک روز وہ ڈرائیور کہنے لگے "آپ ایم۔ڈی سے روز ملتے ہیں۔ کبھی ہمارے مستقبل کے بارے میں بھی بات کر لیں۔ اگر ہمیں مستقل ملازمت مل جائے تو مہربانی ہوگی۔"

میں نے کہا "مناسب موقع دیکھ کر بات کروں گا۔"

ایک روز شام کو ایم۔ڈی کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ان کا موڈ اچھا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان ڈرائیوروں کے متعلق بات کی اور بتایا "یہ لوگ گزشتہ پانچ سال سے ڈیلی ویجز پر کام کر رہے ہیں۔ اگلے ماہ ایڈمن منیجر نے ڈرائیوروں کو انٹرویو کے لیے بلایا ہے لیکن انھیں بلاوا نہیں ملا۔ ان کا حق پہلے بنتا ہے۔" انھوں نے اسی وقت ڈرائیوروں کو بلایا اور ان سے کچھ سوالات پوچھے۔ پھر مجھے کہا "ان دونوں کو صبح لے کر میرے دفتر آ جائیے۔ میں معاملے کی تحقیق کرتا ہوں۔"

دوسرے روز میں ان لوگوں کو لیے ایم۔ڈی کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے فوری طور پر ایڈمن منیجر کو بلایا اور ان سے کہا "آپ نے ان لوگوں کو انٹرویو پر کیوں نہیں بلایا؟ ان کا حق پہلے ہے۔"

وہ بولے "ہمارے پاس وزیروں اور دیگر بڑے لوگوں کی سفارشیں آ جاتی ہیں، ہم مجبور ہیں۔"

ایم ڈی نے کہا "ان لوگوں سے میں بات کر لوں گا۔ جتنے لوگ ڈیلی ویجز پر کام کر رہے ہیں، پہلا حق ان کا ہے۔ انھیں انٹرویو کال لیٹر فوری طور پر جاری کیجیے اور میرٹ پر فیصلہ دیجیے۔"

کچھ عرصہ بعد وہ دونوں مستقل ہو گئے۔ یوں ان کا

مستقبل روشن ہو گیا۔ چند ماہ قبل ان ڈرائیوروں میں سے ایک ڈرائیور، بابا رحمت مجھے ملا۔ اس نے بتایا "سر ہم تو مستقل ہوئے ہی تھے، ہماری اولادیں بھی کمپنی میں ملازمت کر رہی ہیں اور انھیں بھی پکی نوکری مل چکی۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے اور اس کی "رزاقیت" کا منہ بولتا ثبوت۔"

نماز کی پابندی

ملازمت کے دوران میں کافی عرصہ ایبٹ آباد بھی تعینات رہا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد جب گھر آتا تو راستے میں ایک دکان سے مٹھائی لیتا۔ دکاندار بڑا بااخلاق تھا۔ میری اس سے دوستی ہو گئی۔ اس کے دو چار چھوٹے موٹے کام بھی کیے، تو وہ میرا معتقد ہو گیا۔ ایک روز شام کو اس کا فون آیا "آپ سے کل بہت ضروری کام ہے۔ یہ ہر صورت کرنا ہے۔ میری عزت کا سوال ہے۔"

میں نے سوچا، شاید پیسوں وغیرہ کی ضرورت ہو گی۔ لیکن جب وہ دوسرے روز میرے دفتر آیا تو اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ اس نے بتایا "یہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کے پاس دو ٹیکسیاں تھیں۔ یہ مالی طور پر بڑا مستحکم تھا لیکن بوجوہ اس کے مالی حالات خراب ہو گئے۔ اب اسے اپنے محکمے میں ڈرائیور کی ملازمت دلوا دیں۔" یہ کہہ کر وہ دفتر سے باہر چلا گیا۔ بڑی مشکل سے اسے واپس بلوایا اور بتایا "رزق دینے والی صرف اللہ کی ذات ہے، میں نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کا رزق کہیں اور لکھا ہو۔"

بہرحال میں نے لڑکے سے کہا کہ ایک ہفتے بعد آؤ۔ لیکن اس دوران نماز کی پابندی کرنا، اللہ بہتر کرے گا۔ اتفاق سے ہفتے بعد ایک گڈز ٹرانسپورٹر کسی سرکاری کام سے میرے پاس آیا۔ اس کی ٹرانسپورٹ کمپنی سے ہم کراچی تا پشاور مال منگوایا اور بھیجا کرتے تھے۔ کافی دیر وہ میرے پاس بیٹھا رہا۔ جب جانے لگا تو کہنے لگا "کوئی خدمت بتائیے؟" میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ جب وہ اُٹھا تو مجھے اس لڑکے کا خیال آ گیا۔

میں نے ٹرانسپورٹر سے پوچھا کہ کیا ایک لڑکے کو ڈرائیوری کی ملازمت مل سکتی ہے؟ اُس نے فوری طور پر وزیٹنگ کارڈ پر اپنے منیجر کو لکھا کہ اس آدمی کو بطور ڈرائیور رکھ لیا جائے۔ شام کو میں یہ کارڈ لیے مٹھائی والے کی دکان پہ پہنچ گیا۔ دکاندار سے کہا کہ تمھارے بھائی کے لیے ملازمت کا انتظام ہو چکا۔

دکاندار نے بتایا "اللہ تعالیٰ پہلے ہی اس پر فضل کر چکے۔ دو روز قبل کچھ لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور کہا کہ ہمیں پتا چلا ہے، تمھیں پہاڑی علاقوں میں گاڑی چلانے کا تجربہ ہے۔ ہم تمھیں ڈرائیور رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے ملازم تھے۔ اس طرح اسے گھر بیٹھے ملازمت مل گئی۔ اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔"

رب کائنات پر پختہ یقین

۱۹۹۳ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو اس نے ہماری کمپنی میں ۶۰۰ کے قریب اپنے آدمی بھیج دیے۔ نتیجے میں ہمیں ڈیلی ویجز پہ کام کرنے والے تمام لوگوں کو فارغ کرنا پڑا۔ میرے پاس بھی ڈیلی ویجز پہ چھے چوکیدار کام کرتے تھے۔ وہ کئی برس سے یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ مستقل ہو جائیں گے لیکن انھیں فارغ ہونا پڑا۔ ان چوکیداروں میں سے ایک چوکیدار، چاچا عزیز کی عمر ۵۵ سال تھی۔ اس کی نوکری جانے پر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اسے بلا کر میں نے کہا "چاچا! مجھے آپ کی ملازمت ختم ہونے پر بڑا افسوس ہوا۔ اب آپ کیا کریں گے؟"

چاچا عزیز بڑے پُرسکون میں بولا "سر! مجھے نہ کوئی افسوس ہے نہ کوئی فکر کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ ہے۔ جہاں وہ رحیم و کریم ہے، وہیں "رزاق" بھی ہے۔ بعض چیزیں اس نے اپنے اختیار میں لے رکھی ہیں جیسے رزق کا معاملہ! وہ خود میرے رزق کا انتظام کرے گا۔ میں ۵۵ سال سے کبھی بھوکا نہیں سویا۔ اللہ مالک ہے۔"

چند روز بعد سینئر جنرل منیجر ہمارے دفتر کا معائنہ کرنے آئے۔ ہمارا اسٹور ایک خالی پلاٹ میں واقع اور بہت بڑی جگہ گھیرے ہوئے تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہاں کتنے چوکیدار ہوتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ ۸ گھنٹے کے بعد شفٹ تبدیل ہو جاتی ہیں۔ گویا ۲۴ گھنٹے میں تین چوکیدار ہوتے ہیں۔ کہنے لگے، رات کو کتنے چوکیدار ہوتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ ایک چوکیدار! بولے "رات کو دو چوکیداروں کا انتظام کیجیے۔ ایک چوکیدار آگے ہو اور دوسرا پیچھے! سیکیورٹی کے لحاظ سے رات کو دو چوکیداروں کا ہونا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "پہلے ہم ڈیلی ویجز پر چوکیدار رکھ لیتے تھے۔ لیکن اب ہم اس انداز میں کوئی چوکیدار اور چپراسی نہیں رکھ سکتے کیونکہ نئی حکومت نے ہر جگہ اپنے آدمی بھیج دیے ہیں۔

کہنے لگے "آپ چوکیدار کے بارے میں لکھ کر بھیجیے۔ ڈیلی ویجز پہ اس کی منظوری ایم۔ڈی سے لے کر میں بھجوا دوں گا۔ یہ سیکیورٹی رسک ہے۔ آپ فوری طور پر ایک چوکیدار کا انتظام کیجیے۔"

چناں چہ میں نے چاچا عزیز کو فوراً بلوایا اور کہا کہ اپنی ڈیوٹی سنبھالو، اللہ تعالیٰ نے تمھاری سن لی۔ یوں ربِ کائنات پہ پختہ یقین رزق فراہم کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

◆◆◆

صُبح

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مسلمان کا زوال

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر، تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے، تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں

آزادیِ شمشیر کے اعلان پر

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار

(علامہ محمد اقبالؒ)

شرک کے اندھیروں سے توحید کی روشنی تک

قبول اسلام کے روح پرور اور ایمان افروز واقعات

پروفیسر ڈاکٹر انوار الحق

یہ ۱۹۸۷ء کا واقعہ ہے، میں آغا خان یونیورسٹی اسپتال، کراچی چھوڑنے کے بعد کنگ فیصل یونیورسٹی، دمام (سعودی عرب) سے منسلک ہوگیا۔ ۱۹۹۶ء تک وہاں تدریس اور شعبہ امراضیات (پیتھالوجی ڈیپارٹمنٹ) میں تشخیص امراض کے فرائض انجام دیتا رہا۔ کنگ فیصل یونیورسٹی یعنی جامعۃ الملک فیصل کے ساتھ الخبر کا تدریسی اسپتال واقع تھا۔ وہاں ہم مریضوں کے علاج معالجے اور دیکھ بھال کی ذمے داری سنبھالتے۔

میری رہائش الخبر میں تھی۔ ہمارے قیام کے دوران ہی خلیجی جنگ وقوع پذیر ہوئی اور پہلی بار امریکی فوجی الخبر اور دہران کی سڑکوں پر نظر آئے۔ سعودی عرب میں دوران قیام مساجد میں کئی مرتبہ قبول اسلام

کے مناظر دیکھے۔ دعوتِ اسلام کے تحت نومسلموں کی تربیت کے پروگرام بھی ہوتے۔ بعض واقعات ایسے ہیں جو دل پر نقش ہو گئے اور انھیں قارئین اردو ڈائجسٹ کی نذر کرنا ضروری جانا۔

ہمارے اسپتال میں آئرلینڈ کی ایک نرس کام کرتی تھی۔ اس کی والدہ بھی نرس تھی۔ وہی بیٹی کو سعودی عرب لائی تھی تاکہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ مریضوں کو عیسائیت کی طرف بھی مائل کیا جائے۔ ماں نے بیٹی کو قرآن پاک کی ایک کاپی دی اور کہا ''بیٹی اسے پڑھو اور اس میں سے غلطیاں نکالو تاکہ ہم مسلمانوں سے بحث کے دوران انھیں برت سکیں۔''

بیٹی ترجمے والا قرآن مجید پڑھنے لگی۔ وہ غلطیاں نکالنے کی سرتوڑ کوشش کرتی رہی لیکن جوں جوں اس نے قرآن پڑھا، آئرش دوشیزہ کے دل کا اندھیرا روشنی میں بدلنا شروع ہو گیا۔ اب اسے راہِ حق صاف نظر آنے لگی۔ ابھی کچھ پارے ہی پڑھے تھے کہ وہ بے چین ہو گئی اور جلد ہی علی الاعلان اسلام قبول کر لیا۔ کچھ عرصے بعد دیگر خواتین کے ساتھ وہ حج کرنے گئی۔ مکہ معظمہ میں ہمارے ہی اسپتال کے ایک نیوروسرجن کی والدہ نے جو مصر سے حج کرنے آئی تھیں، اسے پسند کیا اور اس کو اپنی بہو بنا لیا۔ جب میں صبح اسپتال جاتا تو ان کے دو ننھے منے بچے کھڑکی میں بیٹھے نظر آتے۔

نظریہ شکست کا توڑ

ہماری یونیورسٹی میں امریکا سے تربیت یافتہ ایک مردانہ نرس ملازم ہوا۔ اس کا ماجرا اللہ تعالیٰ کی شان عیاں کرتا ہے۔ وہ بپٹسٹ (Baptist) چرچ کا نائب صدر بھی رہ چکا تھا۔ اس کا نام Moses (موسیٰ) تھا۔ ایک دن وہ میرے سری لنکن مسلمان دوست، ضیا عبدالقادر سے اسلام پر مباحثہ کرنے لگا۔ ضیا نے کہا کہ میں اتنا بڑا عالم نہیں کہ تمھاری ہر بات کا جواب دے سکوں۔ البتہ میں تمھیں قرآن مجید دیتا ہوں۔ تم اسے پڑھ کر دیکھو، ہو سکتا ہے اس میں تمھیں اپنے سوالوں کے جواب مل جائیں۔

موسیٰ نے وہ نسخہ لے لیا۔ تین چار دن بعد ضیا سے ملا اور کہا ''مجھے تمام سوالات اور ابہامات کے جوابات اس کتاب میں مل چکے۔'' یہ کہہ کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ بعدازاں اس امریکی نے بتایا ''ساری عمر مجھے عیسائیت کا نظریہ تثلیث تنگ کرتا رہا اور کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن الحمدللہ قرآن مجید نے وہ روشنی دکھائی کہ تمام شکوک و شبہات ختم ہو گئے۔ میں نے پھر شرک کے اندھیروں سے توحید کی روشنی میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔'' امریکی نومسلم کا نام پہلے ہی اسلامی تھا، لہٰذا اسے برقرار رکھا گیا۔

دہران میں امریکی نومسلم

ایک مرتبہ ہم نمازِ جمعہ پڑھ رہے تھے۔ امام کے سلام پھیرتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ دو گورے اور دو کالے، لمبے تڑنگے امریکی فوجی وردی میں ملبوس ایک سعودی کی معیت میں اندر داخل ہوئے۔ امام صاحب کے ہاتھوں کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پڑھ کر وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ امریکی فوج کے کئی ہزار افراد پہلی مرتبہ سعودی عرب آ کر اسلام سے متعارف ہوئے۔ ان میں سے کئی مرد و زن نے قرآن مجید کا مطالعہ کر کے علی الاعلان اسلام قبول کیا۔

ایک مرتبہ جب دہران میں ہم نمازِ جمعہ پڑھ کے نکلے تو دیکھا، ایک بس میں بہت سے امریکی مرد اور عورتیں بھی نماز ادا کرنے آئے ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ اس مسجد میں خواتین کے لیے علیحدہ نماز ادا

کرنے کا انتہائی معقول انتظام تھا۔ مسجد کے امام امریکا سے طبیعات میں پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے۔ وہ امام ہونے کے علاوہ یونیورسٹی میں مقامی پروفیسر بھی تھے۔ نماز کے بعد اپنے خطبے کا انگریزی زبان میں ترجمہ سناتے۔ ہم لوگ ان امریکیوں سے ملے۔ وہ سب ڈاکٹر، انجینئر یا نرس وغیرہ تھے۔ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور اب بس میں عمرہ کرنے جا رہے تھے۔

کاش دو سال پہلے کتاب مل جاتی

ایک مرتبہ ہمارے اسپتال کے آڈیٹوریم میں ایک نومسلم امریکی فوجی کی تقریر ہوئی۔ وہ فوج سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا لیکن بسلسلہ خلیجی جنگ اسے پھر بلا لیا گیا۔ آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ غالباً میجر تھا۔ سرخ و سپید رنگ اور سفید ڈاڑھی! اس نے بتایا کہ ایک سعودی دکان والے نے اسے ترجمہ والا قرآن مجید بطور تحفہ دے دیا۔ وہ گھر پر قرآن مجید کا مطالعہ کرنے لگا۔ کچھ ہی روز گزرے تھے کہ اسے یقین ہو گیا، یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ صمیمِ قلب کے ساتھ پوری طرح اسلام میں داخل ہو گیا۔ آخر میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ڈاڑھی بھگونے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا ''کاش یہ کتاب ۲ سال پہلے مجھے مل جاتی، تو میری بیوی بھی مسلمان کی حیثیت سے مرتی۔''

مرتد شوہر کو چھوڑ دیا

اسی طرح ایک نومسلم امریکی سے محفل قرآن میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ نوجوان اور اس کے سارے بہن بھائی یہودیت ترک کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے جب کہ والدین کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ایک بہن نے بعد ازاں کسی بنگالی مسلمان سے شادی کی اور امریکا کی پر تعیش زندگی ترک کر کے بنگلہ دیش منتقل ہو گئی۔ وہاں بدقسمتی سے اس کا شوہر مادہ پرستی اور بدعات میں مبتلا ہو گیا۔ اس پر خاتون نے اسے روکا اور کہا ''میں نے تم سے مسلمان ہونے کے باعث شادی کی ہے۔ اگر تم شرک سے باز نہ آئے تو میں تمھاری بیوی نہیں رہ سکتی۔'' جب شوہر اپنی روش سے باز نہ آیا تو اس نومسلمہ نے طلاق لے لی اور اسلام پر اسی طرح سختی سے کاربند رہی۔

قیدیوں کی کایا پلٹ

اس موقع پر مجھے ایک امریکی، جان سلون یاد آ رہا ہے۔ کنساس سٹی میں پہلے اس کی بیوی مسلمان ہوئی۔ بیوی میں نہایت ہی مثبت تبدیلیاں پیدا ہوتے دیکھ کر وہ خود اسلام کا مطالعہ کرنے لگا۔ کچھ ہی عرصے میں نورِ اسلام نے اس کا سینہ روشن کر دیا۔ دونوں نے اپنی بیش قیمت ملازمتیں ترک کیں، انڈیاناپولس پہنچے اور وہاں ISNA (اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا) کے ساتھ مل کر دعوت دین میں جڑ گئے۔ دونوں کی آمدنی بے حد کم ہو گئی لیکن انھوں نے قطعاً پروا نہ کی۔

انھوں نے خاص طور پر جیلوں میں مقید مسلمان قیدیوں پر توجہ دی اور انھیں حقیقی اسلامی طرزِ حیات سے روشناس کرایا۔ ساتھ ہی جیلوں میں مسلمانوں کو اسلامی طرزِ زندگی گزارنے کی سہولیات فراہم کرنے کے لحاظ سے سخت جدوجہد کی۔ اسلامی طرزِ حیات پر گامزن ہونے سے قیدیوں کی کایا پلٹ گئی۔ جیلوں میں لڑائی جھگڑے بے انتہا کم ہو گئے جس سے جیل حکام بھی بہت متاثر ہوئے۔

اسی طرح شکاگو میں رہنے والے امیر علی کو میں کبھی

نہیں بھلا سکتا۔ ان کی کاوشوں کے باعث کئی امریکی نوجوان حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ میں خود ان میں سے کچھ جوانوں کو ملا۔ انھوں نے بتایا "اسلام نے ہماری بری عادات مثلاً نشہ وغیرہ چھڑا دیا۔ پہلے وہ والدین اور اپنے دادا، دادی، نانا، نانی کا بالکل خیال نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر بزرگوں کا بے حد خیال رکھنے والے بن چکے۔"

امیر علی مرحوم نے جہاں اسلام کا نور پھیلایا، وہیں اسلام اور مسلمانوں پر لگائے جانے والے بے بنیاد الزامات کا پردہ بھی چاک کیا۔ نائن الیون سے پہلے بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ ہوا تھا جس کا الزام بے گناہ مسلمانوں پر عائد کیا گیا۔ امیر علی نے تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ حملہ اسرائیلی موساد کی ایجنٹ، جوزی ہداس نے کرایا تھا۔

مغرب میں اسلام کی مدافعت

طالبان کی قید میں رہنے والی مریم ریڈلے کو کون فراموش کر سکتا ہے؟ دوسرے نومسلموں کی طرح قرآن مجید نے اس کا دل بھی فتح کر لیا۔ ؎

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

مریم ریڈلے ایمان لانے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت کرنے والی طاقتور خاتون بن کر سامنے آئی۔

امریکی رکن کانگریس مین، پال فنڈلے کا ذکر خیر بھی ہونا چاہیے؟ وہ بتاتے ہیں، زمانہ اسکول میں کسی "رضاکار" مسلم دشمن استاد نے جماعت میں سبھی بچوں کے اذہان میں اسلام کا انتہائی گھناؤنا تصور پیدا کر دیا۔ یہ تصور ساری زندگی ان کے ساتھ رہا تا آنکہ ایک حادثاتی واقعے میں انھیں یمن جانا پڑا۔ وہاں مسلمانوں کا طرز حیات دیکھ کر رفتہ رفتہ اسلام کے بارے میں پھیلایا جانے والا زہر زائل ہونا شروع ہوا۔ پال فنڈلے کی بیسٹ سیلر کتاب "انھوں نے بولنے کی جرأت کی" (They dare to speak out) میں اس واقعے کی تفصیل موجود ہے۔

پال فنڈلے اس بات کے شاکی ہیں کہ امریکا میں رہنے والے مسلمان چادر تان کر کیوں سوئے ہوئے ہیں، وہ امریکیوں کو اسلام کے بارے میں نہیں بتاتے؟ انھوں نے اپنی ایک اور کتاب میں اپنے علاقے، اسپرنگ فیلڈ، الینائے (Spring field, Illinois) میں بسنے والے مسلمانوں کے نام بھی درج کیے۔ ان مسلمانوں کو پچھلی کئی دہائیوں میں اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ اپنے رکن اسمبلی سے ملتے اور اسے اسلام کے بارے میں بتاتے!

ایک بار فلوریڈا میں بچوں کی ماہر امراض مسلمان ڈاکٹر عطیہ نے خیراتی اسپتال کھولا اور اس میں اہم لوگوں کو مدعو کیا۔ رسمی تقاریر کے بعد پال فنڈلے نے ڈاکٹر عطیہ سے سوال کیا "بیٹی! یہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔ لیکن آپ نے حاضرین کو اسلام سے متعارف کیوں نہیں کرایا؟" خود پال فنڈلے نے اپنی ایک کتاب میں قرآن مجید سے کئی آیات کا حوالہ دیا اور یہ بتایا ہے کہ اسلام اور دیگر آفاقی مذاہب میں کتنی مماثلت ہے۔

مسلمانو! وقت ہاتھ سے نکلے جا رہا ہے۔ مسلمانوں کی غفلت بدگمانیوں کا سبب بن رہی ہے جس کی قیمت پورا عالم اسلام چکا رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اپنی کھال میں مست رہنے کے بجائے جدید ترین ذرائع مثلاً انٹرنیٹ، فیس بک، ٹوئیٹر سے اسلام کا نور پھیلائیں تا کہ دنیا میں افراتفری اور جنگ وجدل کا خاتمہ ہو سکے۔ ◆◆◆

تاریکی میں مثلِ مشعل

جن سے ملے روشنی

معرکہ خیر و شر میں بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کرنے والے بیش قیمت واقعات

آباد شاہ پوری

امیر المومنین عمر بن الخطابؓ نے چار سو دینار اپنے غلام کو دیے اور فرمایا: ''جاؤ، یہ ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو دے آؤ۔ کچھ دیر ان کے ہاں ٹھہرنا اور دیکھنا ابوعبیدہؓ اس رقم کا کیا کرتے ہیں۔''

غلام ابوعبیدہؓ کے گھر گیا۔ وہ موجود تھے۔ غلام نے رقم دی اور کہا: ''امیر المومنین نے بھیجی ہے تاکہ آپ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔''

ابوعبیدہؓ نے رقم لے لی اور کہا ''اللہ عمرؓ پر رحم کرے اور انھیں اپنی نعمتوں سے نوازے۔'' پھر اپنی لونڈی کو بلایا اور کہا ''جاؤ یہ سات دینار فلاں شخص کے ہاں دے آؤ، پانچ دینار فلاں کے ہاں اور دس فلاں کو....'' اس طرح انھوں نے سارے دینار اسی وقت تقسیم کر دیے۔

غلام نے واپس آ کر سارا قصہ حضرت عمرؓ سے بیان کیا۔ عمرؓ نے اتنے ہی دینار اور دیے اور غلام سے فرمایا ''جاؤ یہ معاذ بن جبلؓ کو دے آؤ اور ہاں، دیکھنا وہ کیا کرتے ہیں۔''

غلام حضرت معاذ بن جبلؓ کے ہاں پہنچا، رقم دی اور وہی بات کہی جو ابوعبیدہؓ سے کہی تھی۔ حضرت معاذؓ نے دینار لے لیے اور ابوعبیدہؓ کی طرح وہیں کھڑے کھڑے سب کے سب حاجت مندوں کو بھجوا دیے۔

غلام نے حضرت عمرؓ کو ساری سرگزشت آ سنائی۔ آپؓ خاموش سنتے رہے۔ آپؓ کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک رہا تھا۔ سُن چکے تو فرمایا: ''یہ لوگ

ایک دوسرے کے (دینی) بھائی ہیں اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔"

ایثار کے پیکر

مغرب کی نماز ہو چکی۔ کچھ نمازی رخصت ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مسجد میں تشریف فرما ہیں کہ ایک شخص بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا۔ پراگندہ مُو، خستہ حال، چہرے پر زندگی کی سختیوں کے نقوش۔ عرض کرتا ہے "یا رسول اللہ، میں مفلس اور مصیبت زدہ ہوں....'' وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے مگر شاید زبان ساتھ نہیں دیتی۔ مسجد میں پھیلی ہوئی خاموشی اور گمبھیر ہو جاتی ہے۔

حضور ﷺ چند لمحے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہیں۔ پھر ایک شخص سے فرماتے ہیں "ہمارے ہاں جاؤ اور اس مہمان کے لیے کھانا لے آؤ۔"

وہ خالی ہاتھ واپس آتا اور زوجۂ محترمہ کا پیغام دیتا ہے: ''اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا' میرے پاس اس وقت پانی کے سوا کچھ نہیں۔"

مسافر پیغام سُن کر دم بخود رہ جاتا ہے۔ وہ جس بابرکت ہستی کے پاس اپنے افلاس کا رونا لے کر آیا ہے، خود ان کے گھر کا یہ حال ہے! حضورؐ پیغام سُن کر دوسری زوجۂ مطہرہؓ کے پاس بھیجتے ہیں، مگر وہاں سے بھی یہی جواب ملتا ہے۔ ایک ایک کر کے سب ازواجِ مطہرات سے پچھواتے ہیں، لیکن سب کا جواب یہی ہے: ''اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق دے کر مبعوث فرمایا' ہمارے پاس سوائے پانی کے اور کچھ نہیں۔"

نووارد کی حالت دیدنی ہے۔ وہ افلاس اور فاقہ کشی سے بھاگ کر اس پاک ہستی کے دامن میں پناہ لینے آیا تھا جو تنگ دستوں اور محتاجوں کا ملجا و ماویٰ ہے، تاجدارِ دو عالم ہے، جس کے اشارے پر دنیا بھر کے خزانے قدموں پر ڈھیر ہو سکتے ہیں۔ ایسی عظیم اور مقدس ہستی کے ہاں بھی بس اللہ کا نام ہے۔

اسے اپنے گھر کا خیال آ گیا۔ وہاں اتنی احتیاج تو نہ تھی۔ جب اس نے گھر چھوڑا تھا اس وقت بھی تین دن کی خوراک موجود تھی۔ پھر ایک بکری بھی اس کے پاس تھی جس کا دودھ زیادہ نہ سہی، بچے کے لیے تو کافی رہتا تھا۔ وہ تو اس خیال سے حاضر ہوا تھا کہ حضورؐ کے آگے دامنِ احتیاج پھیلائے گا۔ وہ جن کا جُود و کرم ہوا سے بھی زیادہ بے پایاں ہے' ان کے فیضِ کرم سے کٹھن زندگی آسان ہو جائے گی، لیکن یہاں تو عالم ہی اور ہے۔

اسے اپنے وجود پر شرم آنے لگی۔ ندامت کے قطروں سے پیشانی بھیگ گئی۔ اچانک اسے آقائے دوسَرا کی آواز سنائی دیتی ہے۔ حضورؐ فرما رہے ہیں: ''آج کی رات اس شخص کی میزبانی کون کرے گا؟"

ابو طلحہ انصاریؓ اُٹھ کر عرض کرتے ہیں:

''اے اللہ کے رسولؐ میرا گھر حاضر ہے۔'' پھر اس شخص کو ساتھ لے کر گھر آتے ہیں۔ بیوی اُمِ سلیم سے پوچھتے ہیں "کھانے کو کچھ ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مہمان ساتھ آئے ہیں۔"

نیک بخت کہتی ہیں: ''میرے پاس تو بچوں کے کھانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

ابوطلحہؓ کہتے ہیں' بچوں کو سلا دو اور کھانا دستر خوان پر چُن کر چراغ گُل کر دو۔ ہم مہمان کے ساتھ بیٹھے یونہی دکھاوے کو منہ چلاتے رہیں گے اور وہ پیٹ بھر کر کھا لے گا۔"

اُمِ سُلیمؓ ایسا ہی کرتی ہیں۔ اندھیرے میں مہمان یہ سمجھتا ہے کہ میزبان بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ مہمان کو کھانا کھلا کر سارا گھر فاقے سے پڑ رہتا

ہے۔ صبح ہوتی ہے تو ابوطلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضورؐ انھیں دیکھ کر تبسم فرماتے اور کہتے ہیں ''تم دونوں میاں بیوی رات مہمان کے ساتھ جس سلوک سے پیش آئے، اللہ تعالیٰ اس سے بہت خوش ہوا ہے۔ پھر حضورؐ آیت تلاوت فرماتے ہیں جو اس موقع پر نازل ہوئی:

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصتہ

(اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ خود محتاج کیوں نہ ہوں۔) (الحشر ۹)

اس طرح ابوطلحہؓ اور ان کے گھر والوں کے ایثار کی داستان رہتی دنیا تک کلامِ الٰہی میں ثبت ہوگئی۔

اسلام میں قانونی مساوات

بیت الحرام اللہ کا پاک اور محترم گھر، عرب کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے زائرین سے بھرا ہوا ہے۔ لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک کی پکار ہر زبان پر ہے۔ غلام اپنے آقا کو پکار رہے ہیں۔ ان کی پکار والہیت ہے اور عجز و انکسار بھی۔ ایک بہت بڑی جماعت طوافِ کعبہ میں مصروف ہے۔ امیر المومنین عمرؓ بن خطاب اور ان کے ہمراہی مدینۃ النبی سے تھوڑی دیر پہلے پہنچے ہیں اور طواف کر رہے ہیں۔

مدینے کے قافلے میں عراق و شام کے نومسلم سردار بھی ہیں۔ امیر المومنین کی معیت میں طواف کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کے خیال سے مسجد الحرام میں موجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ شریک ہوگئی۔ عجب سماں ہے۔ لبیک لبیک کی دلگداز صداؤں سے فضا گونج رہی ہے۔ امیر، غریب، بادشاہ اور رعایا سب یکساں لباس زیبِ تن کیے اللہ کے دربار میں حاضر ہیں۔ سب کی زبان پر ایک کلمہ ہے۔

تلبیہ کی اس مقدس فضا میں ناگہاں ایک کرخت آواز گونجتی ہے ''تڑاخ۔'' طواف کرنے والے رک گئے۔ لبیک اللھم لبیک کی صدائیں دھیمی پڑ گئیں۔ متجسس نگاہیں دیکھتی ہیں کہ ایک بدو سفید احرام پہنے کھڑا ہے۔ اس کی ناک کا بانسا ٹیڑھا ہو چکا اور خون بہ رہا ہے۔ بدو کے قریب ہی ایک وجیہہ و شکیل عرب اول فول بک رہا ہے۔ چہرہ غصے سے سرخ ہے اور وہ غضب آلود نگاہوں سے بدو کو گھور رہا ہے۔

اللہ نے جس مقدس گھر کو جائے امن قرار دیا، جہاں پہنچ کر ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ اور مامون سمجھتا ہے جس کے احترام میں بڑے بڑے خودسر اور متمرد اپنی گردن خم کر دیتے ہیں۔ اس مقدس مقام پر یہ ظلم!

''بات کیا ہے؟'' لوگ بدو سے پوچھتے ہیں۔

''اس شخص کا تہ بند زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ پیچھے سے انسانوں کا ریلا جو آیا تو میرا پاؤں اس پر جا پڑا اور اس نے مجھے تھپڑ دے مارا۔'' بدو خون پونچھتے ہوئے بولا۔

''ظلم ہے ظلم۔'' ایک شخص پکار اٹھتا ہے۔

''بھیڑ بھاڑ میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ آپ کو درگزر سے کام لینا چاہیے تھا۔ دوسرا اس وجیہہ عرب سے نرمی سے کہتا ہے۔

''آپ کون ہیں صاحب؟ قصور آپ کا اپنا تھا۔ ایک مسلمان بھائی کو لہولہان کر دیا۔'' تیسرا تند و تیز لہجے میں سرزنش کرتا ہے۔

''میں؟ جبلہ ہوں غسان کا بادشاہ! اگر حدودِ حرم میں نہ ہوتا تو اس گستاخ کی گردن مار دیتا۔'' وہ نفرت بھری نگاہوں سے بدو کو دیکھتا اور پوچھنے والے کو بڑے تکبر سے جواب دیتا ہے۔

◆◆◆

اندر کوئی کہہ رہا تھا ''بھاگو بھاگو' یہ میرے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تم تنہا اسے نہیں جھیل سکتیں۔ تم کمزور ہو اور یہ بڑا جھمیلا ہے۔''

مگر میرا دل پکار رہا تھا ''بڑا ہو یا چھوٹا' اب صرف تم یہاں ہو اور تمھیں ہی جھیلنا ہے اسے۔ سیمیں بی بی' کمزور

سوختہ مغربی تہذیب سے بلند ہونے والی

خاموش چیخیں

اس بظاہر چمکتے دمکتے دیس کا اندوہناک نوحہ
جہاں نفسانی خواہشات اعلیٰ
جذبات پہ غالب آ چکیں

رضیہ فصیح احمد

ہونے کے بہت مواقع آئیں گے۔ گھر میں چوہیا نکل آئے تو ہائے وائے کر لینا' یہ بہادر بننے کا وقت ہے کہ ایک زندگی کا سوال ہے۔ تم نے بچے کی آواز اپنے کانوں سے سنی ہے۔ اگر وہ بند ہو گئی تو کیا تم زندگی بھر خود کو معاف کر سکو گی؟'' دل سے ڈوبہ ڈو تو ہوتی رہتی تھی مگر ایسا نازک وقت اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔

''اچھا صرف ایک منٹ' اسے آکسیجن مل جائے اس کے بعد میری ذمے داری نہیں۔'' میں نے سوچا۔

کبھی کبھی نجانے کون کھینچ کر مجھے ایسی جگہ لے جاتا ہے جہاں جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہوتا؟ دل سے نبرد آزمائی اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ میں نے کہا ''کل سے باقاعدہ چہل قدمی شروع کروں گی کہ آج تو اندھیرا ہو چلا ہے۔''

دل نے کہا ''بزرگوں نے کہا ہے کہ

توکل بھی نہیں آتا۔"

میں نے کہا "ارادہ مضبوط ہو اور دل میں کھوٹ نہ ہو تو توکل ہمیشہ آتا ہے۔"

دل نے کہا "ارادہ مضبوط ہو اور دل میں کھوٹ نہ ہو تو آدمی کام آج سے شروع کرتا ہے نہ کہ کل سے اور چھوٹے موٹے بہانے تلاش نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "چلو آج ہی سے سہی۔ ابھی اتنی روشنی ہے کہ اپارٹمنٹ کمپلیکس کا ایک چکر لگایا جا سکے۔"

"بسم اللہ......" دل نے خوش ہو کر کہا۔

اب سوچا کہ چلو احتیاطاً پڑوسن سے بھی پوچھ لیں کہ اکثر ساتھ ٹہلنے جانے کا ذکر کرتی ہے۔ پڑوسن کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائی اور ساتھ چلنے کو کہا۔ جواب ملا "آج نہیں، آج میرے پاس کمپنی ہے" مطلب یہ کہ کوئی بیٹھا ہے۔ میں نیچے اتر آئی۔

اس کمپلیکس میں کئی عمارتیں تھیں اور سب کا طرزِ تعمیر ایک جیسا تھا۔ سب کے آگے لان تھے، پیچھے کار پارکنگ اور ہر دو عمارتوں کے درمیان ایک بڑا سا ڈسٹر یا کوڑا گھر جس میں کوڑا کرکٹ ایک ہفتہ تک سمایا رہتا۔ ہمارا کمپلیکس آخری تھا اس لیے حد بندی کے خار دار تار نصب تھے اور اس سے آگے جنگل۔

مجھے ہلکی سی آواز، بہت ہلکی، کوڑے گھر کے پاس سے آئی۔ شاید بلی کی تھی۔ یہ گاؤں ہی تو تھا۔ آوارہ بلیاں جو شہروں میں نظر نہیں آتیں، یہاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ اپنے ملک میں کوڑے کے آس پاس بلی اُنجوبہ نہیں مگر امریکا میں جہاں انھیں بلور کے برتنوں میں کٹا ہوا قیمہ، وٹامن ملے گوشت اور کھیلنے کے لیے پلاسٹک کے چوہے اور ہڈیاں فراہم کی جاتی ہیں، وہ کوڑا گھر میں کیوں جھانکیں؟ یہ سوچتی آگے بڑھی کہ واقعی کوئی آفت کا مارا بلی کا بچہ پھنس گیا ہے تو اس کی مدد کر دوں۔ دوسری آواز... ی ی، بالکل میاؤں بھی نہیں تھی۔ یہ یقین ضرور ہوا کہ آواز کوڑے ہی سے آ رہی ہے۔ کوٹھڑی برابر کوڑا گھر سے باہر نکالنا میرے بس میں بھی ہوگا یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے، دیکھ تو لوں۔

قریب پہنچی تو آواز بند ہو چکی تھی۔ اونچے کوڑا گھر میں اچک اور جھانک کر دیکھا، بلی نہیں تھی۔ دفعتہ نحیف سی آواز پھر آئی۔ یہ وہاں پڑے بڑے بڑے کالے تھیلوں میں سے کسی ایک تھیلے سے آئی تھی۔ تو کیا بلی تھیلے میں بند ہے؟

تب ہی دل نے کہا "بکی کیوں بن رہی ہو، یہ کسی نوزائیدہ بچے کی آواز ہے۔"

دوبارہ کان لگا کر سنا، دل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کسی نوزائیدہ بچے کی آواز تھیلے کے اندر سے آ رہی تھی۔ گھٹی گھٹی، اگر اسے فوراً نہ کھولا گیا تو آکسیجن کی کمی سے مر جائے گا غریب۔ میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ "بھاگو بھاگو، کس مصیبت میں پڑ رہی ہو اور دل کہہ رہا تھا "ایک زندگی کا سوال ہے۔ بچہ مر گیا تو ساری زندگی خود کو کیا منہ دکھاؤ گی؟"

خیالات کی یلغار نے مجھے دبوچ لیا...... بچے کو نکالوں، پولیس کو اطلاع دوں، کسی کو مدد کے لیے بلاؤں؟

اندھا دھند نزدیک ترین کمپلیکس اپارٹمنٹ کی طرف بھاگی۔ اندر جانے والا دروازہ مقفل تھا۔ ڈاک کے ڈبوں پر رہنے والوں کے نام لکھے تھے۔ ہر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے ایک گھنٹی کا بٹن تھا۔ میں ان اپارٹمنٹس میں کسی کو نہیں جانتی تھی۔ یوں ہی بٹن دبایا۔ کسی کے آنے کی اُمید نہیں تو دروازہ بھی نہیں کھلے گا۔ پھر بھی موہوم سی اُمید میں جلدی جلدی

سارے بٹن دبائے مگر کوئی دروازہ نہیں کھلا۔

کچھ دن پہلے لوگ کھول بھی دیتے تھے۔ لیکن ایک شرابی نے یہ وتیرہ اپنا لیا کہ اپنے اپارٹمنٹ میں جانے کے لیے کسی بھی گھر کا بٹن دبا کر اندر داخل ہو جاتا۔ پھر نشے میں جس گھر کو اپنا سمجھتا' وہاں گھنٹیاں بجا بجا کر لوگوں کا ناطقہ بند کر دیتا۔ اگر وہ اپنی عمارت میں پہنچ کر صحیح جگہ کی گھنٹی بھی بجاتا تو دروازہ نہ کھلتا کہ اس کی دھرم پتنی نے طلاق کا مقدمہ ٹھونک کر شوہر سے تحفظ کا پروانہ لے رکھا تھا۔ وہ نیک بخت پولیس کو بلا لیتی اور رات کو پولیس اسٹیشن اس کا ٹھکانا ہوتا۔

چناں چہ اب کوئی دروازہ نہیں کھولتا تھا۔ یہ بات یاد آتے ہی میں پھر باہر بھاگی۔ بھاگتے ہوئے سوچا ''کمپلیکس کے دفتر تو اس وقت کوئی ہو گا نہیں' گھر سے فون کروں تو تین منزل چڑھنے تک اس گھٹی گھٹی آواز پر کیا گزرے گی؟''

آخری فیصلہ...... بچے کو خود نکالو۔ کوئی قانونی اڑچن تو نہ ہو گی؟ بلا سے ہو۔ کوڑے کے ڈھیر سے پھول سے بچے کو نکال سکو گی' کبھی پہلے یہ کام کیا ہے؟ جس نے ڈالا ہے' اس نے دیکھ لیا تو تینوا دبا دے گا اور پولیس کہیں یہ نہ کہے کہ تم نے اغوا کیا اور مار ڈالا؟

''چپ چپ! یہ بولنے نہیں' کام کا وقت ہے۔ دیکھو میرے ہاتھ پہلے ہی کانپ رہے ہیں' ہونٹ موٹے ہو گئے' زبان بھاری ہو چکی' بس اب نہ بولنا۔ اپنے اندر اٹھنے والی آوازوں کو چپ کرانا بھی بڑا کام تھا۔ میں نے تھیلے ٹٹولے آواز پھر بند ہو گئی تھی۔

''بھاگو بھاگو' بچہ مر چکا۔''

''چپ' چپ' آواز آ رہی ہے' ہلکی ہو گئی ہے۔''

''جب تک نکالو گی' مر ہی جائے گا۔''

ی...... ی...... می...... آواز آخری تھیلے سے آ رہی تھی۔ جیسے تیسے کھینچ کر نکالا۔ خاصا بھاری تھا' کمر نے احتجاج کیا۔ مختلف اعضا مختلف اوقات میں احتجاج کرتے رہے۔ کم بخت یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ایمرجنسی ہے' باغیانہ ذہنیت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔

چاند کی روشنی اتنی ہلکی تھی جیسے کسی ٹارچ کے سیل ختم ہو گئے اور پیلی روشنی آخری ہچکیاں لے رہی ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے تھیلے میں لگی گرہ کھولنے کی کوشش کی' نہیں کھلتی کم بخت۔ تھیلے کو پھاڑنے کی کوشش کی۔

می...... می...... جیسے کوئی ہمت بندھا رہا ہو۔ مگر گٹھیا زدہ کلائی اور انگلیاں احتجاج کرنے لگیں۔ مریں کم بخت' میں تو کھول کر دم لوں گی۔ میں پھر گرہ کھولنے لگی۔ اتنی دیر میں نظر آیا کہ تھیلا کئی جگہ سے تھوڑا تھوڑا کٹا ہوا ہے۔ وہاں سے پھاڑنے میں یقیناً آسانی ہو گی۔

اندھیرا اب نیچے اتر آیا تھا۔ شفق رنگ اندھیرے میں ڈوب گئے تھے۔ خاردار تار' کھمبے اور عمارتوں کے ٹیڑھے میڑھے سائے ماحول کو پراسرار بنا رہے تھے کہ اتنے میں ایک سایہ میری طرف بڑھا۔ میں ڈر کر چیخ مارنے والی تھی کہ آواز آئی ''امی!'' بیٹا میری تلاش میں نکل آیا تھا۔

''فرمان' جلد آؤ' ڈمسٹر کے پاس' جلدی۔''

فرمان بھاگتا ہوا آیا ''یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟''

وہی احتجاج' اب بیٹے کی طرف سے۔

''دیکھو' اس تھیلے میں کوئی بچہ ہے' میں اسے نکال رہی ہوں۔''

''خدا کے لیے آپ نہ نکالیے۔'' وہ رونے والا ہو گیا۔

''کیوں' کیوں نہ نکالوں؟''

''پولیس کو فون کیجیے۔''

"تم کرو مجھے کوشش کرنے دو ورنہ وہ مر جائے گا یا تم نکالو تو میں گھر جا کر فون کرتی ہوں۔"

آخری بات سنتے ہی وہ گھر کی طرف بھاگا۔ میں نے چلا کر کہا "ایک ٹارچ اور تولیہ لے کر واپس آنا۔"

میرے ہاتھ تھیلا پھاڑنے میں مصروف تھے۔ آخر خاصا بڑا سوراخ کر دیا۔ جھانک کر دیکھا...... مڑے تڑے کاغذ، ڈبل روٹی کے ٹکڑے، پھلوں کے چھلکے اور بیج، شیشے کے ٹکڑے اور منا سا بچہ۔ مجھے یک دم سردی سی لگی اور میں سر سے پیر تک کانپنے لگی۔

بیٹا ٹھیک کہتا تھا، نہیں دل ٹھیک کہتا تھا، اب کیا کروں؟ بچے کو اپنے دوپٹے میں لیے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے نکالتے ہوئے ہاتھوں میں جو چپچپاہٹ محسوس ہوئی، وہ بڑی لرزہ خیز تھی۔ بہت دور درخت کی ایک شاخ کے بیچ چاند بندھا سا لٹکا تھا۔ چاند کی ہلکی روشنی میں یہ پتا چلنا محال تھا کہ یہ چپچپاہٹ پیدائش کے خون کی تھی یا شیشے کے ٹکڑوں نے بچے کے بدن پر زخم ڈال دیے تھے۔

میرے جسم کی گرمی اسے بھلی لگی یا کیا کہ وہ خاموش ہو گیا اور ساکن بھی۔ اوپر کھڑکی سے روشنی کی رمق آئی۔ کسی کو باتوں کی آواز سے کچھ شبہ ہوا یا شاید کوئی میری طرح کھڑکی سے جھانکنے کا شوقین تھا۔

فرمان اب تک نہیں لوٹا تھا۔ ماؤں کی رکھی ہوئی چیزیں ویسے بھی بچوں کو آسانی سے نہیں ملتیں۔ میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی، لگتا تھا درخت صورت حال جاننے کو کئی قدم نزدیک کھسک آئے ہیں۔

جیسے ہی فرمان ٹارچ اور تولیہ لے کر آیا، سڑک پر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتی ایمبولینس کی آواز گونجی۔ پھر ایمبولینس فائر انجن اور پولیس کی گاڑیاں آ کھڑی ہوئیں۔ میری جان میں جان آئی۔ بچے کو ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر وہ ایمبولینس میں ڈال کر لے گئے۔ آگ بجھانے والا انجن بھی چلا گیا۔ پولیس والوں نے میرا بیان لکھا، جائے وقوع کی تصویریں لیں۔ وہ کوڑے گھر کی حد بندی کر رہے تھے جب ہم ماں بیٹا ان سے اجازت لے کر گھر واپس آئے۔

گھر کی تین سیڑھیاں چڑھ کر سرخ پتھر پر فرمان دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے بیٹھ گیا۔ میں نے چہرے سے ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا تو یوں لگا جیسے پگھلتا برف کا ٹکڑا تھام لیا ہو۔ اس کے چہرے کی پیلاہٹ پورے چاند نما ہنڈے کی روشنی میں اور نمایاں ہو گئی تھی۔ خاردار تار پار جنگل میں کسی بھٹکے جگنو کی روشنی امیدوں کی طرح ٹمٹما کر بجھ جاتی تھی۔

میرے بہت کہنے پر بھی فرمان نہیں اٹھا بلکہ اس رکھائی سے کہا جس سے وہ آج تک مجھ سے نہیں بولا تھا "خدا کے لیے آپ اندر جائیے اور مجھے اکیلا چھوڑ دیجیے۔"

تب ہی ایک خیال میرے ذہن میں کوندا۔ اس پڑوسن نے جو میرے ساتھ ٹہلنے نہیں گئی تھی، مجھے بتایا تھا "جب تمہارا بیٹا اکیلا رہتا تھا تو ایک امریکی لڑکی اکثر اس کے ساتھ نظر آتی۔ اس کمپلیکس کی عمارت کا ہر پہلا گھر ایک بیڈ روم کا تھا۔ اس میں کمپلیکس کے ملازمین یا کالج یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں رہتے تھے۔ وہ بھی ایسے ہی کسی اپارٹمنٹ میں تھی مگر اب بہت دنوں سے نظر نہیں آئی۔ ایک مرتبہ کسی اسٹور میں ملی تو ماں بننے والی تھی۔"

میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ ممکن ہے اس کی کوئی ہم جماعت ہو۔ ماں بننا یہاں کوئی اُعجوبہ تو ہے نہیں۔ میں تو جب اس گھر میں آئی تھی، میں نے کسی لڑکی کو بیٹے کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔ اس نے خود مجھے بلایا

تھا تاکہ میں گھر کے کام کاج کر دیا کروں۔
گھر جانے سے پہلے میں نے پڑوسن کی گھنٹی بجائی۔ اسی نے دروازہ کھولا۔ ایک گنجا موٹا مرد سامنے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ پڑوسن بھی بجی سجائی تھی۔ بال جو عام حالات میں خاصے پراگندہ رہتے' سنورے ہوئے تھے۔ شاید وہ کہیں باہر کھانا کھانے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ میں نے دخل در معقولات کی معافی مانگی اور پوچھا' اس لڑکی کا نام کیا ہے جس کے ساتھ میرے بیٹے کی دوستی تھی؟
یہ کہہ کر اس نے تڑاق سے دروازہ بند کر دیا۔
"مجھے نہیں معلوم۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی دوستی تھی۔"
رہ رہ کر خیال آتا' جاؤں بیٹے سے کچھ پوچھوں۔ مگر کیا پوچھوں؟ اب تو دل بھی دم سادھے پڑا تھا' کچھ نہ بولتا تھا...... رات بھر سوتی جاگتی رہی۔ طرح طرح کے برے خواب دیکھتی رہی۔ رات بھر گھر کے سامنے لگا صنوبر کا درخت ٹیرس کے جنگلے پر ہاتھ مارتا رہا اور میں چونک چونک کر اٹھتی رہی۔ ایک مرتبہ آنکھ کھلی تو بے چین ہو کر اٹھی اور بیٹے کے دروازے تک گئی۔ یوں لگا جیسے اندر کوئی سسکیاں لے رہا ہو۔ نہیں شاید پنکھا چل رہا ہے۔
پھر میں نے کچھ نہیں سوچا نہ دل کو بولنے کی مہلت دی' برائے نام دروازہ کھٹکھٹا کر جھٹ اندر داخل ہو گئی۔ بجلی کا بٹن دبایا کہ میں اسے اور وہ مجھے دیکھ لے۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاگ رہا ہے' مگر وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور آنکھیں ملیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سو رہا تھا مگر اب واپسی کی کشتیاں جل چکی تھیں۔
"کیا بات ہے امی؟" اس نے پوچھا۔
"ایک بات میرے ذہن پر سوار ہے' تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔"
"رات کے دو بجے؟" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور جب تک یہ بات صاف نہیں ہوتی' مجھے نیند نہیں آئے گی۔ تم میری عادت جانتے ہو۔ اس لیے یہ بات ابھی پوچھنا چاہتی ہوں۔"
وہ چپ رہا۔ میں انتظار کرتی رہی کہ کہے "پوچھیے" مگر وہ کچھ نہ بولا۔"
بغیر کسی تیاری کے میرے منہ سے نکلا "کیا وہ تمہارا بچہ تھا؟"
فرمان کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر چہرہ سرخ ہونا شروع ہوا' دیکھتے دیکھتے گلنار ہو گیا اور کان جیسے جلتے انگارے۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ مجھے تو سچ سننا تھا...... میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا...... بیک وقت غصہ' زخم' بے اعتباری اور دکھ...... رنج کی وہ پرچھائیاں جنھیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پھر وہ رونے لگا۔ میری گود میں سر ڈال کر کہنے لگا "آپ مجھے اتنا برا سمجھ سکتی ہیں' میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"
نہیں معلوم کیوں میں سر سے پیر تک کانپ گئی۔
میں نے کہا "بیٹا معاف کرنا' اس بچے کو دیکھ کر تمہاری جو کیفیت تھی' تو جانے کیوں خیال آیا کہ......"
"مجھے تو یہی خیال آتا رہا' کہیں وہ مر نہ گیا ہو...... کیا وہ زندہ تھا امی؟"
"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی' دعا تو یہی کر رہی ہوں مگر یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔"
"میں یہ بھی سوچتا رہا کہ...... کہ وہ میرا بھی ہو سکتا تھا۔"
"کیا مطلب؟"
"ڈیڑھ سال ہوا' آپ کے آنے سے پہلے میں نے ایک امریکی لڑکی سے "کاغذی شادی" کر لی تھی۔ میں اسے بتاتا رہتا کہ ابا کے انتقال کے بعد آپ نے کتنی مشکلوں سے میری پرورش کی ہے' میری خواہش پر

مجھے پڑھنے امریکا تک بھیجا ہے۔ میں کسی طرح اپنی ماں کو ناخوش نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا' آپ ایمان کی حد تک یقین رکھتی ہیں کہ اگر میں نے کسی امریکی لڑکی سے شادی کی تو مجھے کھو دیں گی۔ اس لیے ابھی میں اُنھیں تمھارے متعلق نہیں بتا سکتا اور نہ تعلیم کے دوران بچے کا بار اُٹھا سکتا ہوں۔

"جب میں نے کئی بار اس سے اسقاط حمل کی بات کی تو وہ ناراض ہو گئی۔ اب چھے مہینے کے بچے کو وہ اکیلی پال رہی ہے۔ مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ مگر میں اپنے بیٹے کو دیکھ آتا ہوں' امی وہ اتنا پیارا ہے کہ کیا بتاؤں...... کل اس بچے کو دیکھ کر خیال آیا کہ وہ میری بات مان لیتی تو میرا بیٹا بھی اسپتال کے کوڑا گھر کی نذر ہو جاتا۔" وہ سسکیاں لینے لگا۔ میں بھی رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اس کا سر تکیے پر رکھ کر کہا "تم سو جاؤ' میں بھی اب تھوڑی دیر لیٹوں گی۔"

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ جب بچہ تھا تو ایسی ہی امید بھری نظروں سے دیکھتا کہ میں اسے دوسری ٹافی دوں گی یا نہیں؟ میں اُٹھ کر جانے لگی تو بولا "امی کیا کل ہم جمی اور اس کی ماں کو یہاں لے آئیں؟" اس کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں کے چراغ بری طرح ٹمٹمانے لگے۔

میں دروازہ اور روشنی بند کر کے ٹیرس پر چلی آئی۔ لکڑی کا فرش اور جنگلا تر تھا' جیسے رات روتے رہے ہوں۔ چاند اوپر آ گیا تھا۔ کوڑا گھر کے چہار طرف لگا زرد ٹیپ پھڑپھڑا رہا تھا۔ میرے ذہن میں می کی آواز ابھری' پھر دو معصوم بچوں کی خاموش چیخیں جیسے میرے سینے میں سلاخوں کی طرح گڑ گئیں۔ مجھے اس بہادر لڑکی کا خیال آیا جو میرے پوتے کو محبت سے تنہا پال رہی تھی۔ اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دے' میں اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

میں فوراً یہ بات فرمان کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ عورت ہونے کے ناتے میری تمنا تھی کہ اُسے تھوڑی سی سزا مل جائے۔

"لیکن یہ تو سوچو اتنی بڑی قربانی اس نے صرف تمھاری خاطر دی...... صرف تمھاری خوشی کی خاطر' صرف تمھاری خوشی کی خاطر۔" دل پھر بولنے لگا۔

مجھ سے صبر نہیں ہوا' میں دوبارہ اُس کے کمرے میں گئی' دروازہ کھولا اور کہا "سنو فرمان! جب تک میں اپنے پوتے کے لیے نرسری بنا لوں اور بہو کو دلہن بنا کر لانے کا انتظام نہ کر لوں' اسے کیسے لا سکتی ہوں!" ◆◆◆

زندگی کا نچوڑ

○ اللہ کے دیئے ہوئے پر راضی رہو ورنہ کوئی اور مالک تلاش کرو جو اس سے زیادہ دے۔

○ جن باتوں سے اللہ نے منع فرمایا اس سے باز آ جاؤ ورنہ اس کی کائنات سے باہر چلے جاؤ۔

○ اگر گناہ کرنا چاہتے ہو تو ایسی جگہ کرو جہاں اللہ نہ دیکھ سکے' ورنہ گناہ مت کرو۔

○ اللہ کی عبادت کرو' نہیں تو اس کا دیا ہوا رزق بھی مت کھاؤ۔

○ اللہ کے علاوہ کسی سے بھی امیدیں وابستہ مت کرو۔

○ اللہ پر ایسے توکل رکھو جیسے سانس لیتے ہو۔

○ یاد رکھو یہ دُنیا مقامِ بقا نہیں مقامِ فنا ہے۔ صبر شکر کا دامن تھامے رکھو' سکون اور کامیابی تمھارے ساتھ رہے گی۔

(آمنہ رمضان، پاک پتن)

بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا

- امریکی وزیر خارجہ، ہنری کسنجر نے بھارت کو کیا دھمکی دی؟
- جنگ ستمبر میں چین کن وجوہ کی بنا پر پاکستان کی مدد نہیں کرسکا؟
- سوویت یونین اندرا گاندھی کو حملے سے کیوں باز رکھنا چاہتا تھا؟
- بھارتی فوج کے سربراہ، جنرل مانک شا نے اپنی آپ بیتی میں کیا جھوٹ لکھا؟

ایک ممتاز بھارتی مورخ کے چشم کشا انکشافات پر مبنی تازہ کتاب کی تلخیص

ڈاکٹر سری ناتھ رگھوان / سید عاصم محمود

یہ ۲ مارچ ۱۹۷۱ء کی بات ہے، بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے دفتر میں ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میں بھارتی حکومت کے اعلیٰ سرکاری افسر شریک تھے۔ ان میں بھارتی خفیہ ایجنسی، را کا سربراہ آر این کاؤ بھی شامل تھا۔

یہ میٹنگ مشرقی پاکستان میں صورت حال کا جائزہ لینے کی خاطر اندرا گاندھی نے بلوائی تھی۔ تب پاکستانی آمر، جنرل یحییٰ خان اور سربراہ عوامی لیگ، شیخ مجیب الرحمٰن کے مابین بہ سلسلہ حکومت سازی مذاکرات چل رہے تھے۔

اسی میٹنگ میں آر این کاؤ نے یہ تجویز پیش کی: ''اگر فریقین کے مابین مذاکرات ناکام ہو گئے، تو پاک فوج اور مسلح بنگالیوں کے مابین تصادم شروع ہو سکتا ہے۔ تب بھارتی حکومت کو چاہیے کہ وہ عوامی لیگ کے کارکنوں کو فوجی تربیت اور اسلحہ فراہم کرے تاکہ بنگالیوں کی تحریک آزادی کامیاب ہو سکے۔''

اس تجویز کو اندرا گاندھی نے قبول کر لیا۔ درج بالا واقعہ عیاں کرتا ہے کہ بھارتی حکومت شیخ مجیب الرحمٰن کی پشت پناہ تھی اور موصوف بھارتیوں کی حمایت سے بنگلہ دیش بنانے پر تلے بیٹھے تھے۔

لیکن یہ بات انکشاف کا درجہ نہیں رکھتی۔ آج سبھی کو معلوم ہو چکا کہ پس پردہ بھارتی حکومت بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کر رہی تھی۔ انکشاف یہ ہے کہ تب تک اندرا گاندھی حکومت مشرقی پاکستان پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ یہ تو بعد میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بھارت کو مشرقی پاکستان پر دھاوا بولنا پڑا۔

انکشافات سے بھرپور کتاب

درج بالا واقعہ حال ہی میں بھارت میں شائع ہونے والی ایک کتاب ''۱۹۷۱ء: قیام بنگلہ دیش کی عالمی تاریخ'' (1971: Global history of the creation of Bangladesh) سے لیا گیا جو سقوط مشرقی پاکستان پہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر سری ناتھ رگھوان ممتاز بھارتی مورخ ہیں۔ نئی دہلی کے ممتاز تھنک ٹینک، سینٹر فار پالیسی ریسرچ میں سینئر فیلو ہیں۔ نیز لندن کے کنگز کالج میں عسکریات پہ لیکچر دیتے ہیں۔

مندرج بالا کتاب ڈاکٹر رگھوان کی پانچ سالہ تحقیق کا نچوڑ ہے۔ دوران تحقیق وہ امریکا، روس، جرمنی، کینیڈا اور برطانیہ گئے تاکہ مطلوبہ مواد حاصل کر سکیں۔ نیز انھیں نئی دہلی میں واقع نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری سے ان جرنیلوں، وزرا اور سرکاری افسروں کے اہم نوٹس ملے جو ۱۹۷۱ء میں وزیراعظم اندرا گاندھی کے دست راست تھے۔ دستاویزی ثبوتوں سے لیس ہو کر ڈاکٹر رگھوان نے کتاب لکھنی شروع کی، تو ایک ایسی منفرد تخلیق سامنے آئی جس میں بہت سے انکشافات ہیں اور وہ پاک بھارت جنگ ۷۱ء پہ نئے زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔

بھارت کی خوش قسمتی

دور جدید میں اسلحے کی طاقت کے علاوہ شعبہ سفارت کاری بھی بڑی اہمیت اختیار کر چکا۔ مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم میں سفارت کاری کی بدولت ہی یہ عجوبہ سامنے آیا کہ جمہوری (امریکا)، بادشاہت (برطانیہ) اور آمرانہ (روس) یہ ممالک مل کر جرمنی و جاپان کے خلاف صف آرا ہوئے اور انھیں شکست دی۔

دوسری طرف جرمنی اور جاپان جنگ میں ساتھی تھے، مگر ان کے مابین سفارت کاری بہت کمزور تھی۔ یہی وجہ ہے، جاپان منصوبہ بنا کر بھی روس پر حملہ نہیں کر سکا۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر روس تمام تر فوج جرمنوں کے مقابل لے آیا اور انھیں شکست دی۔ روسی محاذ پر ہار ہی نے دوسری جنگ عظیم کا نقشہ بدل ڈالا۔

لیکن ڈاکٹر رگھوان کی رو سے ۱۹۷۱ء میں بھارت کو کامیاب سفارت کاری نہیں خوش قسمت ہونے کے باعث فتح ملی۔ ورنہ بھارتی حکومت سے بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں کہ وہ جنگ ہار بھی سکتی تھی۔ بھارتی حکومت کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں عالمی حالات کچھ ایسے بن گئے کہ تین بڑی سپر طاقتیں...... امریکا، چین اور روس چاہتے ہوئے بھی بھارتی حملے کو نہ روک سکے۔

ڈاکٹر رگھوان لکھتے ہیں کہ کئی عوامل نے قیام بنگلہ دیش میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان میں سب سے پہلا ۱۹۶۸ء کا طلبہ احتجاج ہے جو پاکستان سمیت کئی ممالک میں دیکھنے کو ملا۔ طلبہ کے احتجاج کی وجہ ہی سے جنرل ایوب خان کو اقتدار فوج کے سپرد کرنا پڑا۔

دوسرا عمل ''بھولا'' سمندری طوفان ہے جس نے عام انتخابات سے قبل ماہ نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو نشانہ بنایا۔ یہ جانی نقصان کے ضمن میں تاریخ انسانی کا شدید ترین سمندری طوفان تھا۔ اس نے مشرقی پاکستان میں تقریباً تین لاکھ انسان مار ڈالے، جبکہ لاکھوں بے گھر ہوئے۔ یحییٰ خان حکومت اس قدرتی آفت کے بعد صحیح طرح امدادی کارروائیاں انجام نہ دے سکی، چناں چہ مشرقی پاکستان میں اسے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کی نااہلی سے شیخ مجیب الرحمٰن کو براہ راست فائدہ ہوا۔

دسمبر کے عام انتخابات میں شیخ صاحب کی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ میں سے ۱۶۰ نشستیں جیت لیں۔ ڈاکٹر رگھوان کا دعویٰ ہے کہ تب بھی شیخ مجیب پاکستان توڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ نعرہ آزادی بلند کرنے سے فوج عوامی لیگ پر چڑھائی کر دے گی۔ مگر یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے گٹھ جوڑ نے حالات بہت خراب کر ڈالے۔

اندرا گاندھی پاکستان پر حملے سے ہچکچا رہی تھیں

چناں چہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو جنرل یحییٰ خان نے عوامی لیگ پر عسکری کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔

ڈاکٹر رگھوان نے ان امکانات کا بھی جائزہ لیا جو عملی جامہ پہننے پہ پاکستان کو متحد رکھتے۔ وہ امکانات یہ ہیں:

☆ اگر امریکا یحییٰ حکومت کی عسکری و معاشی امداد روک دیتا، تو ممکن تھا، مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن (سرچ لائٹ) شروع نہ ہوتا۔

☆ اگر یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمٰن کے چھے نکات قبول کر لیتا، تو یقیناً وہ صوبائی خودمختاری پر قانع رہتا۔

☆ اگر بھارت اوائل ۱۹۷۱ء میں حملہ کر دیتا، تو

مشرقی پاکستان میں زیادہ قتل و غارت انجام نہ پاتا۔

دوران تحقیق بھارتی مورخ کے سامنے یہ سوال بھی آیا: اگر مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک جنم نہ لیتی، تب بھی وہ ملک کیونکر متحد رہتا جس کا ایک حصہ ہزار میل دور واقع اور دو اطراف سے دشمن میں گھرا تھا؟

"۱۹۷۱ء: قیام بنگلہ دیش کی عالمی تاریخ" کا ایک بڑا انکشاف یہ ہے کہ مشرقی پاکستان پہ حملہ کرنے کے لیے بھارتی حکومت نے کوئی حکمت عملی نہیں بنائی تھی۔ بس جیسے جیسے حالات نے جس طرف رخ موڑا، وہ بھی اسی سمت چلتی گئی۔ جنرل جے ایف آر جیکب ۱۹۷۱ء میں بھارتی فوج کی ایسٹ کمانڈ کے سربراہ، جنرل جگجیت اروڑہ کا نائب تھا۔ وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتا ہے: "ہم بس چٹاگانگ اور کھلنا کے اضلاع پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ مدعا یہ تھا کہ وہاں آزاد بنگلہ دیش کی حکومت قائم کر دی جائے۔ لیکن جب جنگ کا دائرہ وسیع ہوا تو ڈھاکہ ہماری منزل مقصود بن گیا۔"

سام مانک شا کا جھوٹ

۱۹۷۱ء میں فیلڈ مارشل سام مانک شا بھارتی فوج کا کمانڈر تھا۔ یہ ایک نیک نام جرنیل گزرا ہے۔ مگر ڈاکٹر رگھوان اس کا ایک جھوٹ سامنے لے آئے۔ جنرل سام اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہے کہ مارچ ۱۹۷۱ء بھارتی فوج مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ چناں چہ اس کی ایما پہ اندرا گاندھی نے حملہ کرنے کا منصوبہ مؤخر کر دیا۔

ڈاکٹر رگھوان کی رو سے اس وقت بھارتی وزیراعظم کے قریبی حلقے میں شامل صرف ایک شخص، کرشنا سوامی سبرامینم (۱۹۲۹ء۔۲۰۱۱ء) مشرقی پاکستان پر فوری حملہ کرنے کے حق میں تھا۔ کے سبرامینم تب ایک بااثر عسکری ادارے، انسٹی ٹیوٹ فار ڈیفنس اسٹڈیز اینڈ اینالائزیز کا ڈائریکٹر تھا۔ چونکہ یہی ادارہ بھارت کی سیکیورٹی و جوہری پالیسیاں بناتا تھا، لہٰذا کے سبرامینم بارسوخ شخصیت سمجھا جاتا۔

بھولا سمندری طوفان نے مشرقی پاکستان میں تباہی مچادی

کے سبرامینم کا کہنا تھا کہ بھارت کو مشرقی پاکستان پر قبضہ کر کے وہاں شیخ مجیب کی حکومت قائم کر دینی چاہیے۔ اس بیان پہ حکومت پاکستان نے شور مچایا اور دنیا والوں کے سامنے یہ کہہ کر بطور ثبوت پیش کیا کہ بھارت جارحیت پہ اتر آیا ہے۔ بہرحال اندرا گاندھی نے اپنے مشیر عسکری کا مشورہ قبول نہیں کیا۔

جب مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہوتے چلے گئے، تب بھی اندرا گاندھی حملہ کرنے سے ہچکچاتی رہی۔ اسے خطرہ تھا کہ اندرون اور بیرون ملک اس حملے سے مخالفانہ طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔

ڈاکٹر رگھوان لکھتے ہیں کہ جب ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان میں عسکری آپریشن شروع ہوا، تو دو دن بعد

اندرا گاندھی نے قومی سلامتی کی کمیٹی کا اجلاس بلوا لیا۔ کمیٹی میں دو ارکان، بیوروکریٹ و سفارت کار، پی این ہکسار (P.N.Haksar) اور سفارت کار درگا پرشاد دھر وزیراعظم کے بہت قریبی اور با اعتماد ساتھی تھے۔

ہکسار اور دھر، دونوں نے اندرا گاندھی کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ بھارت کے اس طرزِ عمل کو بالعموم عالمی برادری میں ناپسندیدہ سمجھا جائے گا۔ دوسری طرف کے سبرامینم اور ان کے ہم نوا بیوروکریٹس چاہتے تھے کہ علیحدگی پسند بنگالیوں کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔

یکم اپریل ۱۹۷۱ء کو بھارتی وزیراعظم کی زیرِ صدارت کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوا۔ اسی میں طے پایا کہ عوامی لیگ کے کارکنوں کو گوریلا جنگ لڑنے کی خاطر فوجی تربیت دی جائے۔

یوں بھارت براہ راست پاکستانی تنازع کا حصہ بن گیا۔ لیکن اس وقت بھی مشرقی پاکستان پر حملے کا کوئی بھارتی منصوبہ سامنے نہیں آیا۔

جنرل سام مانک شا...... جھوٹ پکڑا گیا

چین اور امریکا کی دوستی

لیکن رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک تین سپر طاقتوں...... امریکا، سوویت یونین اور چین کے نزدیک بڑی اہمیت اختیار کر گئی۔ حتیٰ کہ بعدازاں امریکا اور سوویت یونین کے مابین ایٹمی جنگ چھڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ مارچ ۱۹۶۹ء میں سوویت یونین اور چین، دونوں کمیونسٹ ملک سرحدی اختلافات کے باعث لڑ پڑے۔ ان کی یہ غیر اعلانیہ جنگ چھے سات ماہ جاری رہی اور دونوں ملکوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔ اس چپقلش سے امریکا نے فائدہ اٹھانا چاہا جو چین کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ چناں چہ پاکستان کے تعاون سے امریکی و چینی حکومتوں کے مابین دوستانہ بات چیت ہونے لگی۔

اپریل ۱۹۷۱ء میں آخر چینی حکومت امریکا سے سفارتی تعلقات قائم کرنے پر رضا مند ہو گئی۔ اس خبر کو امریکی صدر، رچرڈ نکسن نے (اپنی) خانہ جنگی کے بعد عظیم ترین قرار دیا۔ چناں چہ جولائی ۱۹۷۱ء میں امریکی وزیر خارجہ، ہنری کسنجر پاکستان پہنچے اور یہاں سے ایک خفیہ پرواز کے ذریعے بیجنگ چلے گئے۔

حکومت پاکستان نے چین اور امریکا کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مزید برآں ابھی امریکی صدر کے دورہ چین کے سلسلے میں بھی امریکیوں کو پاکستان کی مدد درکار تھی۔ اس لیے امریکی حکومت مسئلہ مشرقی پاکستان کے ضمن میں خصوصی دلچسپی لینے لگی۔

بھارتیوں کو امریکی دھمکی

جولائی ۷۱ء تک بھارتی فوج نے بنگال میں فوجی کیمپ قائم کر لیے اور وہاں مکتی باہنی کے گوریلوں کو جنگی تربیت دی جانے لگی۔ جلد ہی مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ پاکستانی حکومت بھارتیوں کی مداخلت پر قدرتاً چیخ پکار کرنے لگی۔

اواخر جولائی میں ہنری کسنجر نے امریکا میں بھارتی سفیر، لکشمی کانت جہا کو اپنے دفتر بلایا اور دھمکی دی: ''اگر بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا، تو چین بھی اس جنگ میں شامل ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں امریکی حکومت بھارت کی کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔''

درج بالا واقعہ عیاں کرتا ہے، تب تک پاک بھارت جنگ کا امکان جنم لے چکا تھا۔ دراصل ایک طرف بھارتی حکومت لاکھوں مہاجرین کی مصیبت سے دوچار تھی۔ ادھر مکتی باہنی نے مشرقی پاکستان میں افراتفری مچا دی۔ یوں دونوں ممالک میں ٹکراؤ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

ہنری کسنجر کی دھمکی سے بھارتی حکومت متوحش ہو گئی۔ اب اندرا گاندھی سویت یونین کی سمت مزید جھکی۔ لیکن ابتداً سوویت حکومت پاکستان توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ مشرقی پاکستان آزاد ہو کر چین کے کیمپ میں جا سکتا ہے۔ اسی لیے سوویت روس چاہتے تھے کہ پاکستان اور بھارت سیاسی تصفیہ کر لیں اور جنگ سے پرہیز ہی کریں۔

بہرحال اگست ۱۹۷۱ء میں سوویت یونین اور بھارت کے مابین ''معاہدہ دوستی'' ہو گیا۔ لیکن اندرا گاندھی کی خواہش کے برعکس سوویت حکومت یہی اصرار کرتی رہی کہ بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ نہ کرے۔ روسی وزیر خارجہ آندرے گرومیکو نے بھارتی حکومت کو بتایا: ''بہتر ہے کہ بھارت صبر و برداشت کا مظاہرہ کرے اور اپنے خون میں ابال نہ آنے دے۔''

آخر اکتوبر ۱۹۷۱ء میں اندرا گاندھی خود سوویت یونین پہنچ گئی۔ اس نے سوویت صدر، برزنیف اور دیگر اعلیٰ راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ اس دورے کے بعد سوویت یونین کا موڈ بدل گیا اور وہ جنگ کا حمایتی بن بیٹھا۔ تب بھی سوویت یونین کا استدلال یہ تھا کہ یحییٰ خان حکومت مشرقی پاکستان میں مسائل سیاسی طور پر حل نہیں کر سکی۔ اسی لیے اب جنگ ناگزیر ہے۔

امریکی صدر نکسن اور وزیر خارجہ کسنجر کی میٹنگ

چین اپنے مسائل میں گرفتار

لیکن بھارت اور سوویت یونین کا ''معاہدہ دوستی'' واشنگٹن میں بم بن کر پھٹا۔ امریکی حکومت کو یقین ہو گیا کہ بھارت اب باقاعدہ طور پر سوویت کیمپ کا حصہ بن چکا۔ امریکا نے جوابی حملہ یوں کیا کہ چینی حکومت کو اکسانے لگا کہ وہ بھارت پر حملہ کر دے۔

بھارتی حکومت کو سب سے زیادہ خطرہ چین ہی سے تھا۔ لیکن پاکستان کی بدقسمتی کہ اس زمانے میں چینی حکومت دو شدید مسائل میں گرفتار تھی۔

اول یہ کہ روسی افواج کی بڑی تعداد چینی سرحدوں پر جمع تھی۔ چین کو خوف تھا کہ اگر اس نے بھارت کے خلاف محاذ جنگ کھولا، تو پیچھے سے سوویت

یونین چھرا گھونپ سکتا ہے۔

دوسری اور سب سے بڑی وجہ چیئرمین ماؤزے تنگ کے خلاف بغاوت ہونا تھا۔ اس بغاوت کا سرغنہ چین کا وائس چیئرمین، جنرل لن بیاؤ (Lin Biao) تھا۔ جنرل بیاؤ اور اس کے ساتھی ماؤزے تنگ کو آمر سمجھتے اور حکومتی پالیسیوں سے ناخوش تھے۔ دوسری طرف ماؤزے تنگ بھی جنرل بیاؤ سے چھٹکارا چاہتے تھے۔

بغاوت میں جنرل بیاؤ کے ساتھ فضائی و بری فوج کے دیگر جرنیل بھی شامل تھے۔ چناں چہ ۸ ستمبر ۷۱ء کو بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ تاہم باغی ماؤزے تنگ کو قتل کرنے میں ناکام رہے۔ اسی قتل پر بغاوت کی کامیابی کا انحصار تھا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد ۱۳ ستمبر کو جنرل بیاؤ قریبی ساتھیوں کی معیت میں ہوائی جہاز پر جا بیٹھا۔ وہ سوویت یونین فرار ہونا چاہتا تھا۔ مگر طیارہ پراسرار طور پر راستے میں گر کر تباہ ہو گیا۔

ماؤزے تنگ کے ساتھی پھر چینی افواج میں باغیوں کو تلاش کرنے لگے۔ ایک ماہ کے اندر اندر ''ایک ہزار اعلیٰ چینی فوجی افسر'' گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں غداری کی سزا...... موت ہی ملی۔ یوں چینی حکومت کی ساری توانائی بغاوت فرو کرنے پر لگی رہی اور بھارت کو مشرقی پاکستان میں من مانی کرنے کا موقع مل گیا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے، سوویت یونین کی طرح چین بھی مسئلہ مشرقی پاکستان کا سیاسی تصفیہ چاہتا تھا۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں چینی وزیراعظم چواین لائی نے جنرل یحییٰ خان کو یہ پیغام بھیجا: ''مشرقی پاکستان میں عسکری مہم کو شدید نہ بنائیے۔ بنگالیوں کے ساتھ تعلقات بہتر کیجیے اور مسئلے کا سیاسی حل نکالیے۔ مشرقی پاکستان میں طویل بدامنی سے فائدہ اٹھا کر بھارت حملہ کر سکتا ہے۔''

اوائل نومبر ۷۱ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے چین کا سرکاری دورہ کیا۔ چینی حکومت نے مہمانوں کو یقین دلایا کہ بھارتی حملے کی صورت پاکستان کو ہر ممکن امداد دی جائے گی۔ تاہم حقیقت میں چینی حکومت درج بالا داخلی مسائل کی وجہ سے پاک بھارت جنگ میں کوئی عملی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں تھی۔

باغی جرنیل لن باؤ، ماؤزے تنگ کے ساتھ

جنگ کی راہ ہموار

اس زمانے میں برجیش مشرا چین میں بطور بھارتی سفیر تعینات تھے۔ انھوں نے اپنی حکومت کو یہ خفیہ رپورٹ بھجوائی کہ چین پاک بھارت جنگ میں مداخلت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پہ اندرا حکومت نے آخر کار مشرقی پاکستان پر دھاوا بولنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب جنگ کی راہ ہموار ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر سری ناتھ رگھوان نے اپنی کتاب میں ایک ایسی سچائی بھی بیان کی ہے جو بھارتی حکمران طبقے کو بہت تلخ لگی ہوگی۔ وہ یہ کہ سرکاری طور پر بھارت کی پالیسی یہ ہے

کہ جنگ کا آغاز پاکستان نے کیا تھا۔ اس طرح کہ ۳ دسمبر ۷۱ء کو پاکستانی طیاروں نے مغربی بنگال میں بھارتی عسکری ٹھکانوں پر بم باری کر دی۔ جواب میں اگلے دن بھارت نے پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

لیکن حقیقت کیا ہے؟ ڈاکٹر رگھوان لکھتے ہیں: ''بھارتی فوج ۲۱ نومبر ہی کو مشرقی پاکستان میں داخل ہو چکی تھی۔ اس دوران بھارتی فوجی سرحدی علاقوں میں مورچے بنانے لگے۔ اندرا حکومت نے ۴ دسمبر کو اعلان جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن پاکستانی حکومت بھارت کی دراندازی سے تنگ آچکی تھی۔ سو ۳ دسمبر کو پاکستانی طیارے حملہ آور ہو گئے۔

''اس کارروائی پر بھارتی قیادت نے سکون کا سانس لیا کیونکہ اب بھارت عالمی برادری کو کہہ سکتا تھا کہ جنگ کا آغاز پاکستان نے کیا ہے۔ حقیقت میں پہل بھارت کی جانب سے ہوئی۔''

سقوطِ مشرقی پاکستان کے عوامل

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکست کا ذمے دار فوج کے جوانوں کو خصوصاً نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ پاک فوج کی بدقسمتی کہ کئی عوامل اکٹھے ہو کر اس کی ہار کا باعث بن گئے۔

مثال کے طور پر پاک فوج پورے مشرقی پاکستان میں بکھری ہوئی تھی۔ پھر بھارتی فوج نے بڑی تیزی و پھرتی سے حملہ کیا۔ بھارتیوں کو بنگالی عوام کی بھی مدد حاصل تھی جو پاکستانی حکمران طبقے سے نفرت کرنے لگے تھے۔ سونے پر سہاگا اس وقت مشرقی پاکستان میں پاک فوج کی قیادت نااہل کمانڈر کے ہاتھوں میں تھی۔ غرض منفی عوامل کا مجموعہ پاک فوج کی شکست کا باعث بن گیا۔ ورنہ کئی محاذوں پر پاک فوج کے جوانوں نے ایسی بے مثال شجاعت کا ثبوت دیا کہ دشمن بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

افسوس کہ چین کی طرح امریکا بھی پاکستان کی کوئی ٹھوس مدد نہیں کر سکا۔ بس صدر نکسن کے حکم پر امریکی طیارہ بردار جہاز، انٹرپرائز خلیج بنگال میں چلا آیا۔ لیکن اسی دوران سوویت یونین نے اپنی افواج متحرک کر دیں۔

مورخین نے لکھا ہے کہ سوویت افواج کے متحرک ہونے پر صدر نکسن اور وزیر خارجہ، ہنری کسنجر کے درمیان طویل گفت و شنید ہوئی۔ کسنجر چاہتا تھا، سوویت حکومت کو ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دی جائے۔ مگر صدر نکسن یہ ''آرماگیڈون'' چھیڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ چناں چہ اپنی طاقت دکھانے کے لیے انٹرپرائز بھیجنے کو کافی سمجھا گیا۔

جنرل نیازی شکست کے دستاویز پر دستخط کرنے جاتے ہوئے

سقوطِ مشرقی پاکستان ہماری قومی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ یہ افسوس ناک واقعہ حقیقتاً غیروں کی سازشوں سے زیادہ حکمرانوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کے باعث انجام پایا۔ اگر پاکستانی حکمران بیدار مغز، اہل اور ذاتی تمناؤں سے ماورا ہوتے، تو عین ممکن تھا کہ آج متحدہ پاکستان خطے کی بڑی طاقت بن چکا ہوتا۔ ◆●●

کچھ عرصہ قبل ایک امریکی کمپنی نے "فرضی ملازمت" کے سلسلے میں مختلف لوگوں سے درخواستیں طلب کیں۔ ملازمت کے لیے کئی لوگوں نے آن لائن درخواستیں جمع کرائیں، جن میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی شامل تھیں۔ پھر ویڈیو کال کے ذریعے امیدواروں سے انٹرویو کیے گئے۔ اس کے بعد کمپنی نے سبھی انٹرویو انٹرنیٹ اور فیس بک پر اپ لوڈ کر دیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ انھیں دیکھ سکیں۔ اس فرضی ملازمت کی شرائط یہ تھیں:

۱۔ دن میں چوبیس گھنٹے لگاتار کام کرنا ہے۔

۲۔ اس دوران آرام کرنا تو کجا کھانے پینے کا بھی کوئی وقفہ نہیں کرنا۔ کام کے دوران ہی کھانا پینا ہوگا۔

۳۔ پورے مہینے کوئی چھٹی نہیں ہوگی۔ یعنی مہینے میں تیس دن مسلسل کام کرنا ہوگا۔

۴۔ حتیٰ کہ پورے سال میں کسی دن کوئی چھٹی نہیں ہوگی، چاہے کتنا ہی خاص دن آ جائے۔ یعنی سال میں ۳۶۵ دن مسلسل کام کرنا ہے۔

۵۔ کسی قسم کا کوئی مالی معاوضہ بھی نہیں دیا جائے گا۔

سبھی درخواست دہندگان یہ شرائط سن کر چونک پڑے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان شرطوں پر تو کوئی بھی کام نہیں کر سکتا۔ ایسا کون ہے جو مسلسل چوبیس گھنٹے کام میں محو رہے، سال میں کوئی چھٹی نہ کرے اور پھر اس پر کوئی معاوضہ بھی نہ لے؟

کمپنی کے نمائندوں نے جواب دیا "اس وقت

ہے کوئی مائی کالال جو کر سکے

چوبیس گھنٹے کی ملازمت

اور بدلے میں کبھی چھٹی کرے نہ کسی قسم کا معاوضہ لے؟

حافظ محمد زاہد

کروڑوں انسان یہ نوکری کر رہے ہیں۔“

درخواست دہندگان نے غیر یقینی کیفیت میں پوچھا کہ وہ کون ہیں؟

کمپنی کے نمائندے نے جواب دیا ”مائیں“ جو اپنے بچوں کے لیے دن رات کام کرتی ہیں۔ بغیر کسی مالی معاوضے کے مسلسل چوبیس گھنٹے، لگاتار تیس دن اور سال میں مسلسل ۳۶۵ دن اپنی ممتا کی ذمے داریاں بطریق احسن نبھا رہی ہیں۔“

☆☆

قارئین! یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ماں اپنے بچوں کی پرورش، دیکھ بھال، تعلیم و تربیت اور ان کے اچھے مستقبل کے لیے ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔ بیماری میں بھی اسے اپنے سے زیادہ بچوں کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ماں کے بچوں پر اس قدر احسانات ہوتے ہیں کہ ان کا بدلہ اُتارنا اولاد کے بس کی بات نہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بچے جب اپنے پیروں پر کھڑے ہوں، تو ماں کے احسانات یاد رکھتے ہوئے روزانہ ان کی خدمت میں مصروف رہتے۔ اسلامی تعلیمات بھی ہمیں سکھاتی ہیں کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ مگر مغربی معاشرے نے ماں اور ساتھ ساتھ باپ جیسے عظیم رشتوں کی قدر نہ کی۔

اب وہاں حالات یہ ہیں کہ والدین بوڑھے ہونے تک کام کرتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یا تو تنہا کسی گھر میں یا پھر اولڈ ایج ہومز میں بقیہ زندگی گزارتے ہیں۔ اس دوران سالہا سال تک بچے والدین سے ملنے نہیں آتے۔ اسی سرد مہری اور مقدس رشتوں کی ناقدری کی بنا پر مغربی معاشروں میں علامتی طور پر ’مدر ڈے‘ اور ’فادر ڈے‘ نے رواج پکڑا۔ ان معاشروں میں سارا سال والدین تنہا رہتے ہیں۔ بس ایک دن بچے والدین کے لیے وقت نکال ان سے ملنے چلے جاتے ہیں۔

مدر ڈے کے موقع پر امریکا سمیت پورے یورپ میں یہ رواج ہے کہ اس دن لوگ اولڈ ہومز میں مقیم اپنی ماؤں سے ملاقات کرتے اور انھیں مختلف کارڈ اور سرخ پھول پیش کرتے ہیں۔ اس سے بوڑھی مائیں بچوں کو دیکھ کر خوش ہو جاتی ہیں۔ بچوں کا ضمیر بھی مطمئن ہو جاتا ہے کہ ہم نے مدر ڈے پر اپنی ماں کو پسندیدہ کارڈ، پھول اور کچھ دوسرے تحائف دے اور اُن کے ساتھ کچھ وقت گزار کر حقوق ادا کر دیے۔ مغربی معاشروں میں رہنے والے ان بے ادبوں کو کم از کم یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ماں تو دن رات میں چوبیس گھنٹے، مہینے میں تیس اور سال میں ۳۶۵ دن اپنی اولاد کی خدمت کرتی ہے...... کیا اس کی خدمات کا بدلہ بس ایک دن ملاقات اور تحفے دے کر چکایا جا سکتا ہے؟

اس حوالے سے نہایت افسوس ناک بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے اثرات بد اب ہماری تہذیبی قدروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکے۔ ہمارے ہاں بھی بہت سے لوگ ”مدر ڈے“ پر ہی اپنی ماؤں سے ملتے اور یہی سمجھتے ہیں کہ ایک دن ماں کے ساتھ گزار کر سارا سال ہم ان کے حقوق سے آزاد ہو گئے۔ مغربیت کے زیر اثر اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں بھی اولڈ ہومز بن رہے ہیں۔ ان میں اولاد کی محبتوں کے ٹھکرائے ہوئے بوڑھے والدین اپنی زندگی کی گھڑیاں پوری کرتے ہیں۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اولڈ ہومز کا بننا یہی تاثر دیتا ہے کہ اب ہمارے ہاں بھی والدین کے حقوق اور دیکھ بھال سے غفلت عام ہو چکی۔ والدین کی نافرمانی بڑھ رہی ہے۔ ماں باپ ساری زندگی اپنے بچوں کو پالتے اور اپنی جوانیاں ان کے بہترین مستقبل کی خاطر بِتاتے ہیں۔ والدین کے لیے یہ بات کسی قیامت سے کم نہیں ہوتی کہ بڑھاپے میں بچے ان سے تنگ آ کر انھیں اولڈ ہومز بھیج دیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیشہ ہمیں ان کا فرمانبردار بنائے رکھے۔ (آمین)

◆◆◆

ہمارے باپ چل بسے

زندہ ہیں قائداعظمؒ

چالیس کروڑ غلاموں کو آزادی کی نعمت سے سرفراز کرنے والے راہنما کے جیتے جاگتے واقعات

منظور حسین عباسی

ہمارے قائد کے ساتھ مختلف لوگوں کا تعلق رہا ہے۔ انھوں نے قائداعظمؒ کی شخصیت و کردار سے متعلق بہت سی کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے۔ اس مضمون میں صرف وہی اقتباسات پیش ہیں جو قائداعظمؒ کی ایک زندہ اور متحرک تصویر پیش کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ اس سلسلے میں مطبوعہ مواد سے استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جناح کیپ کا پہلا دن

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد ازسرِنو توانا مسلم لیگ کا پہلا عظیم الشان اجلاس ۱۵ تا ۱۸ اکتوبر تک لکھنو میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی شان و شکوہ اور اس کے لیے جو پرتکلف انتظامات کیے گئے، ان کا سہرا راجا صاحب محمود آباد کے سر ہے۔ انھوں نے تمام شرکا اجلاس کی میزبانی ایسے طریقے سے انجام دی جسے ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے والے اب تک نہیں بھولے۔ اس بڑے پنڈال کو جس میں کھلا اجلاس منعقد ہوا، دل کش انداز میں سجایا گیا تھا۔ اپنے راہنما محمد علی جناح اور ان کے سرکردہ پیروؤں کی تقریریں سننے کے لیے پچاس ہزار سے زائد لوگ جمع تھے۔

مسٹر جناح محمود آباد ہاؤس قیصر باغ میں مقیم تھے۔ پہلے روز جلسہ عام شروع ہونے سے ایک گھنٹا پہلے راجا صاحب، چودھری خلیق الزماں اور راقم مسٹر جناح کی قیام گاہ میں اس دن کے پروگرام پر نظر ڈالنے کی غرض سے جمع تھے۔ نواب اسمٰعیل خاں بھی اس

دیوان خانہ نما برآمدے میں ہمارے ساتھ آ ملے۔ وہ حسبِ معمول بالکل بے عیب لباس میں ملبوس اور ایک سیاہ سموری ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔

مسٹر جناحؒ نواب صاحب کی اس ٹوپی کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھنے لگے کہ کیا وہ اسے تھوڑی دیر کے لیے دے سکتے ہیں؟ نواب صاحب نے روایتی خوش خلقی سے ٹوپی جناح صاحب کو دی اور اُن سے اسے پہننے کی درخواست کی، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ٹوپی پہن کر وہ کیسے لگتے ہیں۔ مجھے یاد ہے مسٹر جناح نے اُسے پہن لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ہم لوگ اس کی تعریف کر رہے ہیں تو وہ اٹھ کر قریبی خوابگاہ میں چلے گئے اور وہاں ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہماری رائے کا محاسبہ کرنے لگے۔

دو منٹ بعد برآمدے میں واپس آئے۔ ہم میں سے کسی نے یہ تجویز دی کہ وہ یہ ٹوپی پہنے رہیں اور اسی طرح اجلاس میں جائیں۔ انھوں نے یہ تجویز مان لی اور ہم سب جلسے میں چلے گئے۔ مجھے وہ مجمع ابھی تک یاد ہے۔ لوگوں کے مسکراتے چہرے اب تک نظر آتے ہیں اور وہ زور و شور کی تالیاں اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بھی جو مسٹر جناح کے داخل ہوتے وقت پنڈال کی فضا میں گونج اٹھے تھے۔ ڈائس، کرسیوں اور دریوں پر جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے، وہ سب سرگوشی کے انداز میں یا باآواز بلند ٹوپی اور شیروانی کی جسے مسٹر جناح ایسی کسی تقریب میں پہلی مرتبہ زیبِ تن کیے ہوئے تھے، تحسین و آفرین کرنے لگے۔ اس سے انھیں خود بھی اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی باقی ہم سب کو۔

لکھنؤ اجلاس ختم ہونے سے پہلے ہی شہر کے بہت سے نوجوان اور معمر لوگ یہ ٹوپی پہننے لگے جو قائداعظمؒ کی بدولت راتوں رات مقبول ہو گئی تھی۔ کلاہ ساز بھی اس مقبولیت سے فائدہ اٹھانے میں پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اصلی قراقلی اور نقلی کھال کی ٹوپیاں بنانا شروع کر دیں۔

ہندوستان کی مسلم قوم نے بہت ہی قلیل عرصے میں یہ ٹوپی اختیار کر لی۔ چناں چہ مدورا کے مسلمانوں میں بھی یہ ایسی ہی مقبول ہوئی جیسی مردان کے رہائشیوں میں۔

(ابوالحسن اصفہانی)

ہم سب کو بہت کام کرنا ہے

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے حضرت قائداعظمؒ کی خدمت میں متعدد بار باریابی کا موقع ملا۔ یہ محض رسمی نہ تھی، بعض انتہائی اہم معاملات کے ضمن میں تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی تین باتوں نے بہت متاثر کیا۔ ایک تو ان کی ذہانت اور پیچیدہ ترین معاملے کی تہ تک پہنچ جانے کی خداداد صلاحیت، دوسرے لگی لپٹی اور ذہنی تحفظات کے بغیر اظہارِ خیال بھی ان کی شخصیت کا ایک مسلمہ پہلو تھا۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد مسئلہ زیرِ بحث پر ان کی رائے کے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہتا تھا۔

تیسری بات وقت کے بارے میں ان کا شدید احساس تھا۔ وہ تضییع اوقات کو ناقابلِ معافی جرم سمجھتے تھے۔ میں ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں ان سے ملنے کراچی سے زیارت پہنچا۔ کوئٹہ تک کا ہوائی سفر اور پھر وہاں سے زیارت کا پہاڑی راستہ طے کر کے میں تھک چکا تھا۔ قائداعظمؒ نے غور سے میری بات سنی، پانچ ہی منٹ میں اس کا قطعی جواب دیا اور مجھے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ چلتے وقت مجھ سے پوچھا "کیا سیدھے واپس جاؤ گے؟"

میرے اثبات میں جواب دینے پر فرمایا "ٹھیک ہے

ہم سب کو بہت کام کرنا ہے۔ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" میرا ارادہ زیارت میں دو چار گھنٹے قیام کرنے کا تھا۔ لیکن یہ سن کر میں فوراً ہی واپس چلا آیا۔

(نواب مشتاق احمد خان)

مسلم لیگ کی جمہوری حیثیت

۱۹۳۶ء کے لکھنؤ اجلاس میں، میں نے ان کو پہلی بار دیکھا۔ وہ اجلاس کی منتخبہ کمیٹی کی صدارت کر رہے تھے۔ اراکان کمیٹی کو جھگڑتا دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کی نشست تو شاید مہینوں میں بھی ختم نہ ہو۔ مگر قائداعظمؒ کی طرف جب نگاہ اٹھتی تو میں انھیں نہایت متانت سے بیٹھے پاتا۔ جب لوگ اپنے نظریے پیش کر لیتے تو قائداعظمؒ کھڑے ہوتے اور چند ہی لفظوں میں تمام مقررین کے اعتراضات اور خدشات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا نظریہ مختصر الفاظ میں پیش کر کے پوچھتے: "کچھ اور کہنا ہے آپ لوگوں کو؟" سب کہتے "کچھ نہیں۔" اور قرارداد بالاتفاق رائے منظور ہو جاتی۔

اس کمیٹی میں ایک قرارداد پر مولانا حسرت موہانی مرحوم اڑ گئے۔ قائداعظمؒ کو یقین تھا کہ مولانا اس قرارداد کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھے۔ مگر مولانا کی دشمنی مول لینا اور ان پر دباؤ ڈالنا منظور نہ تھا۔ چناں چہ وہ کھڑے ہوئے اور ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ مولانا سے مخاطب ہو کر کہا:

"مسلم لیگ جمہوری حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کمیٹی میں مولانا سمجھتے ہیں کہ انھیں شکست ہو گئی تو آئندہ اجلاس کا انتظار کریں اور اس فیصلے کو بدلوانے کی کوشش کریں۔"

مولانا کی طبیعت چونکہ خود جمہوریت پسند تھی۔ انھوں نے قائداعظمؒ کی اس تجویز کو مان لیا۔

(مطلوب الحسن سید)

خدایا میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے

عام غریب مسلمان جناح کو کیا سمجھتے تھے مجھے اس کا اندازہ ۱۹۴۶ء میں ہوا جب محمد علی جناح لندن کے مشرقی حصے کی ایک مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے انھیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے آگے بیٹھ سکیں۔ اگرچہ خود انھوں نے آخری صف ہی میں بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا کہ میں دیر سے آیا ہوں اور کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔

نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انھیں گھیر لیا۔ وہ محمد علی جناح کو قریب سے دیکھنا اور ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ ان میں کچھ اپنی چھوٹی چھوٹی کاپیوں میں ان کے دستخط لینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔ یہ خلوص اور عقیدت کا ایک بے مثال مظاہرہ تھا۔ ایک شخص پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی "اے خدایا میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔"

یہ سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا، کوئی ملاح تھا' کوئی چھوٹا دکاندار، کوئی خوانچہ فروش۔ جناح صاحب نے نماز کے لیے یہ مسجد خود منتخب کی تھی۔ ان کا ارشاد تھا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے سے خاص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔

(ممتاز حسن)

باترتیب نجی زندگی

ہم اکثر دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھاتے۔ یہ اتفاق اس لیے بھی پیش آتا کہ میرا کاروبار سیکرٹریٹ کی عمارت کے بالکل سامنے تھا۔ قائداعظمؒ کو کھانے میں کوئی خاص غذا مرغوب نہ تھی۔ ہاں پاپڑ کھانے کے بہت شوقین تھے وہ بھی ایسے جن میں مرچیں کم ہوں۔ قائداعظمؒ صرف

سیاسی زندگی ہی میں اصول اور نظم و ضبط کے پابند نہ تھے۔ نجی زندگی بھی بڑی باترتیب تھی۔

یہ نظم و ضبط ہی تھا کہ ڈھیروں دولت کمانے کے باوجود کوئی اخلاقی برائی ان کے قریب نہ پھٹکی۔ خود تو کسی برائی میں کیا ملوث ہوتے' برے آدمی کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیتے۔ جس شخص کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ کسی علت کا شکار ہے' اس سے نفرت کرتے۔

قائد کو بس ایک ہی عادت تھی اور وہ یہ کہ سگار بہت پیا کرتے۔ بلاشبہ اس زمانے میں ان کے دوستوں میں ہندو بھی تھے۔ جس دوست' گوپل داس کے توسط سے میری محمد علی جناح سے ملاقات ہوئی' وہ ان کا بھی دوست تھا۔ ملاحظہ کریں ان کا وہ ہندو دوست بھی کس کردار کا مالک تھا۔ وہ شخص ایک کاروبار کرتا تھا کہ اُس کا دیوالیہ ہو گیا۔ وہ جاپان چلا گیا۔ اس نے جن سے قرض لیے' اُن کی پائی پائی ادا کر دی۔ ۳۳ کروڑ روپیہ کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ اس شخص کی مثال میں اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ کو پتا چل جائے' قائداعظمؒ کے حلقۂ احباب میں اعلیٰ کردار کے لوگ تھے۔

(اے بی اکرم)

وائی ایم سی اے کی مثال

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا' تو قائداعظمؒ نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اسمبلی کا یہ اجلاس کراچی میں ان کی پہلی سرکاری مصروفیت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ فضا قائداعظمؒ زندہ باد' پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی اور میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔ اس دل افروز منظر سے قائداعظمؒ بھی متاثر ہوئے۔ انھوں نے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''ہمارے پاس انسانی قوت کا کتنا شاندار سرمایہ ہے۔ اگر ہم اس کے جوش کو صحیح راہوں پر لگا سکیں، تو پاکستان یقیناً دنیا کی نمایاں مملکتوں میں سے ایک ہوگا۔''

اب ہم اسٹریچن روڈ پر وائی ایم سی کی عمارت کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس عمارت کو دیکھ کر قائداعظمؒ نے فرمایا: ''وائی ایم سی اے تنظیم کی ایک بڑی اچھی مثال ہے۔ تھوڑے سے آدمیوں نے دنیا کے کونے کونے میں اس کی شاخیں قائم کر لی ہیں۔'' اس کے بعد باتوں باتوں میں قائداعظمؒ پارسیوں کے متعلق فرمانے لگے کہ یہ تھوڑے سے لوگ محض اپنی جانفشانی اور تنظیم کی بدولت عزت اور دولت دونوں کے مالک ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے لوگوں کو صحیح تربیت دے کر منظم کر سکیں تو ہم حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔''

> ''ہمارے پاس انسانی قوت کا کتنا شاندار سرمایہ ہے۔ اگر ہم اس کے جوش کو صحیح راہوں پر لگا سکیں، تو پاکستان یقیناً دنیا کی نمایاں مملکتوں میں سے ایک ہوگا۔''

(فرخ امین)

انسانی کردار کی انتہائی پستی

قائداعظمؒ سے میرے تعلقات محض ایسے نہیں تھے جو گورنر جنرل اور اس کے اسٹاف کے درمیان ہونے چاہئیں۔ بے تکلفی کے لمحوں میں قائداعظمؒ شفقت اور کرم کا مجسّمہ ہوتے۔ اکثر مجھے یہ سعادت نصیب ہوتی کہ وہ مجھ سے اپنے خیالات اور رجحانات کے متعلق فرمانے لگتے۔

ہم لوگ لاہور میں تھے۔ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں داخل ہو گئی تھیں۔ اسی زمانے میں قائداعظمؒ ایک دن فرمانے لگے

کہ مسلمان قوم کی ایک بہت بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں کو ہم ہی میں سے ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو آسانی سے ان کے آلۂ کار بن جائیں۔ ایک اور موقع پر زیارت میں ایسے مسلمان گفتگو کا موضوع بن گئے جنھوں نے جنگ کے زمانے میں جنگی ملازمتیں کر لیں اور اپنے انگریز افسروں کو خوش کرنے کی امید میں شراب نوشی کے عادی بن گئے۔

اس سلسلے میں قائداعظمؒ نے فرمایا:

''یہ انسانی کردار کی انتہائی پستی ہے کہ وہ ایسی رکیک حرکتیں کر کے دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اسے قابلیت کے ساتھ اور اچھی طرح انجام دیں۔ دیر یا سویر ان کی محنت کا انعام ضرور ملتا ہے۔ کوئی آقا یا حکومت کسی مستحق ملازم کو ترقی حاصل کرنے سے ہرگز نہیں روک سکتی۔ اگر سرکاری ملازم اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اونچے مرتبے یا ترقی حاصل کرنے کے لیے سفارشوں اور سازشوں سے کام لینا چھوڑ دیں تو اعزہ پروری اور دوست نوازی کا خاتمہ ہو اور ہماری سیاسی زندگی کہیں زیادہ صحت مند عناصر سے معمور ہو جائے۔''

غیر معروف وکیل کا رُعب

۱۹۰۳ء کا ایک ایسا واقعہ جب کہ وہ ابھی غیر معروف وکیل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے ان کے لیے کافی اہم ثابت ہوا۔ بمبئی ہائیکورٹ میں کسی بہت بڑے مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ بمبئی میونسپل کارپوریشن کے پریذیڈنٹ مسٹر میکڈانلڈ کو بھی جگہ نہ ملنے کی وجہ سے وکیلوں کی مخصوص جگہ میں ایک کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ ان دنوں انگریز افسروں کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ مسٹر جناح جب آئے تو کہیں جگہ نہ پا کر سیدھے مسٹر میکڈانلڈ کے پاس پہنچے اور ان سے کرسی خالی کرنے کے لیے کہا۔

ان کے انکار پر مسٹر جناح بہت برہم ہوئے اور عدالت کے سررشتہ دار سے مسٹر میکڈانلڈ کو وکیلوں کی مخصوص جگہ سے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ وہ بچارہ بہت پریشان ہوا۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھی تو آپ نے کہا کہ اگر تم نے مسٹر میکڈانلڈ کو جگہ خالی کرنے کے لیے نہ کہا تو میں جج سے تمھاری شکایت کر دوں گا۔ وہ مجبوراً مسٹر میکڈانلڈ کے سامنے حاضر ہوا اور انھیں جگہ خالی کرنی پڑی۔ اٹھتے ہوئے انھوں نے مسٹر جناح کا نام پوچھا۔ وہ جناح صاحب سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھیں ایک ہزار روپیہ ماہوار پر کارپوریشن کا قانونی مشیر مقرر کر لیا اور ساتھ ہی پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت بھی دی۔

دنیا کا مصروف ترین انسان

میں نے قائداعظمؒ کے موٹر ڈرائیور کی حیثیت سے زندگی کے پانچ اہم سال گزارے۔ ان پانچ برسوں میں، میں نے بہت کچھ سیکھا۔ مجھ پر یہ راز بھی کھلا کہ صحیح معنوں میں قوم کی راہنمائی کرنا کتنا مشکل ہے۔ میں نے قائداعظمؒ کو رات ڈھلے تک کام کرتے دیکھا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ لیکن جیسے ہی انھیں کسی کام کا خیال آیا وہ فوراً بستر سے اٹھ کر کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے قومی کاموں میں انھیں جس قدر منہمک پایا۔ اسے پیش نظر رکھتے ہوئے میں یہ کہتا ہوں: ''وہ مغرور نہیں بلکہ مصروف انسان تھے، غالباً دنیا کے مصروف ترین انسان۔''

(محمد حنیف آزاد)

غریب قوم کے کارکن

پیرزادہ محمد ذکا اللہ مرحوم و مغفور نے جو تقسیم سے پہلے

شملے کے ایک سرگرم مسلم لیگی کارکن تھے مجھ سے فرمایا کہ جب قائداعظمؒ نے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی تحریک شروع کی، تو ان کے ساتھ بہت کم آدمی تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کچھ ایسے آدمیوں کو مسلم لیگ میں لانا چاہیے جو عوامی مجمعوں میں تقریر کرنے کے عادی ہوں۔ طویل عرصہ کوشش کے بعد میں نے ایک مشہور و مقتدر غیر مسلم لیگی کو مسلم لیگ میں داخل ہونے پر راضی کر لیا۔ مگر شرط یہ تھی کہ لیگ ان کے گزارے کے لیے سو روپے ماہوار انھیں دیا کرے۔

میرا خیال تھا کہ انھوں نے اس قدر کم رقم مانگنے میں بڑے ایثار کا ثبوت دیا۔ خوشی خوشی جناح صاحب کے پاس پہنچا اور کہا کہ دیکھیے قسمت نے یاوری کی ہے اور ایک مشہور و معروف کانگریسی کارکن جو ایک خوش بیان مقرر بھی ہے، مسلم لیگ میں آنے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے لیے فقط سو روپے ماہانہ کا بندوبست کر دیں۔ اب آپ اجازت دیں تو معاملہ فوراً طے ہو جائے اور اگر ضروری ہوا تو ہم لوگ اس رقم کا بار لیگ کے مرکزی فنڈ پر بھی نہیں ڈالیں گے۔ خود ہی انتظام کر لیں گے۔ آپ کے کہنے کی دیر ہے۔

پیرزادہ صاحب مرحوم کا بیان ہے، قائداعظمؒ میری بات سن کر مطلقاً خوش نہیں ہوئے بلکہ بلاتوقف کہہ دیا ''مجھے افسوس ہے کہ میں اس تجویز سے متفق نہیں۔ میں نے کہا جناب میں تو سمجھا تھا کہ میں ایک اہم مژدہ لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں اور آپ میری تجویز کا خیرمقدم کریں گے۔ آخر آپ کے پاس کارکن ہیں ہی کتنے اور ان میں سے بھی کتنے ایسے ہیں جو عام مسلمانوں پر اثر ڈال سکتے ہیں؟

جناح صاحب نے کہا ''دیکھو میاں! تمھاری تجویز میں اس لیے منظور نہیں کر سکتا کہ یہ کام مسلمانوں کا اپنا کام ہے اور اسے کرنے کے لیے کسی مسلمان کو رشوت دینا میرے نزدیک قطعاً ناجائز ہے۔ اگر آپ کے دوست واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں مسلم لیگ میں آ کر کام کرنا چاہیے، تو اس کے لیے شرطیں ٹھہرانا کیا معنی؟ دوسرے ہم ایک غریب قوم ہیں۔ آپ کے دوست ہم سے صرف ایک سو روپیہ مانگتے ہیں۔ اگر ہم ان کی شرط منظور بھی کر لیں، تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قومیں انھیں اس سے زیادہ رقم دے کر دوبارہ ہم سے نہیں چھڑا لیں گی؟ تم ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ اگر وہ ہم میں شامل ہو جائیں، تو ہم دل و جان سے ان کا استقبال کریں گے۔ جو روکھی سوکھی ہمیں میسر ہے، اس میں وہ بھی ہمارے حصہ دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ پیشگی کوئی شرط طے کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ جہاں ہیں، وہیں رہیں۔''

(ممتاز حسن)

> میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔''

وزیراعظم تقریب میں کھڑے رہے

مجھے قائداعظمؒ کے ایک جانثار سپاہی نے بتایا، قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد اسٹیٹ بینک کا افتتاح ہوا۔ قائداعظمؒ اس تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر تشریف لائے، لیکن کئی وزرا اور سرکاری افسران نے ابھی تک تقریب گاہ میں قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا۔ ان میں وزیراعظم لیاقت علی خاں بھی شامل تھے۔ اگلی رو کی کئی کرسیاں جو بڑے افسران اور وزرا کے لیے مخصوص تھیں، خالی پڑی تھیں۔

یہ دیکھ کر قائداعظمؒ کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ انھوں نے کارروائی شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ تقریب گاہ میں موجود تمام خالی کرسیاں اٹھالی جائیں تا کہ جو حضرات بعد میں آئیں' انھیں کھڑا رہنا پڑے۔ اس طرح انھیں پابندیٔ وقت کا خیال رہے گا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔

تقریب شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد جناب لیاقت علی خاں تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ چند دوسرے وزرا بھی تھے۔ لیکن کسی شخص کو ان کے لیے کرسی لانے یا پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ تقریب کے دوران لیاقت علی خاں اور ان کے کئی رفقا کھڑے رہے۔ ان کا مارے شرمندگی اور خجالت کے بُرا حال تھا۔ قائداعظمؒ روانہ ہونے لگے تو ان حضرات نے دیر سے آنے پر بڑی معذرت کی۔ اس واقعہ کے بعد کسی مقتدر شخص کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ تقریب میں دیر سے آئے۔

بے ایمانی کے بجائے ہار جانا بہتر

۴۵۔۱۹۴۶ء کے انتخابات میں سندھ اسمبلی میں مسلمانوں کی ۳۵ نشستیں تھیں۔ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے امیدواروں کی مدد کے لیے سات ارکان کی ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی اور مجھے اس کا اعزازی سیکرٹری بنایا۔ انھوں نے کمیٹی کے ارکان کو وضاحت سے بتایا کہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں سندھ ایک اہم صوبہ ہے۔ اس لیے ہمیں ۳۵ کی ۳۵ نشستیں حاصل کرنی چاہئیں تا کہ یہاں مسلم لیگی وزارت بنائی جا سکے۔

پولنگ سے قریباً چار ہفتے پہلے قائداعظمؒ کراچی تشریف لائے اور مجھے صحیح صورت حال بتانے کے لیے کہا۔ جب میں نے بتایا کہ ہم شاید پانچ نشستیں نہ جیت سکیں تو وہ پریشان سے ہو گئے کیونکہ سندھ اسمبلی میں کل ساٹھ نشستیں تھیں۔ آخر میں نے عرض کیا کہ چار نشستوں کا معاملہ تو زیادہ مشکل نہیں البتہ پانچویں نشست جہاں جی ایم سید کھڑے ہیں، حاصل کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔

انھوں نے غصے سے میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا: آخر اس حلقے میں ہمیں کامیابی کیوں نہ ہو گی؟ میں نے وضاحت کی' جی ایم سید اپنے ضلع کے انتہائی بااثر شخص ہیں۔ وہ ضلع دادو کے پیر ہیں اور ان کے مریدوں کا بہت بڑا حلقہ ہے۔ ان کے مقابلے میں ہمارے امیدوار قاضی محمد اکبر حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ جی ایم سید کے حامی پروپیگنڈا کرتے پھر رہے ہیں کہ قاضی اکبر باہر کے آدمی ہیں۔ قائداعظمؒ نے فرمایا:

''میں جی ایم سید کی نشست کو انتہائی اہم سمجھتا ہوں اور قاضی اکبر کو بہرطور یہ انتخاب جیتنا ہے۔ تم اس حلقے میں لٹریچر کی بارش کر دو۔ کارکنوں کی فوج بھیج دو۔ جلسے کرو اور قاضی اکبر کو انتخابی مہم کے لیے ہر قسم کی سہولت مہیا کرو۔ لیکن یہ بات یاد رکھو' انتخاب جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہ دی جائے۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔''

(جی الانا)

قول و فعل

واجد علی نے مجھے بتایا کہ ایک روز قائداعظمؒ نے کہا: ''کیا بتایا جائے، ڈاک میں اتنی تعداد میں خطوط آتے ہیں کہ ان کے جوابات دینے میں خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔''

واجد علی نے جواب میں عرض کیا ''آپ حکم دیں تو

میں حاضر ہو جایا کروں۔ خطوط کا جواب آپ کی ہدایت کے مطابق لکھ دیا کروں گا۔"

اس پر قائداعظمؒ نے فرمایا: "تم ایک بات بھول رہے ہو کہ یہ خط جناح کے نام آتے ہیں اور کسی کے نام نہیں۔"

یہ نکتہ بعد میں غور و فکر سے سمجھ میں آیا کہ ہر خط لکھنے والے کا یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جس کو خط کے ذریعے مخاطب کرے، وہی اس کا جواب دے۔

(فقیر سید وحید الدین)

معمولی آدمی

۲۴ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو وارڈ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے چند کارکن قائداعظمؒ کے دولت خانے پر ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دینے گئے۔ ان میں سے ایک شخص نے مصافحہ کرتے ہوئے جوشِ عقیدت سے آپ کا ہاتھ چوم لیا۔ یہ حرکت دیکھ کر قائداعظمؒ نے فرمایا: "لوگوں کو چاہیے کہ وہ مجھے آدمی تصور کریں، پیرومرشد نہ سمجھ لیں۔ اس طرح لوگوں میں غلط اور تباہ کن طریقہ پر سر جھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے جسے عرفِ عام میں شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ یہ مرض نقصان دہ، مضرت رساں، ناروا اور ناجائز ہے۔"

(روزنامہ انقلاب بمبئی۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء)

دس کروڑ مسلمانوں کا تنہا وکیل

۴۴۔۱۹۴۵ء میں، میں کسی سرکاری کام سے بمبئی کے دورے پر گیا۔ وہاں اپنے عزیز سید واجد علی کے یہاں مقیم ہوا۔ واجد علی اکثر و بیشتر قائداعظمؒ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اندازہ ہوا کہ وہ ان کی ذات سے خاصی دلچسپی بلکہ عقیدت رکھتے ہیں۔ قائداعظمؒ بھی ان پر مہربانی فرماتے۔ ملاقات کے لیے عزیز موصوف کو کوئی رسمی دشواری پیش نہیں آتی..... انھوں نے قائداعظمؒ کی قیام گاہ واقع مالا بار ہل پر ٹیلی فون کیا اور ملاقات کا وقت لیتے ہوئے کہا کہ میرا ایک عزیز بھی میرے ہمراہ آنا چاہتا ہے۔ قائداعظمؒ نے جواب میں غالباً اجازت دے دی۔ میری خوشی کا کیا پوچھنا! متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے راہنما سے شرف ملاقات کا موقع مل رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں قائداعظمؒ کی قیام گاہ پر تھے۔ زینہ طے کرتے ہوئے بالائی منزل پہنچے۔ وہاں قائداعظمؒ اپنی ہمشیر کے ساتھ صوفے پر رونق افروز تھے۔ بڑے تپاک سے ملے، مصافحہ کیا اور بیٹھنے کو کہا۔ ملاقات میں کئی موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ سب سے زیادہ اہم بلکہ گرم موضوع شملہ کانفرنس کا تھا۔ انھوں نے فرمایا: "آج ہی شملہ کانفرنس میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔" پھر قدرے رک کر حسرت آمیز لہجے میں بولے:

"دیکھو! میں یہاں تنہا بیٹھا مسلمانوں کا پورا مقدر تیار کر رہا ہوں۔ عین اس مکان کے سامنے انڈین کانگریس کے بہترین دماغ مل جل کر جوابِ دعویٰ تیار کر رہے ہیں۔"

میں نے اس مختصر ملاقات میں محسوس کیا کہ دس کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کی اتنی بھاری ذمے داریاں اپنے منحنی کندھوں پر سنبھالنے کے باوجود پُرامید ہیں اور کسی قسم کی بے یقینی اور اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ انھیں اس دن سفر کرنا تھا اور سفر بھی کس قدر ہنگامہ آفریں۔ ان کی مصروفیات بھی غیر معمولی تھیں۔ مگر انھوں نے ملاقات کے دوران اپنے اضطراب، عجلت اور بے تحاشا مصروفیات کا احساس نہیں ہونے دیا۔ دوسرا ہوتا تو اپنا اضطراب شاید نہ چھپا سکتا۔ ہم نے خود اٹھ کر اجازت چاہی تب انھوں نے رخصت دی۔

◆◆◆

کھیلوں کی دنیا کا حیران کن تاریخی واقعہ

جب خرگوشوں نے شیر کو ہرا دیا

اس سنہرے دور میں کھیلے گئے ایک یادگار ٹیسٹ کی سنسنی خیز روداد جب کرکٹ کا پاک صاف دامن میچ فکسنگ اور ایسی ہی دوسری قباحتوں سے داغدار نہیں ہوا تھا

عثمان سمیع الدین

جب میچ کا پہلا دن ختم ہوا، تو پاکستانی کھلاڑیوں کے چہروں پر مایوسی عیاں تھی۔ جسم تھکن کے مارے ٹوٹ رہے تھے۔ تاہم انھوں نے امید کی شمع روشن رکھی۔ صرف دو سال قبل ہی پاکستان کرکٹ ٹیم کو ٹیسٹ کھیلنے کا اجازت نامہ ملا تھا۔ مگر اس نے بھارتی ٹیم کو ہرا لیا، تو سبھی چونک گئے۔

تاہم پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم نوجوان اور ناتجربے کار کھلاڑیوں پر مشتمل تھی۔ اسی لیے جب وہ ۲۰ مئی ۱۹۵۴ء کو اپنے سابق آقاؤں کے دیس، برطانیہ پہنچی، تو

اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ انگریز ٹیم کو یقین تھا کہ وہ نوآموز پاکستانیوں کو چیونٹی کی طرح مسل ڈالے گی۔

چناں چہ یکم تا ۵ جولائی برج فورڈ قصبے میں واقع ٹرینٹ برج کرکٹ گراؤنڈ میں پاکستانی ٹیم کی بری درگت بنی، تو سب کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ اس ٹیسٹ میں گوروں نے نئے وطن کے کالوں کو اننگ کی شکست دی اور خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ مگر اس فتح نے انھیں تکبر و غرور میں مبتلا کر دیا۔ وہ عالمِ فراموشی میں بھول گئے کہ چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے، تو اسے بھی مار گراتی ہے۔ کچھ ایسا ہی ماجرا آخری ٹیسٹ میں پیش آیا۔

یہ ٹیسٹ لندن کے اوول گراؤنڈ میں ۱۲ تا ۱۷ اگست کو کھیلا گیا۔ تب تک پاکستانی ٹیم کو انگلستان آئے چار ماہ بیت چکے تھے۔ اس دوران برطانیہ کی بارشوں نے مہمانوں کو خاصا پریشان کیا۔ ویسے بھی اس سال وہاں معمول سے زیادہ بارشیں ہوئی تھیں۔

انگریز اور پاکستانی اب تک تین ٹیسٹ کھیل چکے تھے۔ دو برابر رہے، ایک میں پاکستانیوں کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ تاہم مہمان ٹیم کے حوصلے یوں جوان ہے کہ انھوں نے دورۂ انگلستان میں ۲۴ فرسٹ کلاس میچ کھیلے اور پانچ میں فاتح رہے۔ محض دو میں انھیں ہار کا مزہ چکھنا پڑا۔ یہ نوخیز پاکستانی ٹیم کی بہرحال عمدہ کارکردگی تھی جس کا یہ صرف دوسرا غیر ملکی دورہ تھا۔

لیکن اوول ٹیسٹ کا پہلا دن مہمانوں پر بڑا بھاری ثابت ہوا۔ پاکستانی ٹیم صرف ۱۳۳ رن ہی بنا سکی۔ صرف کپتان عبدالحفیظ کاردار (۳۶ رن)، وکٹ کیپر امتیاز احمد ۲۳ اور بالر محمود حسین (۲۳) ہی تیز رفتار برطانوی بالروں کا مقابلہ کر سکے۔

اس ٹیسٹ میں برطانوی بورڈ نے دو نئے فاسٹ بالروں، پیٹر لوڈر اور فرینک ٹائسن کو پہلی بار کھلایا۔ یہ دونوں خوفناک قسم کی تیز بالنگ کراتے تھے اور انھوں نے واقعتاً پاکستانی بیٹنگ لائن کے پرخچے اڑا دیے۔

اب پاکستان اور اندرون ملک میں پاکستانی کپتان کی لیڈرشپ پہ تنقید ہونے لگی۔ کئی مبصرین نے انھیں مغرور، سخت دل اور بے پروا قرار دیا۔ اس تنقید نے قدرتاً کاردار کو بددل کر دیا۔ اسی زمانے میں ایک پاکستانی نوجوان، خالد قریشی لندن میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ بتاتا ہے:

"جب پہلے دن کا کھیل ختم ہوا، تو میں کاردار سے جا کر ملا۔ وہ مجھے بڑے مایوس اور تھکے تھکے نظر آئے۔ ان کی بس یہی تمنا تھی کہ دورہ جلد ختم ہو اور پاکستان روانہ ہو جائیں۔"

اس بیان سے عیاں ہے کہ پاکستانی کپتان کو جیت کی کوئی امید نہ تھی۔ بلکہ وہ شکست کی توقع کیے بیٹھے تھے۔ دراصل پچھلی رات اور صبح بارش ہوتی رہی تھی۔ اس نے پچ پر نمی اور پھسلن پیدا کر دی۔ اسی باعث پاکستانی بلے باز جم کر نہ کھیل سکے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ صرف ۵۱ رنز پر سات وکٹیں گر گئیں۔ پھر کاردار اور امتیاز احمد نے ٹیم کو سنبھالا دیا۔

مایوس کن کھیل

پہلے دن کئی پاکستانیوں کے لیے قومی ٹیم کا مایوس کن کھیل غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پہلے ٹیسٹ میں بارش نہ ہوتی، تو گورے وہ بھی جیت جاتے۔ تیسرے ٹیسٹ میں بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ یہی وجہ ہے، برطانوی پریس نے پاکستانی کرکٹ ٹیم کو چنداں اہمیت نہ دی۔

اسی لیے آخری ٹیسٹ سے قبل پاکستانی کھلاڑیوں کا حوصلہ خاصا پست تھا۔ حتیٰ کہ سینئر کھلاڑیوں، مقصود احمد اور فضل محمود نے کپتان کو مشورہ دیا: "آپ یہ بیان جاری کر

دیں کہ پاکستانی ٹیم ہی آخری ٹیسٹ جیتے گی۔" کھلاڑیوں کا حوصلہ بلند کرنے کی خاطر کاردار نے بھی یہ بیان دینے کا سوچا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔

پہلے دن بارش کی وجہ سے لنچ کے بعد کھیل شروع ہوا۔ دوسرے دن صبح ہی پھر بارش شروع ہو گئی۔ جب بارہ بجے تھمی، تو برطانوی کپتان، لین ہٹن نے کھیل شروع کرنے پر اصرار کیا۔ دونوں کپتان پچ کا جائزہ لینے میدان میں آئے۔ اس وقت ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

کچھ ہی دیر میں بادل سر پر منڈلانے لگے۔ انھیں دیکھ کر کاردار بولے "بارش پھر آیا چاہتی ہے۔ اب تو کھیل نہیں ہوسکتا۔"

لین ہٹن نے کہا "ارے بھئی میں لندن کے بادلوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ برسنے والے بادل نہیں، تم اپنے لڑکوں کو میدان میں لے آؤ۔"

ابھی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ چناں چہ ہٹن اور کاردار سر پر پیر رکھ کر بھاگ اٹھے۔ سہ پہر کو بارش رکی۔ مگر اب کاردار اپنی ٹیم کو میدان میں نہیں اتارنا چاہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ برطانوی بلے باز پاکستان بالروں کو خوب پیٹیں گے۔

تیسرے دن آخر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی۔ اب اس معجزے نے جنم لیا جس کی توقع کم از کم برطانوی کرکٹ ٹیم کو نہ تھی۔ اس دن صبح سویرے سورج نکل آیا اور پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ نتیجتاً جب ساڑھے گیارہ بجے کھیل شروع ہوا تو پچ اچھی خاصی سوکھ چکی تھی۔

یہ بالنگ کا آئیڈیل ماحول تھا کیونکہ تھوڑی سی نم زمین پر بال زیادہ سوئنگ ہوتی ہے۔ اس دن پاکستانی میڈیم فاسٹ بالر، فضل محمود نے وہی لباس پہنا جسے زیب تن کر کے انھوں نے دو سال قبل لکھنو میں بھارتی کرکٹ ٹیم کا تیا پانچہ کر ڈالا تھا۔

اُدھر لندن والے جوق در جوق اسٹیڈیم میں چلے آئے۔ انگریز دھوپ کے دیوانے ہیں اور جس دن سورج جوبن پر ہو، تو وہ کھلے مقامات کا رخ کرتے ہیں۔ چناں چہ اسٹیڈیم میں ۲۵ ہزار تماشائی موجود تھے۔ وہ اپنے بلے بازوں کے چوکوں چھکوں سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ انھیں خبر نہ تھی کہ آج ۱۴ راگست ہے..... پاکستانیوں کا ساتواں یوم آزادی! اور اس موقع پر جذبہ حب الوطنی سے سرشار فضل محمود نے معاصرین پر قیامت ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سر لین ہٹن۔ برطانوی ٹیم کے کپتان

یوم آزادی کا تحفہ

کھیل شروع ہوا، تو فضل محمود جلد ہی انگریز بلے بازوں پر چھا گئے۔ انھوں نے بڑی نپی تلی بالنگ کی اور انھیں کھل کر کھیلنے کا موقع نہ دیا۔ چناں چہ جب بھی کوئی برطانوی بلے باز فضل محمود کو چوکا یا چھکا مارنے کی سعی کرتا، الٹا پویلین سدھار جاتا۔

اس جنگ میں میڈیم پیسر محمود حسین نے اپنے سینئر

بالر کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ تو مشہور انگریز بلے باز، پیٹر مے اور ڈینس کامپٹن کچھ ٹک گئے ورنہ دونوں پاکستانی بالروں نے حقیقتاً گوروں کو دن میں تارے دکھلا دیے۔ سات کھلاڑی اسّی سے کم رنز پر آؤٹ ہوئے۔ دو کھلاڑی صرف ۱۴ اور ۱۱ رن بنا سکے۔ کامپٹن نے ۵۳ اور مے نے ۲۶ رنز بنائے۔

برطانوی ٹیم ۱۳۰ رنز بنا کر آؤٹ ہوگئی۔ اگر پاکستانی فیلڈروں سے بچے کیچ نہ چھٹتے، تو یہ عدد اور کم ہوتا۔ پورے دورے میں پاکستانی فیلڈروں نے افسوس ناک کارکردگی دکھائی تھی۔ بس کوئی کوئی پاکستانی کھلاڑی ہی کبھی چمک دکھاتا اور بہترین فیلڈنگ کا مظاہرہ کرتا۔

یوں دورے میں پہلی بار پاکستانی ٹیم نے میزبانوں پر ۳ رنز کی معمولی برتری حاصل کر لی۔ اب آخری گھنٹے کا کھیل باقی تھا۔ پاکستان کی طرف سے حنیف محمد اور شجاع الدین کھیلنے آئے۔ حنیف سولہ سترہ سالہ لڑکے کی طرح کمسن تھے، مگر ان میں صبر و برداشت کا مادہ کہیں زیادہ تھا۔ تاہم اس بار وہ جارحانہ موڈ میں نظر آئے۔

برطانوی کپتان، لین ہٹن اپنے دو بہترین بالروں سے پاکستانیوں پر حملہ آور ہوئے۔ مگر حنیف نے پے در پے انھیں چار چوکے کھڑکا دیے۔ یوں پاکستانی اوپنر نے گوروں پر آشکار کر دیا کہ پاکستانی ٹیم لڑنے بلکہ جیتنے کا بوتا رکھتی ہے۔

تاہم یہ چمک کچھ ہی عرصہ رہی، جلد ہی حنیف کیچ آؤٹ ہو کر پویلین سدھارے۔ انھوں نے ۱۹ رنز بنائے۔ اب دوبارہ پاکستانی ٹیم پر نحوست کے بادل چھا گئے۔ جو کھلاڑی کریز پر آتا، پانچ رنز یا دس پندرہ رنز بنا کر گھر لوٹ جاتا۔ حتیٰ کہ صرف ۸۲ رنز پر آٹھ کھلاڑی آؤٹ ہوگئے۔

پاکستانی ڈریسنگ روم میں سبھی محب وطن خجالت و شرمندگی کے پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تبھی حنیف محمد کے بڑے بھائی، وزیر محمد غیر متوقع طور پر فرنگیوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔

وزیر محمد اور ذوالفقار احمد۔ بہترین شراکت

وزیر احمد آل راؤنڈر تھے۔ اپنی عمدہ بالنگ سے بلے بازوں کو باندھ کر رکھتے۔ جبکہ نچلے نمبروں پر کھیلتے ہوئے اچھے خاصے رنز بنا لیتے۔ مگر انھوں نے دورے کے دوران بڑی ناقص فیلڈنگ کا مظاہرہ کیا۔ اسی لیے کاردار ان سے خفا رہے۔ آخری ٹیسٹ میں تو کپتان نے انھیں باہر رکھا تھا۔ مگر منیجر اور فضل محمود کے اصرار پر وزیر محمد کو ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔

آخر اب وزیر محمد نے بھی کھل کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور گورے بالروں کو منہ توڑ جواب دینے لگے۔ تب تک پورا اسٹیڈیم انگریزوں کے روایتی فاتحانہ نغموں سے گونج رہا تھا۔ انھیں سنتے ہوئے انگریز کھلاڑی بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ ان کو فتح اپنی جیب میں رکھی نظر آ رہی تھی۔

وزیر محمد کی خوش قسمتی کہ چار چوٹ کی اس لڑائی میں اسپن بالر ذوالفقار احمد نے بھی ان کا خوب ساتھ دیا۔ وہ پاکستانی کپتان کے بہنوئی تھے اور مزاحیہ شخصیت رکھتے۔ جب مائک ٹائسن کی برق رفتار گیندوں کا اوور ختم ہوتا، وہ پویلین میں بیٹھے ساتھیوں کی سمت دیکھتے اور ہاتھ ہلاتے۔ مدعا یہ بتانا ہوتا کہ میں پھر بچ گیا اور تیز رفتار بالنگ کو کھیلنا سیکھ رہا ہوں۔

کراچی والوں کے انداز میں وزیر محمد نے سوچ سمجھ کر اپنی اننگ کھیلی۔ ادھر ذوالفقار لاہوریوں کے مخصوص انداز میں بے پروائی سے شاٹیں مارتے رہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان پر مہربان تھے، اسی لیے وہ تقریباً دو گھنٹے تک کریز پر جمے رہے۔ انھوں نے اپنوں کو حیران اور غیروں کو پریشان کر دیا۔

لین ہٹن مسلسل بالر تبدیل کرتے رہے، مگر دونوں پاکستانی جم کے کھڑے ہو گئے۔ آخر گوروں کی کوششیں رنگ لائیں اور ذوالفقار احمد اسپنر جونی وارڈل کے اوور کی آخری گیند پر کیچ آؤٹ ہو گئے۔ اس اننگ میں وارڈل ہی نے ۷ پاکستانی کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ ذوالفقار ۷۱ منٹ تک کریز پر رہے۔ چار چوکے مار کے ۳۲ رنز بنائے۔

پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی

نویں وکٹ گرنے کے بعد وزیر محمد کو احساس ہوا کہ اب انھیں کھل کر کھیلنا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے بھی لاہوریوں والا انداز اپنایا اور جارحانہ کھیلنے لگے۔ آخری کھلاڑی، بالر محمود حسین نے اپنے ساتھی کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ طوفانی گیندوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

دونوں کھلاڑیوں نے آخری وکٹ کی شراکت میں ۲۴ رن بنائے۔ اور وہ ۲۵ منٹ تک کھیلتے رہے۔ جب محمود حسین بلا تھامے میدان میں داخل ہوئے، تو برطانوی ٹیم کے کوچ، الف گروو نے پیشین گوئی کی تھی: ''یہ کھلاڑی دو منٹ بعد واپس آ رہا ہو گا۔''

لیکن مشہور انگریز کوچ کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔

فضل محمود نے ڈینس کامپٹن کو آؤٹ کر دیا

محمود حسین ۲۵ منٹ تک وکٹ پر جمے رہے۔ اس دوران قیمتی ۲۴ رنز کا اضافہ ہوا۔ تب کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ آخر میں یہی رن فیصلہ کن ثابت ہوں گے۔ بہرحال پیشین گوئی غلط ثابت ہونے سے برطانوی ٹیم کو خاصی مایوسی ہوئی۔

وزیر محمد دوسری اننگ میں ناقابل شکست رہے۔ انھوں نے ۱۶۰ منٹ بلے بازی کی اور ۴۲ رنز بنائے۔ انھی کی ثابت قدمی اور صبر کے بے مثال مظاہرے سے پاکستان خاصے رن بنا سکا ورنہ پہلے یہی لگتا تھا کہ ٹیم ۱۰۰ سے کم پر لڑھک جائے گی۔ تاہم وہ ۱۶۴ رنز بنانے میں کامیاب رہی۔

برطانوی ٹیم کو جیتنے کے لیے ۱۶۸ دوڑیں رنز بنانی تھیں۔ نامور انگریز بلے بازوں کے لیے یہ مجموعہ خاص نہ تھا جب کہ ڈھائی گھنٹے کا کھیل اور اگلا پورا دن باقی تھا۔ مگر پاکستانی سٹرائک بالر، فضل محمود فتح کی راہ میں سدِ سکندری بن گئے۔

حنیف محمد کی تھرو سے میکون آؤٹ۔ پاکستان جیت گیا

دراصل فضل محمود پُرامید تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو بھی ہمت دلاتے ہوئے بتایا کہ اس مجموعے کا دفاع کرنا ممکن ہے۔ انھوں نے دشمن کو دق کرنے کی خاطر یہ تکنیک اپنائی کہ ہر گیند نئے انداز یا ورائٹی میں کرانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی خوش قسمتی کہ انگریز بلے باز بھی جلدی میں تھے۔

انگریز ٹیم کی خواہش تھی کہ وہ تیز کھیل کر ڈھائی گھنٹے ہی میں ۱۶۸ رنز بنا ڈالے۔ یوں وہ اگلا دن سیر و تفریح کرتے گزارتے۔ لہٰذا برطانوی اوپنر چوکے چھکے مارنے کی تمنا لیے میدان میں اُترے۔

اُدھر جوش و خروش سے بھرے فضل محمود تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے متنوع گیندیں کرانے لگے۔ انھوں نے لین ہٹن کو بالخصوص بہت پریشان کیا۔ آخر ایک گیند پر انھوں نے ہٹ مارنا چاہی، تو کیچ آؤٹ ہو گئے۔ تب اسکور ۱۵ تھا۔

لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ برطانوی بلے باز دو بڑی شراکتیں بنا کر اسکور خطرناک حد تک ٹارگٹ کے قریب لے گئے۔ پہلے تو ریگ سمپن اور پیٹر مے نے صرف ۴۰ منٹ میں ۵۱ رنز کا اضافہ کیا۔ پھر ڈینس کامپٹن اور مے کی شراکت داری ہوئی۔

کرشمے کی منتظر پاکستانی ٹیم

تب تک مے خصوصاً وکٹ پر جم گیا۔ اب وہ ہر بال بڑی عمدگی اور مہارت سے کھیل رہا تھا۔ اس نے محمود حسین کو یکے بعد دیگرے دو چوکے مارے اور پاکستانیوں کی ہمت پست کرنا چاہی۔ برطانوی تماشائی ہر رن پر اپنے بلے بازوں کو خوب داد دے رہے تھے۔ چناں چہ اسٹیڈیم میں ان کی جیت کا ماحول بن گیا۔ یہی لگنے لگا کہ برطانوی بلے باز آج

ہی مہمانوں کا قصہ تمام کر دیں گے۔

اس وقت پاکستانی ٹیم کسی کرشمے کی منتظر تھی۔ اور رحیم و کریم اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا۔ فضل محمود اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں: ''جب کاردار کسی نئے بالر کو آزمانے کا سوچ رہے تھے، تو میں تیزی سے ان کے پاس گیا۔ ان سے گیند تقریباً چھیننے کے انداز میں لی۔ کپتان کو کہا کہ آپ آف سائیڈ پر کھڑے ہوں اور فوراً گیند کرانے اپنے مقام پر پہنچ گیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کاردار کسی اور کو گیند کرانے کا نہ کہہ دیں۔''

جوش میں بھرے فضل محمود کی یہ چال کامیاب رہی۔ پہلی ہی گیند پر پیٹرمے نے کاردار کو کیچ پکڑایا اور پویلین روانہ ہو گئے۔ یوں پاکستانی ٹیم کو ایسا ''بریک تھرو'' مل گیا جس کی وہ شدت سے منتظر تھی۔ برطانیہ کی تیسری وکٹ ۱۰۹ رنز پر گری۔ ابھی اسے جیت کی خاطر مزید ۵۹ رنز درکار تھے۔

لین ہٹن کو فکر تھی کہ آسمان پر منڈلاتے بادل کہیں برس نہ پڑیں۔ چناں چہ انھوں نے بیٹنگ لائن آرڈر میں تبدیلی کرتے ہوئے ٹام گریونے کی جگہ گاڈفرے ایونز کو بھجوایا۔ دراصل وکٹ کیپر گاڈفرے ''مار دھاڑ'' کر لیتا تھا۔ چناں چہ انگریز کپتان کو یقین تھا کہ بقیہ آدھے گھنٹے میں وہ چوکے چھکے مار میچ ختم کر ڈالے گا۔

اُدھر مے کے آؤٹ ہوتے ہی کاردار نے مشروبات منگوا لیے۔ اس مختصر وقفے کے دوران پاکستانی ٹیم نے مل کر غنیم پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس حملے کی قیادت دونوں سینئر پاکستانی کھلاڑی، کاردار اور فضل محمود کر رہے تھے۔

گاڈفرے پاکستانی بالنگ کا تیاپانچہ کرنے آیا تھا، مگر صرف ۳ رنز بنا سکا۔ فضل محمود نے اس کی وکٹ اڑا دی۔ اب محتاط بلے بازی کرنے والا ٹام گریونے میدان میں اترا۔ اس کا انجام بھی مختلف نہ رہا، شجاع الدین نے اسے صفر پر ایل بی ڈبلیو کر دیا۔ یوں ۱۱۲ رنز پر ۵ برطانوی کھلاڑی آؤٹ ہو گئے۔

فضل محمود پاکستانی تماشائیوں سے مبارک باد لیتے ہوئے

اب جونی وارڈل کھیلنے آیا۔ یہ برطانیہ کا آخری مستند بلے باز تھا۔ اس کے بعد بالروں کی باری آ جاتی۔ یہ دیکھ کر پاکستانیوں کا حوصلہ مزید بلند ہو گیا۔ اب وہ ایک اور وکٹ کھڑکھڑانے انگریزوں کے قریب آئے اور چھے فیلڈروں نے بلے بازوں کا گھیراؤ کر لیا۔

یہ حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی۔ دونوں میزبان کھلاڑی دباؤ میں آ گئے اور بڑے محتاط انداز میں کھیلنے لگے۔ ادھر فضل محمود عین نشانے پر نپی تلی گیندیں کرا رہے تھے۔ اچانک انھوں نے کاردار کی سمت دیکھا اور پنجابی میں گویا ہوئے ''حفیظ! میں کاپتن نوں آؤٹ کر دیتا تے فیر؟'' (اگر میں نے کاپتن کو آؤٹ کر دیا تو پھر؟)

کپتان نے ترنت جواب دیا: ''فیر اساں میچ جت

جاواں گے اورکی۔'' (پھر ہم میچ جیت لیں گے)

قدرت خدا کی اگلی ہی گیند کاسپٹن کا بلا چھو کر وکٹ کیپر، امتیاز احمد کی طرف گئی۔ انھوں نے کیچ پکڑنے میں کوئی کوتاہی نہ کی اور خوشی سے اچھل پڑے۔ اس میچ میں یہ امتیاز کا چھٹا کیچ تھا اور انھوں نے سبھی فضل محمود کی گیندوں پر پکڑے۔

اس طرح ۱۲۱ رنز پر چھٹی برطانوی وکٹ گر گئی۔ جب کھیل ختم ہوا، تو ۱۲۵ رنز بن چکے تھے۔ گویا اگلے دن برطانیہ کو جیتنے کی خاطر ۴۳ رنز بنانے تھے اور اس کی چار وکٹیں باقی تھیں۔ بظاہر یہ بڑا ٹارگٹ نہیں تھا مگر مستند بلے بازوں کی عدم موجودگی نے اسے حاصل کرنا کچھ کٹھن بنا دیا۔

رقابت کے باوجود جیت

شام کو پاکستانی کپتان فضل محمود کے کمرے میں پہنچے۔ وہ اس امر پر اپنے مرکزی بالر سے گفت وشنید کرنا چاہتے تھے کہ اگلے دن کیسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ فضل محمود نے انھیں کہا: ''حفیظ! آپ کپتان ہیں۔ آپ خود طے کیجیے کہ کیا منصوبہ اپنایا جائے؟''

دراصل اس وقت کم ہی لوگ جانتے تھے کہ دونوں کھلاڑیوں کے مابین مختلف وجوہ کی بنا پر اختلافات موجود ہیں۔ دراصل دونوں کا تعلق ''کرکٹ کی قوت'' کے مختلف لاہوری مراکز سے تھا۔ دونوں کھلاڑی زمانہ قدیم سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ فضل محمود کو اس امر پر رنج تھا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے پڑھ کر ان کے دوست میں کبر ونخوت آ گیا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ انھیں حفیظ ہی کہتے تاکہ دوست کو عرش سے فرش پر لے آئیں۔ مزید برآں فضل محمود کو یہ بھی غصہ تھا کہ کاردار ممدوٹ کلب (لاہور) کے کھلاڑیوں کو ٹیم میں نہیں لیتے۔ فضل محمود اور کاردار، دونوں نے اسی کلب میں کھیلتے ہوئے مبادیات کرکٹ سیکھی تھی۔ (تب ٹیم میں اسلامیہ کالج، لاہور کے کھلاڑیوں کی کثرت تھی)

لیکن اختلافات کی جڑ میاں محمد سعید اور حفیظ کاردار کے مابین رقابت تھی۔ دراصل کاردار سے قبل میاں صاحب ہی پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے۔ تب پاکستان کو ٹیسٹ کھیلنے کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔

برطانیہ کے دورے سے قبل میاں سعید نے کوشش کی تھی کہ وہ پھر پاکستانی ٹیم کے کپتان بن جائیں۔ انھیں فضل محمود سمیت کئی کھلاڑیوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ (فضل محمود بعدازاں میاں صاحب کے داماد بنے) تاہم کاردار کو وزیراعلیٰ پنجاب، فیروز خان نون اور حکمران جماعت سے تعلق رکھنے والے اہم سیاست دانوں کی حمایت حاصل تھی۔ اسی لیے وہ کپتان بننے میں کامیاب رہے۔ تاہم کاردار کو ہردم خطرہ رہتا تھا کہ مخالف کھلاڑی کسی بھی لمحے بغاوت کر سکتے ہیں۔

بہرحال کاردار رات گئے تک اپنی حکمت عملی طے کرتے رہے۔ سامنے یہ سوال تھا کہ ایک فاسٹ بالر اور ایک اسپنر سے حملہ کیا جائے یا دونوں بالر تیز گیند کرائیں؟ جونی وارڈل بائیں ہاتھ سے کھیلتا تھا۔ لہٰذا اسپنر ذوالفقار احمد کی آف بریک گیندیں اسے دق کر سکتی تھیں۔ مگر انھیں پھر یہ بھی یاد آیا کہ فرسٹ کلاس میچوں میں وارڈل نے پاکستان اسپنروں کی خاصی دھنائی کی تھی۔ لہٰذا وہ گومگوں کی کیفیت میں رہے۔

۴۵ سالہ عثمان سمیع الدین انگریزی میں کرکٹ کے موضوعات پر لکھنے والے معروف صحافی ہیں۔ چند سال تک کرکٹ کی مشہور ویب سائٹ، انفوکرکٹ سے وابستہ رہے۔ آج کل بہ حیثیت سپورٹس صحافی ابوظہبی کے اخبار ''دی نیشنل'' سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے پاکستانی کرکٹ کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے جو عنقریب بھارتی ناشر، ہارپر کولنز شائع کرے گا۔ زیر مطالعہ مضمون اسی کتاب ''اے ہسٹری آف پاکستان کرکٹ'' سے بصد شکریہ لیا گیا۔

پاکستان کو روک سکو گے؟

دوسرے دن کاردار میدان میں پہنچے، تو بڑے سنجیدہ تھے۔ ان کی سنجیدگی دیکھ کر بقیہ کھلاڑی بھی خاموش نظر آئے۔ البتہ محمود حسین نے روایتی مزاحیہ انداز اپنایا اور وارڈل کو دیکھتے ہی بولے ''او جونی، کیا تم پاکستان کو روک سکو گے؟'' "Oh Johnny can you stop Pakistan?"

آخر کاردار نے اپنی چھٹی حس کے احکامات پر چلنے کا فیصلہ کیا اور دونوں طرف سے فاسٹ بالروں کو لگایا۔ ان کی حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی جب محمود حسین کی گیند پر وارڈل نے کیچ اچھال دیا۔ تاہم سلپ پر کھڑے علیم الدین وہ کیچ نہ پکڑ سکے۔ تب اسکور ۱۲۹ پر پہنچ چکا تھا۔ اب یہی لگنے لگا کہ میچ پاکستان کی گرفت میں نہیں رہا۔

تاہم فضل محمود اور محمود حسین جی جان سے سخت بالنگ کراتے رہے۔ اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ اگلے آدھ گھنٹے میں صرف ۳ رنز بن سکے۔ آخر ان کی محنت رنگ لائی۔ فضل محمود کی گیند پر وکٹ کیپر امتیاز نے بالر فرینک ٹائسن کا کیچ پکڑ لیا۔ یوں ۱۳۱ رنز پر ساتواں فرنگی پویلین سدھارا۔

اگلا بلے باز پیٹر لوڈر تھا۔ دونوں انگریز کھلاڑیوں میں کھسر پسر ہوئی۔ پھر پہلی ہی گیند پر لوڈر نے فضل محمود کو چوکا دے مارا۔ اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔ آج بھی کئی ہزار برطانوی تماشائی آئے ہوئے تھے۔ اب وہ ہر لحہ کروٹیں بدلتا میچ دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

چوکا کھانے پر فضل محمود کی ہمت پست نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے آخری بلے باز، وارڈل کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے شجاع الدین کو شارٹ اسکوائر لیگ پر (بلے باز کے قریب) کھڑا کیا اور کہا ''ہوشیار رہو۔ تمھاری طرف کیچ آئے گا۔''

فضل محمود نے پھر وارڈل کو لیگ کٹر کرائی۔ وارڈل بال کو سمجھ نہ پایا۔ گیند بلے سے ٹکرا کر اچھلی اور سیدھی شجاع الدین کے ہاتھوں میں آ گئی۔ انھیں ہلنے کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑی۔ اس طرح ۱۳۸ رنز پر آٹھواں برطانوی کھلاڑی رخصت ہوا۔

اب فرنگی ہمت ہار بیٹھے۔ انھیں نوشتہ دیوار صاف نظر آنے لگا۔ یہی وجہ ہے، لوڈر رنز میں اضافہ کیے بغیر اگلے ہی اوور میں آؤٹ ہو گیا۔ آخری جوڑے نے آدھ گھنٹے تک پاکستانی عقابوں کے حملے روکے، پھر وہ بھی لڑھک گیا۔ جم میکنون نے فضل محمود کی گیند پر شارٹ ماری اور رن لینے دوڑ اٹھا۔ مگر پھرتیلے حنیف محمد نے بہ برق رفتاری سے گیند اچکی اور وکٹوں پر دے ماری۔ یوں میکنون رن آؤٹ ہو گیا۔

یہ دیکھ کر فضل محمود خوشی سے اچھل پڑے۔ بعض کھلاڑی حنیف محمد کی طرف لپکے اور انھیں مبارک باد دینے لگے۔ اس طرح پاکستان نے ۲۴ رنز سے برطانیہ کو شکست دے ڈالی...... یہ وہی رنز تھے جو آخری پاکستانی جوڑی کی شراکت میں بنے۔

شاندار فتح پا کر تمام پاکستانی کھلاڑیوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ اسٹیڈیم میں جتنے پاکستانی تماشائی موجود تھے، انھوں نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگا کر سبھی کے رگ و پے میں بجلی سی بھر دی۔

ادھر پاکستان میں بھی جیت کی خبر جنگل کی آگ کے مانند پھیل گئی۔ دراصل ہزاروں پاکستانی ریڈیو سے چپکے رواں تبصرہ سن رہے تھے۔ اس ضمن میں پچھلے ہی دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔

ڈیوک آف ایڈن برگ کی مداخلت

اس زمانے میں بی بی سی سے معاہدے کے مطابق ریڈیو پاکستان وقفہ طعام (لنچ) کے بعد تبصرہ نشر کرنا شروع کرتا تھا۔ چوتھے دن کھیل کے خاتمے پہ سندھ کرکٹ ایسوسی ایشن کے صدر، نیاز احمد کو احساس ہوا کہ اگلے دن صبح ہی میچ ختم ہو جائے گا۔ یوں لاکھوں پاکستانی کئی گھنٹے بعد ہی نتیجہ حاصل کر پاتے۔ اس زمانے میں انٹرنیٹ تھا نہ سمارٹ فون!

چناں چہ نیاز احمد نے شام کو بذریعہ ٹیلی فون سیکرٹری دفاع اسکندر مرزا سے رابطہ کیا (جو بعدازاں صدر پاکستان بنے) وجہ یہ کہ مرزا صاحب انگریز حکومت سے قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ اسکندر مرزا نے اسی وقت ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل، زیڈ اے بخاری کو فون کیا۔ انھیں کہا گیا کہ وہ بی بی سی کے ساتھ بات کر کے تبصرہ میچ شروع ہوتے ہی نشر کرنے کا بندوبست کریں۔

تاہم بی بی سی نے پاکستانیوں کی درخواست مسترد کر ڈالی۔ اس پر اسکندر مرزا کو بہت غصہ آیا۔ انھوں نے برطانوی ملکہ الیزبتھ کے شوہر، ڈیوک آف ایڈن برگ سے بات کی۔ شہزادے کی مداخلت کے باعث پانچویں دن کا تبصرہ کھیل شروع ہوتے ہی پاکستان میں سنا جانے لگا۔

یہ میچ کئی اعتبار سے تاریخی اور یادگار ثابت ہوا۔ آج بھی کرکٹ کی تاریخ میں پاکستان واحد ملک ہے جس کی ٹیم نے پہلے دورہ برطانیہ میں نہ صرف برطانوی ٹیم کو شکست دی بلکہ سیریز بھی نہیں ہارا۔

تب پاکستان میں کرکٹ ابھی پنگھوڑے میں تھی۔ چند ماہ قبل ہی اس نوخیز ملک میں پہلا فرسٹ کلاس ٹورنامنٹ منعقد ہوا تھا۔ اسی کے بطن سے قائداعظم ٹرافی نے جنم لیا۔ پاکستانی ٹیم نوجوان کھلاڑیوں پر مشتمل تھی اور صرف کپتان کاردار نے ۱۰ سے زائد ٹیسٹ کھیلے تھے۔

دوسری طرف برطانوی ٹیم کئی مایہ ناز اور تجربہ کار کھلاڑیوں سے لیس تھی۔ اسی خوبی نے اسے بہترین ٹیم بنا دیا تھا۔ لیکن کل کے بچوں نے اسی مستند ٹیم کو پچھاڑ کر دنیائے کرکٹ میں زلزلہ سا پیدا کر دیا۔ حتیٰ کہ برطانوی اخبارات بھی پاکستانی کھلاڑیوں کی تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہی اخبارات نے انھیں پہلے ''Rabbits'' (خرگوش) کا خطاب دیا تھا۔ لیکن وہ حقیقتاً چھپے رستم ثابت ہوئے۔

◆◆◆

بیوی کو پانے کی قیمت

بلوچی کہانی

ایک بدقسمت شخص کی دکھ بھری داستان‘
بے حس میڈیا نے اس بیچارے
کو اپنے ہاتھوں کھلونا بنالیا

محمد ذوالقرنین خان

فلیش لائٹ سے نکلتی روشنی وہاں موجود تمام لوگوں کی آنکھیں چندھیائے دیتی تھی۔ تصویریں اتاری جا رہی تھیں اور ویڈیو بھی بن رہی تھی۔ ایک بڑے چینل کی مشہور رپورٹر وہاں موجود تھی۔ کچی بستی والوں کے لیے یہ سب کچھ بڑا انوکھا معاملہ تھا۔

☆☆

اس کی جیب سے ۴۰ ہزار روپے نکال لیے گئے تھے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جسم سن اور دماغ ماؤف تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں جائے، کس سے فریاد کرے۔ وہ تھانے کے سامنے کھڑا تھا جہاں باوردی ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا۔ ساتھ ہی اسے تنبیہہ کر دی گئی، اگر کسی سے کچھ کہا تو اس کی کھال محاورۃً نہیں حقیقتاً کھینچ لی جائے گی۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑا رہا پھر کسی ہارے ہوئے جواری کے مانند ڈولتے قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆☆

جب اس نے ہوش سنبھالا، اپنے آپ کو ایک کمرے کے کچے مکان میں پایا۔ وہاں بجلی، پانی، گیس جیسی عام ضروریات زندگی کا گزر تک نہ تھا۔ بارشوں میں چھت چھلنی کا روپ دھار لیتی۔ بستی نشیب میں ہونے

کی وجہ سے منہ زور پانی گھروں میں یوں گھس آتا جیسے وہ اسی کی ملکیت ہوں۔ نکاسی آب کا مناسب انتظام نہ ہونے کے باعث پانی گلیوں میں مستقل ڈیرے جما لیتا اور تعفن کا باعث بنتا۔ عفونت کے عادی حسِ باطنی سے قاصر رہتے۔

شعور سنبھالنے تک جمعہ گل اپنی ماں کے ساتھ اس ماحول کا حصہ بن گیا۔ ماں اس کی پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد بیماری میں مبتلا ہو کر اندھی ہوگئی۔ ڈاکٹروں کے مطابق یہ اندھا پن عارضی تھا۔ مگر جلد آپریشن نہ ہونے کی صورت میں وہ دائمی طور پر نابینا ہو سکتی تھی۔ جمعہ گل کا باپ اپنی بیوی کو گھر واپس لے آیا کیونکہ ڈاکٹروں نے آپریشن کا خرچ ۲۰ ہزار روپے بتایا جب کہ اس کے پاس فقط دو ہزار تھے..... یوں محض ایک صفر کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے اندھی ہوگئی۔

جمعہ گل دس برس کا تھا جب مزدور باپ ایک اونچی عمارت سے گرا اور زندگی کے تمام جھمیلوں سے آزاد ہو گیا۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے باوجود اس کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ پہلے وہ اپنی میلی کچیلی بوری اٹھا صبح سویرے کچرا چننے نکل کھڑا ہوتا تھا، اب بھی یہی معمول رہا۔ پہلے بھی وہ اپنی کھا کر ماں کی روٹی سے کچھ حصہ توڑ لیا کرتا تھا، اب بھی اس قاعدے پر عمل پیرا رہا۔

حالات کیسے ہی ہوں، موسم کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہوتا، وہ اپنے کام میں جتا رہتا۔ سارا دن کچرا الٹتا پلٹتا اور گلیوں سے ردی چنتا۔ گندے نالے کے قریب دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتے وقت بھی کام اس پر سوار رہتا۔ وہ ایک بڑا سا مقناطیس مضبوط ڈوری سے باندھ نالے میں ڈال دیتا۔ پانی میں بہنے والے فولادی ٹکڑے، کیل وغیرہ مقناطیس سے چپک جاتے اور اس کے لیے روزی کا سامان بنتے۔

شب و روز گزرتے رہے کہ انھیں گزرنا ہی تھا...... شہزادوں اور در در کی ٹھوکریں کھاتے غریب زادوں کے لیے بھی! اس معاملے میں وقت بڑا منصف ہے۔

آخر جمعہ گل جوان ہوگیا۔ ماں اب اس فکر میں تھی کہ جلد از جلد ولور کا انتظام ہو جائے تاکہ بیٹے کا اچھی جگہ رشتہ ہو سکے۔ اس بلوچ بستی کی ریت تھی کہ بہ موقع شادی لڑکی کے باپ کو اچھی خاصی رقم دینی پڑتی تھی جسے ''ولور'' کہا جاتا۔

جمعہ گل بیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس نے بچت کی غرض سے اپنے اوقات کار بڑھا لیے۔ وہ رات گئے تک کام کرنے لگا۔ ہر قسم کا مشقت بھرا کام کرنے کے لیے وہ تیار رہتا۔ آخر چھے سال بعد وہ دو لاکھ روپے اکٹھے کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

ماں نے تب بستی ہی سے ایک لڑکی تلاش کر لی اور ڈیڑھ لاکھ روپے ولور طے ہوا۔ اس دن وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ جمعہ گل نے طویل عرصے بعد کام سے چھٹی کی تھی۔ اس دن جمعہ گل اور ماں نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ اپنے بیٹے کو خوش پا کر وہ بار بار اس کی بلائیں لیتی۔

مغرب کے بعد ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ جمعہ گل نے ماں کی چارپائی کمرے میں اس جانب لگا دی جہاں چھت نہیں ٹپکتی تھی۔ پھر وہ بیرونی دروازے کے سامنے بند باندھنے لگا تاکہ پانی کو اندر داخل ہونے سے روک سکے۔ آدھ گھنٹے میں بارش اس قدر تیز ہوگئی کہ پختہ

گھروں میں بیٹھے لوگ بھی سہم گئے۔ آخر ساکنانِ کچی بستی اللہ تعالیٰ کے آگے آہ وفغاں کرنے لگے۔ بارش تھم گئی۔ خدا نے اپنے بندوں پر رحم کیا مگر انسانوں کی تخلیق برساتی نالہ اہل کر سڑک پر بہنے لگا۔

اس شب ایک صوبائی وزیر نے دوست احباب کے لیے عشائیے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ سڑک پر موجود پانی ندامت کا سبب بن سکتا تھا۔ شرمندگی سے بچنے کے لیے صاحب سطوت نے اپنے ایک لائق فائق مشیر سے صلاح مانگی۔ مشیر نے مخلصانہ مشورہ وزیر موصوف کے سامنے رکھا۔ تجویز کے مطابق برساتی نالے کا بند توڑ دیا گیا اور دو ہزار لوگوں کی بستی پانی میں ڈوب گئی...... اُدھر سڑک پر پانی جمع نہ ہوا اور وزیرِ محترم سُبکی سے بچ گئے۔

جمعہ گل نے اندھی ماں کو لیا اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتا بستی سے باہر نکل گیا۔ پوری رات وہ اور اس کی ماں ٹھنڈ میں ایک درخت تلے پڑے رہے۔ بوڑھی ماں سردی برداشت نہ کر سکی اور شدید نمونیے میں مبتلا ہوگئی۔

وہ اسے لیے شہر کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال پہنچا مگر وہاں کی حالت بھی بستی کے مشابہ تھی۔ چھت سے پانی مسلسل ٹپک رہا تھا۔ وارڈ میں ہر طرف گندا پانی پھیلا تھا جس میں غلاظت تیر رہی تھی۔ بجلی اور ڈاکٹر، دونوں غائب تھے۔

اس سے ماں کی حالت دیکھی نہ گئی، لہٰذا وہ ایک نجی اسپتال جا پہنچا...... ایسی جگہ جہاں امیروں اور غریبوں سے یکساں سلوک ہوتا ہے۔ بس جیب میں اچھی خاصی رقم ہونی چاہیے۔

ماں کو اسٹریچر پر ڈال وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں کو احساس ہوا کہ مریضہ کی حالت بہت نازک ہے تو انھوں نے اسے انتہائی نگہداشت کے کمرے میں منتقل کر دیا۔ ایک ہفتے تک ماں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہی اور پھر دار فانی سے کوچ کر گئی۔ اسے یہ اندوہناک خبر سنائی گئی اور صبر کی تلقین کے بعد چالیس ہزار روپے کا بل تھما دیا گیا۔

دس ہزار روپے وہ پیشگی ادا کر چکا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اتنی زیادہ رقم ادا کرتے ہوئے وہ چکرا جاتا مگر بغیر پس و پیش اس نے مطلوبہ روپے ان کے حوالے کیے اور ماں کا جسد خاکی لیے لٹی پٹی تباہ بستی کی جانب چل دیا۔

مکینوں نے وہاں اپنی مدد آپ کے تحت زندہ رہنے کا کچھ سامان کر لیا تھا۔ کفن دفن، قل اور ایصال ثواب کے لیے کی گئی خیرات میں بھی اس کی اچھی خاصی رقم خرچ ہوگئی۔

مکان گرنے کے قریب تھا۔ مستری نے ایک لاکھ روپے کا لگ بھگ خرچہ بتایا۔ مکان کی تعمیر اور گھریلو ضرورت کے سامان خریدنے پر اس کی ساری جمع پونجی خرچ ہوگئی۔ یوں جمعہ گل نے جہاں سے آغاز سفر کیا تھا، پھر وہیں آ کھڑا ہوا۔

وہ دوبارہ محنت مزدوری کرنے لگا۔ مگر اب حالات پہلے جیسے نہیں تھے۔ آئے روز کی ہڑتالوں نے ملکی معیشت کو تہس نہس کر ڈالا۔ متواتر لوڈشیڈنگ نے کاروبار کرنا دشوار بنا دیا۔ مہنگائی آسمان کو چھونے لگی۔ اوپر سے جمعہ گل کو بعض دن مزدوری نہ ملتی۔ چناں چہ آٹھ برس میں وہ فقط ڈھائی لاکھ روپے ہی جمع کر سکا۔ اب وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا دکھائی دیتا۔ حالات کے جبر نے وقت سے بہت پہلے اسے بڑھاپے کی دہلیز پر دھکیل دیا تھا۔

ولور بھی اب کم سے کم تین لاکھ روپے تھا۔ کافی تگ

دو کے بعد ایک رشتے دار کے توسط سے اسے ایک رشتہ دو لاکھ روپے میں مل گیا۔ لڑکی کی عمر پندرہ سال تھی۔ آنکھوں میں ٹیڑھے پن کی وجہ سے نظر کافی کمزور اور زبان میں بھی لکنت تھی۔

جمعہ گل اب تھک چکا تھا۔ تقریباً ساری جوانی اس نے ولور اکٹھا کرنے میں گزاری تھی۔ آخر شادی کا دن آ پہنچا۔ نئے کپڑوں میں ملبوس وہ نکھرا نکھرا لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سر پہ ہاتھ رکھ کر دعا دینے والا باپ تھا نہ ماتھا چوم کر بلائیں لینے والی ماں۔

نکاح ہوا۔ مبارک سلامت کے شور میں اچانک فلیش لائٹ کی روشنی نے وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں چندھیا دیں۔ ایک لڑکی ہاتھ میں مائیک لیے، کیمرامین کی طرف رخ کیے پُرجوش انداز میں تازہ ترین صورت حال ناظرین کو بتانے میں مصروف تھی۔ وہ ایک دس سالہ لڑکی سے پچاس سالہ شخص کے نکاح کی سنسنی خیز خبر سے پردہ اٹھا رہی تھی:

''نجانے کب ہمارا معاشرہ باشعور ہو گا؟ کب ہم اس ظلم، بربریت کے خلاف آواز اٹھائیں گے؟ کیونکر یہاں قانون کی عملداری ہو گی؟''

اسی قسم کے چار پانچ سوال اس نے ناظرین کی جانب اچھالے اور باقی کا معاملہ پولیس اور منتظمین مقامی این جی اور کے حوالے کر وہاں سے کسی اور خبر کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ آئے موٹی گردن اور فربہ توند والے کانسٹیبل نے دُلھا بنے جمعہ گل کو بازو سے تھاما اور تھانے کی طرف چل پڑا۔ لڑکی دارالامان بھجوا دی گئی۔

جمعہ گل کی جیب میں محفوظ چالیس ہزار روپے پولیس والوں نے ہتھیا لیے۔ یوں دوسری مرتبہ پھر وہ تہی دست ہو گیا۔

۵۰ ہزار روپے سے شروع ہونے والا معاملہ ۱۵ ہزار میں نبٹ گیا۔ آج وہ دارالامان سے اپنی منکوحہ چھڑا لایا تھا۔

◆◆◆

نیند اور موت

ایک عالم سے سوال کیا گیا: ''حضرت! سنا ہے کہ میت کو اس کے گناہوں کی بدولت قبر ہی میں عذاب ملتا ہے۔ لیکن بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ قبر کو دوبارہ شق کرنا پڑتا ہے۔ تب ہمیں عذاب کی کوئی قسم یا علامت نظر نہیں آتی۔ مثلاً نہ آگ نظر آتی ہے اور نہ ہی کوئی سانپ یا بچھو وغیرہ۔ اس کا مطلب کیا ہے؟''

انھوں نے فرمایا ''کبھی کبھار آپ نے سوئے آدمی کو دیکھا ہو گا کہ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ قاتل اس کی تلاش میں ہے۔ کبھی سانپ یا بچھو کو اپنے تعاقب میں پاتا ہے۔ کبھی آگ لگی ہے اور وہ بھاگ رہا ہے۔ اسے باقاعدہ درد بھی ہوتا ہے۔ وہ بعض اوقات چلاتا ہے۔ مگر ساتھ کے لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اس پہ کیا بیت رہی ہے۔ بعض اوقات اگر ڈراؤنا خواب دیکھا تو نیند سے فوری اٹھنے کے بعد اس کی علامات چہرے پر نظر آتی ہیں۔ چہرہ فق ہوتا اور رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔

نیند موت کی چھوٹی قسم ہے۔ قبر کی نیند تو بہت بڑی ہے۔ قبر میں تکلیف اور عذاب ضرور ہوتا ہے جو اس کا مستحق ہو اور جسے ہم نہیں دیکھ سکتے۔

(امیر حمزہ مشتاق احمد، وار برٹن)

دشمن نے جہاں منہ کی کھائی

ست کھیرا کی لڑائی

معرکہ آرائی میں بہادری کی یادگار داستانیں رقم کرنے والے جوانوں کا پُراثر ماجرا

لیفٹیننٹ (ر) سکندر خان بلوچ

کہتے ہیں، سیاست وہ منافقانہ کھیل ہے جس کے کچھ بے ضمیر کھلاڑی بعض اوقات مقصد براری کی خاطر اپنی عزت تک فروخت کر دیتے ہیں۔ وطن عزیز ہر شہری کے لیے ماں کا درجہ رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے کچھ بدکردار اور منافق سیاستدانوں نے اپنی یہ عزت ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ میدان میں فروخت کر دی۔

مزید بدقسمتی یہ ہے کہ وطن کی حفاظت کے لیے جانیں قربان کرنے اور دشمن سے ٹکرانے والوں کے نام نئی نسل کے سامنے نہیں لائے جاتے بلکہ ڈھاکہ میں دفن کر دیے گئے۔ کیونکہ ان عظیم پاکستانی بیٹوں کی شجاعت اور بہادری کے کارنامے اور عظیم قربانیاں قوم کے سامنے آجاتیں تو بدکردار سیاستدانوں کی منافقانہ چالوں کا پردہ چاک ہو جاتا۔ کاش سانحہ مشرقی پاکستان کی غیر جانبدارانہ انکوائری ہو جاتی۔ یوں نہ صرف غداروں کی نشاندہی ہوتی بلکہ وطن کی آن پر جانیں قربان کرنے والے شہدا کی روحوں کو بھی تسکین مل جاتی۔ اسی جذبے کے تحت ایک مایہ ناز بٹالین کے کارنامے پیش خدمت ہیں۔

فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ۱۵ بٹالین بارہ اکتوبر ۱۹۷۱ء تک مغربی پاکستان میں تھی جب اسے اچانک مشرقی

پاکستان پہنچنے کا حکم ملا۔ دو دن کے اندر اندر اسے ڈھاکہ پہنچا دیا گیا۔ ۱۴ اکتوبر کو یونٹ ڈھاکہ پہنچ گئی۔ اس وقت تک پاکستان اور بھارت کے مابین غیر اعلانیہ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ چناں چہ ۱۵ بٹالین کو ''ست کھیرا اور کلاروا'' کے محاذوں پر بھیج دیا گیا جو ضلع جیسور اور کھلنا میں واقع ہیں۔ اسے ۴۰ میل کے علاقے کا دفاع سونپا گیا جو کسی بھی بٹالین کے لیے مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ ایک عام انفنٹری بٹالین کا دفاع ۲ تا ۳ میل سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

بہرحال وسیع علاقے کے دفاع کی خاطر بٹالین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ست کھیرا کا محاذ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل یوسفزئی نے خود سنبھالا، کلاروا کا علاقہ بٹالین کے سیکنڈ ان کمانڈ، میجر صلاح الدین کو دیا گیا۔ وسیع علاقے کی دفاع کی خاطر بٹالین کو ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز سے تعلق رکھنے والی چند کمپنیاں بھی دی گئیں۔ بٹالین کے جوان حال ہی میں مغربی پاکستان سے آئے تھے اور تاحال وہاں کے ماحول سے مانوس نہ ہو سکے۔ لیکن جہاں تک ہو سکا، ۱۵ بٹالین نے اپنے فرائض بہ احسن انجام دیے۔ جہاں کہیں حملہ ہوا، افسروں اور جوانوں نے بڑی ہمت اور جوانمردی سے دشمن کا مقابلہ کیا۔

میجر عبدالجلیل ''بی'' کمپنی کمانڈ کر رہا تھا۔ اس کمپنی نے ''کک ڈنگا'' کے علاقے میں دفاعی پوزیشن قائم کر رکھی تھی۔ ۲۰/۱۹ نومبر کی رات گیارہ بجے دشمن نے اس پوزیشن پر حملہ کیا۔ ایک گھنٹہ شدید جنگ کے بعد دشمن لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بجے پھر دوسرا حملہ آیا۔ کمپنی نے جوانمردی سے حملہ روکا اور اسے ناکام بنا دیا۔ صبح پانچ بجے دشمن پھر حملہ آور ہوا لیکن اس دفعہ بھی جوانوں کی دفاعی لائن توڑنے میں ناکام رہا۔

کمپنی کو یقین تھا کہ اگلی رات پھر حملہ آئے گا کیونکہ یہ علاقہ دشمن کے لیے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ اس کو اسی راستے سے آگے بڑھنا تھا۔ لہٰذا کمپنی نے اسے ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کیا اور مقابلے کی خاطر پوری تیاری کر لی۔ اب ''سی'' کمپنی نے سیکنڈ لیفٹیننٹ ارشد جنجوعہ کو آگے اسکرین پوزیشن قائم کرنے بھیجا۔ دفاع میں اسکرین پوزیشنیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ وہی پہلا حملہ روکتی ہیں۔ اتنی دیر میں باقی کمپنی کو تیاری کا موقع مل جاتا ہے۔ اس سے دشمن کی تعداد اور ہتھیاروں کا بھی کسی حد تک پتا چل سکتا ہے۔

لیفٹیننٹ جنجوعہ نے دشمن کا مقابلہ تو کیا لیکن بڑے

تین حقوق

اسلام نے تین حقوق ایسے دیے ہیں جو تمام کائنات کے لیے یکساں ہیں۔ یعنی وہ حقوق مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو حاصل ہیں۔ انھیں ہر حال میں ادا کیا جائے:

۱۔ ہر حال میں امانت ادا کی جائے خواہ امانت رکھنے والا مسلمان ہو یا کافر۔

۲۔ ہر حال میں والدین کی عزت و تکریم کی جائے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔

۳۔ ہر حال میں وعدہ پورا کیا جائے۔ خواہ وہ کافر سے کیا ہو یا مسلمان سے۔

(امیر حمزہ مشتاق احمد، واربرٹن)

حملے کے سامنے انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ نوجوان لیفٹیننٹ نے پیچھے ہٹ کر توپخانے سے مدد مانگی جو فوری طور پر مہیا کی گئی۔ چناں چہ لیفٹیننٹ جنجوعہ نے جوابی حملہ ترتیب دیا۔ جوابی حملہ اتنی شدت سے کیا کہ دشمن اپنے ہتھیار اور لاشیں میدان میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ نوجوان اور ناتجربہ کار پاکستانی افسر کی طرف سے یہ بہت مؤثر حملہ تھا۔

کیپٹن شجاعت لطیف بٹالین کا ایجوٹنٹ تھا جس کا فرض مقامی نظام کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ وہ کمانڈنگ افسر اور باقی افسروں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتا ہے۔ بنیادی طور پر دفتری امور نمٹاتا ہے لیکن مشرقی پاکستان میں حالات ایسے نہ تھے کہ افسروں کو صرف دفتری فرائض سونپے جائیں۔ چناں چہ ۴۰ میل کے علاقے میں پھیلی یونٹ سے زمینی رابطہ رکھنا اور ساتھ ساتھ تمام فوجیوں کو ہر قسم کی امداد پہنچانا بھی کیپٹن شجاعت کے فرائض میں شامل تھا۔ انھیں یہ نوجوان افسر بہ احسن طریقے سے انجام دیتا رہا۔

۲۴ نومبر کو ''ست کھیرا'' کے علاقے میں بٹالین کا اگلی کمپنی سے وائرلیس رابطہ ٹوٹ گیا۔ کمانڈنگ آفیسر نے کسی طریقے سے رابطہ بحال کرنے کا حکم دیا۔ جب اور کچھ ممکن نہ ہو سکا تو کیپٹن شجاعت نے اپنے ساتھ ایک نائب صوبیدار اور دو جوان لے کر آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ کمپنی پوزیشن کی جانب جا رہا تھا تو راستے میں 'پت کیل گھاٹ' نامی گاؤں آیا۔ پتا چلا کہ اس گاؤں پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے۔ دشمن کا گاؤں میں ہونا کمپنی کے لیے بہت خطرناک تھا۔ حالات فوری کارروائی کے متقاضی تھے۔ اگر دشمن ایک رات اور وہاں رہ جاتا تو پوری کمپنی ختم ہو سکتی تھی۔ لہٰذا آگے جانے کے بجائے کیپٹن شجاعت نے دشمن سے نبٹنے کا فیصلہ کیا۔

کیپٹن شجاعت نے بھاگ دوڑ کر کے ایک پلاٹون ان جوانوں کی اکٹھی کر لی جو سپلائی کی ذمے داری پر مامور تھے۔ خوش قسمتی سے ادھر ادھر پھیلے رضاکاروں کی ایک پلاٹون بھی مل گئی۔ سب کو اکٹھا کر فوری حملے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ دشمن کو اچانک حملے کی امید نہ تھی۔ کیپٹن شجاعت نے بڑی دلیری اور برق رفتاری سے حملہ کیا۔ دشمن اچانک حملے کا جم کر مقابلہ نہ کر سکا۔ وہ کچھ لاشیں اور اسلحہ چھوڑ کر گاؤں سے بھاگ گیا۔ اس حملے میں خاصا اسلحہ ہاتھ لگا۔ یوں کمپنی کا نہ صرف بٹالین ہیڈکوارٹر سے رابطہ بحال ہوا بلکہ پیچھے کا علاقہ بھی محفوظ ہو گیا۔

۳ دسمبر کو بھارتی فوج سرحد عبور کر کے اس محاذ پر حملہ آور ہوئی۔ سرحد سے تھوڑا پہلے پاکستانی علاقے میں ''کالی گنگ شکھیرا'' روڈ پر ''کلیا'' نامی ایک پل واقع تھا۔ ایسے مقامات کا قبضہ دفاعی اور حملہ آور فوج، دونوں کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ پاکستان کے لیے اس پل کا برقرار رہنا بہت خطرناک تھا۔ کمانڈنگ آفسر نے فیصلہ کیا کہ پل کو بارود لگا کر اڑا دیا جائے تاکہ دشمن اس راستے سے بڑھ نہ سکے۔ لیکن دشمن نے بھی اس کی حفاظت کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔

بھارتیوں نے دریا کے دوسری طرف مشین گن سے لیس دو مورچے بنا رکھے تھے۔ لہٰذا جب پل کو تباہ کرنے کا فیصلہ ہوا تو اسے بارود لگانا مسئلہ بن گیا۔ اس موقع پر پھر کیپٹن شجاعت کی برق رفتاری اور جرأت مندی کام آئی۔ کیپٹن شجاعت نے چند دلیر جوانوں کو ساتھ لیا جن میں خصوصاً سپاہی اسران

بادشاہ جیسے جوان بے خطر دشمن سے ٹکرا سکتے تھے۔

کیپٹن شجاعت اور اس کے جوانوں نے بے خوف تیز دوڑ لگائی۔ پیشتر اس کے کہ دشمن ردعمل دکھاتا، سپاہی اسران بادشاہ دوسرے کنارے پہنچ کر دشمن کے بنکر میں ہنڈ گرنیڈ پھینک چکا تھا۔

ایک زوردار دھماکہ ہوا اور دشمن کی مشین گن خاموش ہوگئی۔ پیچھے تیزی سے کیپٹن شجاعت پہنچا اور دوسرا مورچہ خاموش کر دیا۔ اب کچھ جوانوں نے پل کے کنارے پوزیشن لی۔ بقیہ جوان پل کے ساتھ بارود باندھنے لگے۔ دشمن نے کیپٹن شجاعت اور اس کے چھوٹے سے دستے پر توپخانہ کا فائر کھول دیا۔ لیکن یہ لوگ اس وقت تک وہاں رہے جب تک پل تباہی کے لیے تیار نہ ہو گیا۔

''اوکے'' سگنل پر یہ لوگ ایک دفعہ پھر دوڑ کر پیچھے آئے۔ اس دوران ایک بم کی زد میں آ کر سپاہی اسران بادشاہ سخت زخمی ہو گیا۔ اسے اٹھا کر لانا پڑا۔ جونہی یہ لوگ پل کے اپنے کنارے پہنچے، ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پل اڑ گیا۔ کیپٹن شجاعت اگر زبردست بہادری نہ دکھاتے، تو اتنا بڑا کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ خدانخواستہ یہ پل صحیح سلامت دشمن کے قبضے میں آ جاتا تو بٹالین کا بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوتا۔

دشمن کی قید میں جانے کے بعد اس نوجوان کپتان نے کئی دفعہ بھاگنے کی کوشش کی۔ پہلی دفعہ جب ریل میں بٹالین کے جوانوں کو قیدی کیمپ لے جایا جا رہا تھا تو اس نے ایک غیر آباد علاقہ دیکھ کر چھلانگ لگا دی لیکن گر کر بے ہوش ہو گیا۔ کیمپ میں اس پر خصوصی نظر رکھی گئی پھر بھی اس نے سرنگ کھود لی جسے نامساعد حالات کی وجہ سے وہ استعمال نہ کر سکا۔ تیسری دفعہ باڑ سے چھلانگ لگا کر باہر جانے کی کوشش کی تو سنتری کی گولی سے شدید زخمی ہوا۔

اسی یونٹ کے ایک اور جوان افسر، لیفٹیننٹ طارق حسین نے چھت پھاڑ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن گارڈ کو پتا چل گیا۔ وہ بھی گارڈ کی گولیوں سے شدید زخمی ہوا۔ اسی طرح کیپٹن بہرام خان نے دو دفعہ بھاگنے کی کوشش کی مگر ہر دفعہ ناکام رہا اور بالآخر دشمن کی گولیوں سے زخمی ہوا۔ ان نوجوان افسروں کی عظمت، جرأت اور بہادری مثالی تھی۔ میں انھیں پوری قوم کی طرف سے سلام کرتا ہوں۔ پاکستان کے یہ عظیم بیٹے ہی پاکستان کا سرمایہ ہیں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

(کتاب ''جاں نثارانِ وطن'' سے ایک باب)

خطرناک غلطیاں

☆ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھنا۔
☆ جو کام خود سے نہ ہو سکے سب کے لیے ناممکن سمجھنا۔
☆ اپنا راز کسی کو بتا کر اسے پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔
☆ گناہ اس نیت سے کرنا کہ چند مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔
☆ بے کاری میں آئندہ کے لیے خیالی پلاؤ پکانا اور خوش ہونا۔
☆ انسان کے متعلق ظاہری شکل و صورت دیکھ کر رائے قائم کرنا۔
☆ اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا اور کسی خدائی عطیے کا امیدوار ہونا۔
☆ اپنے والدین کی خدمت نہ کرنا اور اپنی اولاد سے خدمت کی توقع رکھنا۔ (از ظفر وقاص، واہ کینٹ)

ایک بڑبولے کا کلمۂ کفر

میں نے ابھی گناہ کرنے ہیں

مادرانہ دعاؤں کی کرشماتی تاثیر نے بیٹے کو موت کے منہ میں جانے سے بچالیا

نوید اسلام صدیقی

۱۹۸۰ء میں مجھے اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت نصیب فرمائی۔ میں حج کرنے مسقط کے خوبصورت شہر صلالہ سے سعودی عرب گیا۔ حج کے بعد جدہ سے واپس صلالہ پہنچا تو وہاں مقیم پاکستانی وقتاً فوقتاً مبارک باد دینے آتے رہے۔ ایک دن میرے سر میں درد ہو رہا تھا، چناں چہ نماز عشاء پڑھ کر جلد لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی نیند آگئی۔ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا تو آنکھ کھلی۔ دروازہ کھولا تو عاشق حسین اور دو افراد کھڑے نظر آئے۔ میں نے انھیں اندر بلالیا۔ عاشق حسین میرے ساتھ دفتر میں کام کرتا تھا۔ اُس نے اُن دو افراد کا تعارف کروایا اور بتایا ''یہ میرا بھائی منظور حسین ہے۔ ٹرالا ڈرائیور ہے۔ بڑے بڑے ٹرالے چلاتا ہے۔ دوسرا شخص اس کا مددگار ہے۔ آہستہ آہستہ دوسرے کمروں سے احباب آکر شریک محفل ہوگئے۔ پہلے بوتلیں اور پھر چائے کا دور چلا۔ مجھے

روداد حج بیان کرنا پڑی۔ میرے دوست، شبیر صاحب چند سال قبل حج کر کے آئے تھے۔ انہوں نے کچھ واقعات سنائے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہی نہ ہوا اور رات کے دس بج گئے۔

عاشق حسین نے بتایا کہ وہ اپنا ٹرالا لے کر جدہ سے صلالہ دو دن قبل آئے ہیں۔ میرے پوچھنے پر منظور صاحب نے بتایا کہ یہ سات آٹھ سو کلو میٹر کا فاصلہ بنتا ہے۔ تقریباً سارا علاقہ بنجر و ویران ہے۔ راستے میں کوئی خاص بڑا شہر بھی نہیں آتا۔ شبیر صاحب نے پوچھا کہ راستے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ تو نہیں ہوتا؟ منظور نے ایک عجیب و غریب بات بتائی ''دوران سفر بیس پچیس کلومیٹر کا ایسا علاقہ آتا ہے، جہاں بڑے بڑے بورڈوں پر لکھا ہے: ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہوائی جھکڑ سے اپنے آپ کو بچا کر رکھیں۔''

کسی نے پوچھا کہ ہوائی جھکڑ سے کیا مراد ہے؟ منظور صاحب نے بتایا ''یہ پچیس تیس فٹ چوڑا ہوائی جھونکا ہے جس کی رفتار سو سے ڈیڑھ سو کلومیٹر تک ہوتی ہے۔ اس کا رخ ہمیشہ شمال سے جنوب کی طرف ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ راستے میں اس سے واسطہ پڑے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کہاں سے گزرے گا؟ بیس پچیس کلومیٹر کے اُس علاقے میں ہر دفعہ اس کی جگہ بدل جاتی ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد منظور کہنے لگا ''اب اجازت دیں، کل صبح واپسی ہے، جانا بھی میں نے تنہا ہی ہے کیونکہ میرا ساتھی ایک گاڑی ٹھیک کرانے ایک دو دن یہاں رکے گا۔''

اسی وقت کسی نے شبیر صاحب سے کہا کہ دعا کروا دیں کہ اللہ تعالیٰ سب کو حج کی سعادت نصیب فرمائے۔ اور جنہوں نے حج کر لیا ہے اُن کو دوبارہ اپنے در پر بلا لے۔

اس موقع پر منظور کہنے لگا ''میں نے تو ابھی اور گناہ کرنے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ساتھی کا بازو پکڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُن کا ساتھی کہتا بھی رہا، دعا مانگنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ منظور بولا ''بڑا فرق پڑتا ہے۔''

چناں چہ ہم دعا کرتے اور وہ دونوں باہر کھڑے ہنستے رہے۔ کچھ دیر بعد عاشق حسین انھیں پھر اندر بلا لایا۔ وہ کہنے لگا ''دعا کریں کل ان کا سفر بخیر و عافیت تمام ہو۔''

منظور اپنے بھائی سے بولا ''کل میں کوئی پہلی دفعہ گاڑی نہیں چلانے لگا، آپ دعا کو مذاق نہ بنائیں۔''

☆☆

اگلے دن نماز عصر پڑھ کر مسجد سے نکل رہا تھا تو کسی نے بتایا کہ عاشق حسین کے بھائی کا جدہ جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ چناں چہ وہ شہر جا چکا۔ وہ رات بھر واپس نہ آیا۔ ایک ہفتے بعد اُس کی واپسی ہوئی۔

بعد ازاں عاشق حسین نے بتایا کہ اس کی پرواز دوپہر کو مسقط شہر دو بجے پہنچ گئی تھی لیکن یہ معلوم کرتے کرتے کہ بھائی کس ہسپتال میں ہے، رات کے آٹھ بج گئے۔ وہ ہسپتال پہنچا۔ استقبالیہ پر بھائی کا نام بتایا تو انہوں نے کہا کہ آپ 'انتہائی نگہداشت' (ICU) کے وارڈ میں جا کر معلوم کریں۔ آئی سی یو کا سُن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میرا جسم کانپنے لگا۔ وہاں جا کر معلوم کیا۔ وہاں جو بلوچی نوجوان وارڈ کے باہر بیٹھا تھا مسکرانے لگا۔ مجھے اُس کی مسکراہٹ بہت بری معلوم ہوئی۔ میں اسے غصے سے گھور رہا تھا، کہ وہ مسکراتے ہوا بولا ''تمھارا بھائی تو مسجد گیا ہے۔ ایک گھنٹے سے وہیں

بیٹھا ہے۔ ڈاکٹر نے احتیاطاً ایک نوجوان اُس کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ آپ مسجد میں جا کر مل لیں۔"

عاشق حسین باہر نکلا اور پتا پوچھتے پوچھتے مسجد تک پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا کہ بھائی تنہا ہی مسجد کے ہال میں سجدے میں پڑا ہوا ہے۔ اُس کی سسکیوں کی اونچی اونچی آواز آ رہی تھی۔

عاشق حسین بتاتا ہے، میں خاموشی سے پچھلی صف پر جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے ایک نوجوان نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "کیا آپ نے ان صاحب سے ملنا ہے؟

میں نے کہا "ہاں یہ میرا بڑا بھائی ہے، میں اسے ملنے صلالہ سے آیا ہوں۔"

وہ کہنے لگا "گھنٹہ ڈیڑھ قبل اچانک آپ کے بھائی نے جسم پر لگی پٹیاں اتارنی شروع کر دیں۔ نرس نے پوچھا، کیا کوئی تکلیف محسوس ہو رہی ہے؟ اس نے کہا، مجھے کوئی تکلیف نہیں، میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس میں نے نماز پڑھنے مسجد جانا ہے۔

وہ نرس پریشان ہوگئی اور ڈاکٹر کو بلانے دوڑ پڑی۔ اتنی دیر میں آپ کے بھائی نے سب پٹیاں اور آلات اتار کر پرے پھینک دیے۔ بیڈ سے نیچے اتر رہا تھا کہ ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا کہنے لگا، آپ کیا کر رہے ہیں؟ اس نے ڈاکٹر کو بھی بتایا کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ مجھے بلاوجہ یہاں بیڈ پر ڈالا ہوا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا، آپ کا خیال ہے، کیا آپ چل پھر سکتے ہیں؟ وہ بولا "یقیناً" اور بستر سے نیچے اتر، ڈاکٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر اور نرس حیران و پریشان یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ معالج نے کہا، ابھی آپ کچھ دیر لیٹیے، بڑے ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔ وہ دیکھ لیں پھر آپ چلے جائیے گا۔ آپ کے بھائی نے کہا، نماز پڑھنے میں پہلے ہی دیر ہو چکی۔ میں مسجد جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے اشارہ کیا کہ ان کے ساتھ مسجد چلے جاؤ، چناں چہ میں انھیں لیے یہاں آ گیا۔"

عاشق حسین کہتا ہے، بھائی نے میری آواز سن لی۔ اُس نے سجدے سے سر اٹھایا اور ہماری طرف دیکھا، پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔ پھر میں نے بھائی سے کہا "یہاں نیچے چٹائی پر بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کہ کیا ہوا تھا، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو۔"

وہ کہنے لگا "عاشق حسین میں مر گیا تھا، یہ ماں کی دعائیں تھیں جن کے طفیل مجھے نئی زندگی عطا ہوئی۔ قسم خدا کی، میں خدا کو بھی گواہ بناتا ہوں، آج سے پرانا منظور حسین مر گیا اور ایک نئے منظور حسین نے جنم لے لیا۔"

وہ پھر بولا "تم پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا تھا؟ میرا خیال ہے کہ میری گاڑی بدقسمتی سے ہوائی بگولے کے قابو میں آ گئی۔ ہوائی بگولے نے خالی ٹرالے کو ایک فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھال دیا، اور پھر دو تین قلابازیاں دے کر ہی اُس کی جان چھوڑی۔ جب میرا ٹرالا الٹ گیا تو مجھے معلوم نہیں کہ میں کس طرح اُس سے باہر ریت پر جا گرا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ میں مر چکا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے سرہانے کی طرف سے آوازیں آئیں۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ بڑا ہی بدبخت شخص تھا۔ کہتا تھا کہ ابھی میں نے اور گناہ کرنے ہیں۔ توبہ توبہ ایسے الفاظ استعمال کرنے کی جرأت تو شیطان مردود کو بھی نہیں ہوئی تھی۔

میری ڈیوٹی لگی ہے کہ اس کی تمام ہڈیاں توڑ دی

جائیں اور جسم کی بوٹی بوٹی مسخ کردی جائے۔ میرا خیال ہے، اس کی لاش ہم دونوں یہاں سے اٹھا کر سڑک سے دور صحرا میں پھینک آئیں۔ اوپر آسمان پر دیکھو، بے حساب چیلیں اور گدھ اس کی جان پوری طرح نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ دن کو چیلیں اور گدھ اس کا گوشت نوچ نوچ کر ختم کردیں گے۔ رات کو آنی والی مخلوق اس کی ہڈیوں سے لطف واندوز ہوگی۔ آؤ ادھر سے تم اس کی ٹانگیں پکڑو۔

اچانک ایک تیسری آواز آئی، ابھی اس کا جسم گرم ہے۔ اِس کی ماں حسب معمول آج صبح بھی نماز فجر ادا کرنے کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ اس کے لیے دعائیں کرتی رہی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ معافی مانگ لے تھوڑا ٹھہر جاؤ۔

میں نے یہ سنا تو چیخ چیخ کر التجا کرنے لگا کہ اے مولا! مجھے معاف کردے۔ میں آج دوبارہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتا ہوں۔ آج کے بعد میں کوئی نماز نہ چھوڑوں گا۔ ہوش میں آتے ہی تیرے در پر مکہ میں حاضری دوں گا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگوں گا۔ باقی زندگی گناہوں سے بچنے کی پوری پوری کوشش کروں۔

مجھے پھر آواز سنائی دی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ماں کی دعاؤں کے بدلے معاف کردیا ہے۔ ایک فرشتے نے میرے جسم پر ہاتھ پھیرا اور اپنے ساتھی کو بتایا کہ میں نے اللہ کے حکم سے اس کی تمام ہڈیاں اور جسم اب نارمل حالت پر کردیا ہے۔

حادثے کی دہشت، موت کے خوف یا اللہ کے ڈر سے میرا اعصابی نظام مفلوج ہوچکا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس کی گاڑی اور ایمبولینس وہاں پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نے آتے ہی مجھے سکون دینے کے لیے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اب سے کچھ دیر قبل میں دوا کے اثرات سے نکلا تو پہلا خیال نماز پڑھنے کا آیا اور میں مسجد چلا آیا۔

اگلے دن منظور حسین اسپتال سے فارغ ہوکر اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر پہنچا۔ وہاں جاکر چھٹی کی درخواست دی اور بتایا کہ عمرہ کرنے سعودی عرب جانا ہے۔ دفتر میں ہر آدمی حیرانی سے منظور کی طرف دیکھنے لگا۔ انھوں نے ہی اسے بتایا کہ کمپنی کی تاریخ میں کسی حادثے میں گاڑی کی ایسی بری حالت نہیں ہوئی جو حشر تمہارے ٹرالے کا ہوا ہے۔ اس کے انجن کے پرزے بھی علیحدہ علیحدہ ہوگئے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ تمہارے جسم پر خراش تک بھی نہیں آئی۔

چند دن بعد منظور عمرہ ادا کرنے سعودی عرب چلا گیا۔ اُن دنوں مسجد الحرام کی توسیع کے سلسلے میں تعمیراتی کام ہورہا تھا۔ ایک دن منظور کھڑے ہوکر کام ہوتا دیکھنے لگا۔ وہاں ایک ٹرالا کھڑا تھا، دو افراد آپس میں باتیں کررہے تھے کہ ٹرالے کا ڈرائیور اچانک بیمار ہوگیا ہے، اب کیا ہوگا؟

منظور اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس نے کہا ''کچھ نہیں ہوگا، میں ٹرالا چلانے کے لیے حاضر ہوں۔'' یوں اللہ تعالیٰ نے ایک گناہ گار کو توبہ کرنے پر نہ صرف نئی زندگی دی بلکہ اپنے مقدس شہر مکہ معظمہ بلا لیا اور خانہ کعبہ میں پانچ وقت نماز پڑھنے کی سعادت عطا فرمائی۔ منظور اب کئی حج کرچکا۔ وہ پاکستان سے آنے والے حاجیوں کی ہر ممکن خدمت کرتا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے بتایا تھا کہ عاشق حسین بھی سعودی عرب چلا گیا ہے۔ کافی عرصہ سے اُن بھائیوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ خدا تعالیٰ انہیں خوش رکھے اور راہِ حق پر چلنے میں استقامت عطا فرمائے۔ ◆◆◆

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

✿ 560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے ✿ اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دِلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُر لطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ______ فون نمبر ______

پتا ______ ای میل ______

میں ماہ ______ 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -/1000 روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ______ دستخط ______

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن مینیجر۔ سمن آباد۔ لاہور 54500۔ پاکستان۔ فون نمبر: +92-42-35290738 +92-42-37589957
ای میل: subscription@urdu-digest.com ویب سائٹ: urdudigest.pk فیکس: +92-42-35290731

پارکو میں منظم طور پر ہے جاری

قومی تیل کی دن دہاڑے چوری

جرائم پیشہ افراد نے خام تیل صاف کرنے والے سب سے بڑے
پاکستانی کارخانے میں بڑی عیاری سے نقب لگا رکھی ہے
اور ملک و قوم کو اربوں روپے کا نقصان پہنچا چکے

حیرت انگیز انکشافات سے بھرپور تحقیقی رپورٹ

سجاد قادر

پارکو (PARCO) آئل ریفائنری ضلع مظفر گڑھ کے قصبہ گجرات (نزد محمود کوٹ) میں واقع ہے۔ یہ خام تیل صاف کرنے کا ملک کا بڑا کارخانہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کا ۶۰ فیصد تیل یہیں سے فراہم ہوتا ہے۔ پارکو کا قیام ۱۹۷۴ء میں حکومت ابوظہبی کے تعاون سے عمل میں آیا۔ اس میں ۴۰ فیصد حکومت ابوظہبی جبکہ ۶۰ فیصد شیئر حکومت پاکستان کا ہے۔ سعودیہ یا امارات سے بذریعہ بحری جہاز آنے والا تیل کراچی میں بن قاسم بندرگاہ یا کیماڑی پہ اُترتا ہے۔ وہاں سے محمود کوٹ تک دو ذرائع سے پہنچایا جاتا ہے: ایک ذریعہ پائپ لائن اور دوسرا ٹرانسپورٹ نظام۔ افسوس کہ ان دونوں ذرائع سے نہ صرف تیل چرایا جاتا ہے بلکہ ٹرانسپورٹ نظام اسلحہ اور منشیات کی اسمگلنگ کا بڑا ذریعہ بن چکا۔

ایک طرف تیل چوری سے قومی خزانہ ہر سال کروڑوں روپے سے محروم ہوتا ہے، تو دوسری جانب صوبہ سندھ سے لایا گیا اسلحہ اور منشیات جنوبی پنجاب کے لوگوں کی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ اِس مسئلے کا فوری سدباب نہ کیا گیا تو وہ وقت دور نہیں جب منشیات اور اسلحہ کی وبا پورے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

تیل کی چوری اور منشیات و اسلحہ کی اسمگلنگ بڑی عیاری و صفائی سے کی جاتی ہے جس میں ''ملی بھگت'' اور ''مک مکا'' کا عنصر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس دھندے کی تفصیل جان کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آنکھوں میں دھول جھونکنا تو سنا تھا یہاں تو آنکھوں میں تیل جھونکا جا رہا ہے۔

مجرموں کا طریق واردات کچھ یوں ہے: بندرگاہ بن قاسم پر جب بحری جہاز لنگر انداز ہو تو اس سے خام تیل ٹینکروں میں منتقل کیا جاتا ہے تاکہ قصبہ گجرات پارکو تک پہنچایا جا سکے۔ اس میں سے کچھ تیل مظفر گڑھ تھرمل پاور اور لال پیر پاور پلانٹ کو بھی فراہم ہوتا ہے۔ ہر آئل ٹینکر کو کراچی سے قصبہ گجرات جانے کا کرایہ ایک لاکھ اسی ہزار روپے ملتا ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ روپے آئل ٹینکر کا مالک رکھتا ہے۔ اسی ہزار روپے ٹینکر کے ڈرائیور، کلینر وغیرہ، ایندھن اور کھانے پینے کی مد میں رکھتے ہیں۔ تاہم ان کا حرص اور لالچ اس رقم تک نہیں رکتا۔ وہ نہ صرف تیل چوری کرتے بلکہ آئل ٹینکر میں اسلحہ اور منشیات بھی چھپا کر لاتے اور رحیم یار خان یا مظفر گڑھ بیچ دیتے ہیں۔ منشیات زیادہ تر مظفر گڑھ تک آتی ہے۔ جبکہ اسلحہ کا کاروبار ضلع رحیم یار خان میں ہوتا ہے۔

بندرگاہ بن قاسم پر تیل بھرنے سے ایک دن قبل ڈرائیور حضرات کے پاس اسمگل ہونے والا اسلحہ یا منشیات پہنچ جاتی ہے۔ سامان ''آئل پروف'' مخصوص ڈبے میں بند ہوتا ہے تاکہ خراب نہ ہو۔ منشیات عموماً چرس، افیون یا ہیروئن پر مشتمل ہوتی ہے۔ ڈرائیور یا اس کا ساتھی ٹینکر کے اندر گھستے ہیں۔ ٹینکر کے اندر چار خانے یا حصے ہوتے ہیں۔ ہر حصے میں دس ہزار لیٹر تیل بھرا جاتا ہے۔ گویا پورے ٹینکر میں کل چالیس ہزار لیٹر تیل ہوتا ہے۔ ہر حصے میں فولادی سلاخوں سے ایک جنگلہ بنا ہے تاکہ ٹینکر اندر سے مضبوط اور کسی حادثے کی صورت میں ٹیڑھا ہونے سے محفوظ رہے۔ ایک شخص ٹینکر کے اندر وہ ڈبا فولادی جنگلے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ آتا ہے۔

اگلے مرحلے میں یہ ٹینکر تیل بھرائی کے مقام پر پہنچتا ہے۔ وہاں ٹینکر کا ڈرائیور تیل بھرنے والے کے ہاتھ میں لگی بندھی رقم تھماتا اور ہدایت دیتا ہے کہ اتنے لیٹر تیل زیادہ بھر دو۔ وہ خاموشی سے چار خانوں میں سے کسی ایک یا سب میں تھوڑا تھوڑا اضافی تیل ڈال دیتا اور ٹینکر والے کو آگاہ کرتا ہے کہ پہلے، دوسرے، تیسرے یا چوتھے میں

ہے کس حصے میں اس نے پانچ سو، ہزار یا دو ہزار لیٹر تیل زیادہ ڈالا ہے۔ تیل ڈالنے کے بعد ٹینکر کے بالائی ڈھکن پہ سیل لگتی ہے۔ تیل ڈالنے والا شخص ہی سیل لگاتا ہے۔ اسے چونکہ رشوت مل چکی ہوتی ہے لہٰذا وہ نقلی اور غلط نمبر والی سیل ڈھکن پہ لگاتا اور اصلی ٹینکر والے کو دے دیتا ہے۔

ٹینکر آگے بڑھتا ہے۔ اب ایک افسر سیل چیک کرنے آتا ہے۔ ٹینکر پر چڑھنے سے قبل ہی اُس کی جیب بھی بھاری کر دی جاتی ہے۔ چناں چہ وہ بھی ''سب ٹھیک ہے'' کی رپورٹ دیتا ہے۔ اکثر اوقات افسر خود ٹینکر پر

وہیں اضافی تیل بیچتے ہیں جو انھوں نے رشوت دے کے بھرایا ہوتا ہے۔ تیل فروخت کرنے کے بعد وہ چاروں حصوں کے ڈھکنوں پر اصل سیلیں لگا کر چل پڑتے ہیں۔

کراچی سے محمود کوٹ تک راستے میں برلب سڑک کئی بڑے ہوٹل اور ریستوران آتے ہیں۔ ان میں سے کئی ہوٹلوں میں اسلحہ اور منشیات بآسانی دستیاب ہے۔ ٹینکر والے ہوٹل پر آ کر کھانا کھاتے اور آرام کرتے ہیں۔ پھر کسی بیرے یا اپنے واقف کار کو مخصوص الفاظ میں کہتے ہیں ''سگریٹ پینی ہے۔'' وہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ چرس وغیرہ

قصبہ گجرات میں واقع پاک عرب ریفائنری

چڑھنے کے بجائے اپنے کسی خاص آدمی کو کہتا ہے کہ وہ سیل چیک کر لے۔ چناں چہ وہ رشوت لینے کے بعد اپنا حصہ رکھ صاحب کی مٹھی گرم کرتا ہے۔ اگلے مرحلے میں ٹینکر ایک کنڈے پر پہنچتا ہے جہاں اس کا وزن ہوتا ہے۔ اس جگہ مامور ملازم بھی اپنے حصے کی رقم پاتا اور ''سب اچھا ہے'' کی رپورٹ دیتا ہے۔ اس مرحلے کے بعد ٹینکر ڈرائیور کو دو عدد پرچیاں ملتی ہیں۔ ٹینکر پھر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتا ہے۔ اکثر ڈرائیوروں کا اسٹاپ شکارپور میں واقع تیل ایجنسیاں ہوتی ہیں۔ وہ

مانگ رہے ہیں۔ جواباً بندہ کہتا ہے ''ایک یا دو؟'' مطلب یہ کہ ایک کلو یا دو کلو؟ مقدار پوچھنے کے بعد وہ متعلقہ شخص کے پاس جا کے کہتا ہے کہ فلاں بندہ سگریٹ یا اسلحہ مانگ رہا ہے۔ چناں چہ انھیں مطلوبہ چیز مل جاتی ہے۔

ٹینکر والے منشیات یا اسلحہ لے کے اسے پیک کرتے پھر گاڑی کا کمپریسر یا انجن کھول اس کے اندر رکھ دیتے ہیں۔ راستے میں پولیس ٹینکر نہیں روکتی کیونکہ ان میں سرکاری تیل لدا ہوتا ہے۔ روک بھی لے تو وہ ٹینکر کے ڈھکنوں پر لگی سیل نہیں کھول سکتی۔ اگر سپاہی یا انسپکٹر

سیل کھول دے تو تیل چوری ہونے کی تمام تر ذمے داری اس پر عائد ہوگی۔ لہٰذا پولیس اس پھڈے سے جان چھڑاتی اور اپنا خرچہ پانی لے کے ٹینکر کو جانے دیتی ہے۔

اگر کسی آئل ٹینکر سے متعلق پولیس والوں کو پکی مخبری ہو جائے اور افسر بھی ایماندار نکلے تو وہ ٹینکر کے پہیے، ٹول بکس، اور نشستیں دیکھیں گے۔ ڈرائیور کے آرام کرنے والے کیبن کی تلاشی لیں گے اور بس..... سیل کھولنے کے وہ پھر بھی مجاز نہیں۔ سیل قصبہ گجرات (پارکو) پہ موجود مجاز اہلکار ہی کھول سکتا ہے۔ اسلحہ اور منشیات جو گاڑی کے

چیزیں ضرور مل جائیں گی۔ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ سڑک کنارے بنے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کھوکھے جہاں صرف بظاہر چائے ہی ملتی ہے، وہ بھی اسمگلنگ کے اڈے ہیں۔

اکثر کھوکھے، بنجر اور ویران جگہ پر واقع ہوتے ہیں۔ ان کے اردگرد کوئی عمارت یا آبادی نہیں ہوتی۔ ان کھوکھوں کی پچھلی طرف ریتلے ٹیلے ہوتے ہیں۔ کھوکھے والے ان ٹیلوں کے نیچے تہ خانے بناتے اور وہاں منشیات و اسلحے کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ تہ خانے کو جھاڑیاں، گھاس پھوس، کوڑا

بن قاسم میں خام تیل لاتا بحری جہاز

کمپریسر اور انجن میں چھپا ہے، راستے میں کسی کو دینا ہو تو وہاں دے دیا جاتا ہے۔

راستے میں آنے والے اکثر ہوٹلوں میں منشیات اور اسلحہ بآسانی مل سکتا ہے۔ آئل ٹینکر کے ڈرائیوروں کا دعویٰ ہے، کراچی، حیدر آباد، نواب شاہ اور سکھر میں منشیات کے سوداگر موجود ہیں۔ وہ بھی پنجاب تک اپنا مال پہنچانے کے لیے آئل ٹینکر استعمال کرتے ہیں۔ اسمگلنگ میں شریک کار سبھی لوگ اپنا اپنا حصہ پاتے ہیں۔ جس ہوٹل کے نام میں موسیٰ خیل یا خٹک کا لفظ آئے، وہاں سے آپ کو دونوں

کرکٹ وغیرہ رکھ کے اس طرح کیموفلاج کیا جاتا ہے کہ کسی کو ذرا برابر شک نہیں ہوتا کہ یہ بنجر زمین ہے یا اسلحہ اور منشیات سے اٹا پڑا گودام! اس کے صرف ایک طرف اندر جانے کا چھوٹا سا راستہ ہوتا ہے۔ جب تہ خانے میں جائیں تو حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے کہ اسلحے اور منشیات کا کتنا بڑا ڈپو بنا ہوا ہے۔

جب آئل ٹینکر (قصبہ گجرات) پہنچ جائے تو وہاں ایک دفتر پر اسے ٹوکن ملتا ہے۔ مثلاً ٹوکن نمبر 110 مل گیا چونکہ ایک دن میں تیس ٹینکر خالی ہوتے ہیں لہٰذا ڈرائیور کو

اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی باری تین دن بعد آئے گی۔ چناں چہ وہ آرام سے اپنے کام نپٹاتا ہے۔ جو اسلحہ یا منشیات اس نے کمپریسر یا انجن میں چھپائی تھی، اسے نکال کر بیچ آتا یا کسی اسمگلر کو دے آتا ہے۔

اسمگل شدہ سامان نکالنے کے لیے بھی انھیں کچھ ناٹک رچانا پڑتا ہے کہ انجن میں کوئی خرابی ہے۔ لہٰذا بونٹ کھول انجن اُدھیڑ ڈالتے ہیں۔ رات کے کسی پہر مطلوبہ شے نکال انجن دوبارہ جوڑ دیا جاتا ہے۔ یوں کسی کو شک نہیں ہوتا کہ مرمت ہو رہی ہے یا کچھ اور......

اسمگلنگ کے کئی واقعات ڈرائیوروں یا کلینروں کی وساطت سے زبان زد عام ہوئے۔ وہ ایک شخص کے متعلق بتاتے ہیں کہ ٹینکر پر بطور ڈرائیور کے مددگار آیا تھا۔ آج اس کے اپنے تین آئل ٹینکر ہیں۔ ہر سال ماں کو حج کراتا ہے اور خود بھی عمرے پر جاتا ہے۔ ایک ڈرائیور نے مجھے بڑا حیران کن واقعہ سنایا۔ میانوالی کا ایک ڈرائیور بڑا ایماندار تھا۔ پہلے دن جب وہ تیل سے بھرا ٹینکر پارکو میں خالی کرنے آیا تو افسر نے حسب معمولی اس سے خرچہ پانی مانگا۔ ڈرائیور نے کہا ''میں نے کسی قسم کی بے ایمانی نہیں کی اور نہ تیل بیچا۔ آپ بے شک اپنا نمونہ چیک کرلو۔''

افسر نے کہا ''آپ تیل بیچو یا نہ بیچو، ہمیں ہمارا خرچہ چاہیے۔'' اس بات پہ ان کی تکرار ہوگئی۔ افسر نے کہا تم کسی دن تیل کا ایک لیٹر بھی بیچ کے دکھاؤ تو میں تمھیں جیل بھجوا دوں گا۔ ڈرائیور نے کہا کہ تم ایک لیٹر کی بات کرتے ہیں، میں تمھیں ۴۰۰۰۰ لیٹر کا پورا ٹینکر بیچ کے دکھاؤں گا۔ یوں اس بات پہ افسر اور ڈرائیور کی آپس میں ٹھن گئی۔

اب جب بھی ڈرائیور پارکو میں تیل اُتارنے آتا تو افسر اُسے اپنا چیلنج یاد دلاتا۔ کچھ عرصہ گزرا تھا کہ وہ تیل بھرنے کی غرض سے کراچی پہنچا۔ اس نے تیل بھرنے والے شخص کو رشوت دے کر اصل سیلیں خود لے لیں اور نقلی ڈھکنوں پر لگوا لیں۔ پھر شکارپور پہنچ کے سارا تیل ایک ایجنسی پر بیچ دیا۔ ہر خانے میں صرف پانچ

آئل ٹینکروں کی قطار

چھے سو لیٹر تیل باقی رہنے دیا اور اصل سیلیں ڈھکنوں پر لگا دیں۔ تیل بیچ کے وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چل پڑا۔ راستے میں بارش شروع ہوگئی۔ اسی دوران ٹینکر گڈو بیراج پہنچا۔

ڈرائیور دانستہ ٹینکر آہستہ چلا رہا تھا۔ اس کے پیچھے تین چار ٹینکرز اور بھی تھے۔ اسی اثنا میں پیچھے سے ایک کار نمودار ہوئی۔ اس نے بتیاں جلا کر راستہ دینے کا اشارہ کیا۔ جب ڈرائیور نے کار والے کو راستہ مانگتے دیکھا تو نہ صرف ٹینکر کی رفتار بڑھائی بلکہ اُسے سڑک کے درمیان میں لے

آیا۔ جب کار والے نے ہارن دیا تو ڈرائیور نے یکدم ٹینکر کو بائیں طرف موڑ دیا۔ بارش کی وجہ سے پھسلن تھی۔ ٹینکر اپنی لمبائی کی وجہ سے جھول کھا گیا اور پل کا جنگلہ توڑتا دریائے سندھ میں جا گرا۔ ڈرائیور چھلانگ لگا کے جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے معمولی چوٹیں آئیں۔ پیچھے آنے والے ٹینکر اور کار بھی رک گئی۔ کار والے نے کہا کہ ڈرائیور نے جان بوجھ کے ٹینکر دریا میں گرایا ہے۔ مگر دیگر ڈرائیور اس پہ الزام لگانے لگے کہ کار کو بچاتے ہوئے ٹینکر بے قابو ہو کر دریا میں گرا۔ لہٰذا کار والے کو پولیس کے حوالے ہونا چاہیے۔ کار والا تنہا تھا اور پندرہ سولہ لوگ۔ لہٰذا وہ بڑی مشکل سے خود کو بچا کے فرار ہو گیا۔

ٹینکر دریا میں گرتے ہی بالائی ڈھکن ٹوٹے اور اُس میں موجود تیل دریا کے پانی میں شامل ہو گیا۔ ٹینکر کے مالک، مقامی پولیس اور پارکو انتظامیہ کو حادثے کی اطلاع بذریعہ فون دی گئی۔ زخمی ڈرائیور کو اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ تحقیقاتی ٹیم آئی۔ انھوں نے سب کے بیان قلم بند کیے۔ دریائی پانی میں بہتے تیل کا نمونہ لیا۔ ٹینکر کے ڈھکنوں پر لگی اصلی سیل چیک کی اور اپنی رپورٹ میں اسے حادثہ قرار دے کر ڈرائیور کو بری الذمہ قرار دیا۔ ٹینکر چونکہ انشورڈ تھا لہٰذا سرکاری رپورٹ مدنظر رکھتے ہوئے انشورنس والوں نے مالک کو ٹینکر بنوا کے دیا۔ مالک کو پارکو کی طرف سے کرایہ ایک لاکھ اسّی ہزار روپے بھی ملا۔ صحت یاب ہونے کے بعد ڈرائیور پھر اپنی ملازمت پر پہنچ گیا۔ پارکو جا کر اس افسر کو چیلنج یاد دلایا اور کہا ''میں نے اپنے وعدے کے مطابق تیل سے بھرا ٹینکر بیچ ڈالا ہے۔ اب تم سے جو ہوتا ہے کر لو۔'' سرکاری طور پر بھی یہ واقعہ حادثہ بن چکا تھا۔ لہٰذا افسر عالم بے چارگی میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔

ایک ٹینکر میں اسمگلنگ کا سامان پکڑا گیا

ڈرائیور اور اس شعبے سے وابستہ دیگر لوگ ایسی کئی انوکھی کہانیاں سناتے ہیں۔ ٹینکر خالی ہونے کی باری آئے، تو ڈرائیور اسے پارکو کے مین گیٹ پر لے آتا ہے۔ وہاں پر سیکیورٹی گارڈ سیلیں چیک کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں یا نہیں۔ مگر وہ شخص رشوت لے کے بغیر چیک کیے ٹینکر اندر داخل کر دیتا ہے۔ اگلے مرحلے میں ٹینکر کا وزن ہوتا ہے۔ وہاں تعینات عملہ بھی اپنے حصے کی رشوت پاتا ہے۔ اس کے بعد ڈرائیور یا اس کا مددگار ڈھکنوں پر لگی سیلیں کھول دیتا ہے۔ پھر پیمانہ بردار اور افسر ٹینکر پر چڑھتے ہیں۔ وہ ہر خانے میں پیمانہ ڈال کے تیل کی پیمائش کرتے اور نمونہ لیتے ہیں۔ نمونہ دیکھنے کے لیے لیبارٹری بھجوا دیا جاتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ تو نہیں ہوئی۔ ان کی بھی مٹھی گرم ہوتی ہے۔

ٹینکر پھر تیل کے تالاب کی طرف بڑھتا ہے۔ اب نیچے اترنا سختی سے منع ہے۔ لیکن یہاں بھی چور ہیرا پھیری سے باز نہیں آتے۔ اب جس شخص نے گاڑی سے تیل نکالنا ہو وہ ڈرائیور سے کہتا ہے کہ "استاد کوئی خرچہ پانی؟"

ڈرائیور اسے بھی چار پانچ سو روپے دیتا اور ساتھ ہی ہدایت کرتا ہے کہ کس خانے میں کتنا تیل باقی چھوڑنا ہے۔ حسب وعدہ تیل نکالنے والا شخص کسی ایک خانے میں مقرر شدہ تیل رہنے دے گا۔ پھر ڈرائیور کو بتائے گا کہ ٹینکر کے کون سے خانے میں تیل ہے۔

اب ٹینکر وہاں پہنچے گا جہاں خانوں کی صفائی ہوتی ہے۔ صفائی والے کو بھی پہلے کچھ پیسے دے کر بتایا جاتا ہے کہ ٹینکر کے فلاں حصے میں تیل ہے۔ لہٰذا وہ اس خانے میں برش نہیں مارتا۔ مارتا بھی ہے تو ہلکا سا برش چلا دیتا ہے۔ صفائی والا سلسلہ آگے بھی دو جگہوں پر انجام پاتا ہے۔ وہاں بھی آسانی سے کھل کر رشوت چلتی ہے۔ یوں ٹینکر گزر جاتا ہے۔ آخر میں ہاتھ میں ٹارچ لیے ایک آدمی آتا ہے۔ اس کا کام ٹینکر کے اندر ٹارچ جلا کر دیکھنا ہے کہ تیل واپس تو نہیں جا رہا۔ وہ صاحب بھی ٹینکر پر چڑھے بغیر اپنے حصے کی رقم لے کر اُسے جانے دیتا ہے۔

اب ٹینکر والے کو کاغذی پرچیاں مہر لگا کے تھمائی جاتی ہیں جو کراچی سے لایا تھا اور ٹوکن ملنے والی جگہ پر جمع کرائی تھیں۔ ڈرائیور پرچیاں لیے اور "سب ٹھیک ہے" کی مہر لگوا ٹینکر لیے پارکو سے باہر آ جاتا ہے۔ پھر سیدھا کسی ایجنسی میں پہنچتا ہے تاکہ ٹینکر میں موجود تیل فروخت کر سکے۔ پھر ٹینکر دھلانے چلا جاتا ہے۔

یوں بڑے منظم طریقے سے منشیات و اسلحے کی اسمگلنگ ہو رہی ہے اور مختلف طریقوں سے قومی تیل کی چوری بھی! اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ پارکو کے اعلیٰ حکام مجرموں کی راہ روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کریں ورنہ یہ قومی ادارہ بھی لیسکو اور ریلوے کی طرح سنگین مالی مسائل کا شکار بن سکتا ہے۔

اعلیٰ سطح پر تیل چوری کا ایک اور ذریعہ بھی ہے..... وہ یہ کہ پائپ لائن پر نلکا لگا کر تیل نکالا جاتا ہے۔ اس قسم کے زیادہ تر واقعات قصبہ گجرات سے لے کر کوٹ ادو تک کے علاقے میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ماضی میں ایسے کئی واقعے رونما ہو چکے۔ پولیس مجرموں کے خلاف کارروائی تو کرتی ہے مگر آئندہ جرم کا راستہ روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات نہیں کیے جاتے۔

پائپ لائن پر نلکا لگا کے تیل چوری کرنے کا طریقہ بھی انوکھا ہے۔ طریق واردات یہ ہے کہ پائپ لائن جس لالچی شخص کی زمین سے گزر رہی ہو، وہاں وہ اپنا گھر بنا لیتا ہے۔ پھر وہاں کھدائی کر کے پائپ لائن پر نلکا لگاتا اور رات کے وقت تیل کے ٹینکر بھر بھر کے بیچتا ہے۔

پائپ لائن پر نلکا آسانی سے نہیں لگ سکتا، اس کے لیے کسی سرکاری افسر کا تعاون ضرور درکار ہوتا ہے' کیونکہ عام حالات میں پائپ لائن میں سوراخ کریں، تو بہتے تیل کا دباؤ اتنا ہوتا ہے کہ پائپ دھماکے کی صورت پھٹ جاتا ہے۔ تاہم اسے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جب تیل کی فراہمی بند ہو۔ تبھی پائپ میں سوراخ کر کے نلکا فٹ کرنا ممکن ہے۔

چناں چہ جس وقت تیل کی فراہمی بند ہوتی، کوئی متعلقہ افسر فون کر کے بتا دیتا ہے کہ اس وقت پائپ لائن خالی ہے۔ لہٰذا وہ اپنا کام تسلی سے کریں۔ تیل بند ہونے کی اطلاع ملتے ہی جرائم پیشہ لوگ فوراً پائپ لائن کے ساتھ گڑھا کھودتے ہوئے اس میں سوراخ کرتے اور نلکا لگا پھر گڑھا بند کر دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل یہ خبر اخباروں کی زینت بنی تھی کہ قصبہ گجرات میں پارکو کے بالکل سامنے، سڑک کی دوسری طرف کچھ لوگوں نے ایک عمارت تعمیر کر لی پھر عمارت کے اندر سے سرنگ کھود کر مین سڑک سے نیچے جا کے پارکو کی پائپ لائن پر نلکا لگایا اور تیل بیچ کے خوب دھن دولت کمایا۔ بعد میں چوری کا پتا چلنے پر ان کے خلاف قانونی کارروائی ہوئی۔ پھر بھی تیل چوری اور منشیات کی اسمگلنگ روکنے کے خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے گئے تاکہ ملک و قوم اس عظیم نقصان سے بچ سکے۔

دراصل یہ جرائم کچھ افسروں اور سیاسی راہنماؤں کی ملی بھگت سے انجام پاتے ہیں۔ اس لیے ملزمان پر شکنجہ کسا اور نہ ہی ان کے قلع قمع کا کوئی موثر توڑ نکالا جاتا ہے۔ اندر کے بعض لوگ بتاتے ہیں، کچھ افسر تیل سے بھرے پورے ٹینکر غائب کر دیتے ہیں۔ جب افسروں اور کرتا دھرتا افراد کے اپنے ہاتھ ہی چوری و اسمگلنگ کی گندگی میں لتھڑے ہوں، تو ان جرائم کا سدباب کیسے ممکن ہے؟

پائپ لائن میں لگا نلکا

یہ واضح رہے کہ پارکو میں ۴۰ فیصد حصص حکومت ابوظہبی کے ہیں۔ اس کے باوجود پارکو میں تیل چوری و منشیات اسمگلنگ کے واقعات روکے نہیں جا سکے۔ دوسری سمت آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن کمپنی لمیٹڈ یا او جی ڈی سی میں ۷۴ فیصد حصص حکومت پاکستان کے ہیں۔ یہ سرکاری کمپنی مختلف مقامات سے روزانہ ہزارہا بیرل خام تیل نکالتی اور ریفائنریوں کو بھجواتی ہے۔ پارکو میں جاری دھندا دیکھ کر یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ وہاں بھی تیل و گیس چوری کے قبیح واقعات جنم لیتے ہوں گے۔

ہمارے وطن میں بجلی چوری ہوتی ہی تھی، اب تیل چوری ہونے کے واقعات بھی ہونے لگے ہیں۔ لالچ و ہوس میں ڈوبے یہ پاکستانی چوری، ڈاکے اور کرپشن کے ذریعے اپنے ہی دیس کو دیوالیہ بنا سکتے ہیں۔ کرپشن روکنے کا ایک موثر طریق کار یہ ہے کہ تمام سرکاری محکموں اور اداروں میں ایمان دار و اہل افسر بھرتی کیے جائیں۔ یوں کرپشن ختم نہ ہوئی، تو کم ضرور ہو جائے گی۔

کاش اپنے ہی ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے پاکستانی یہ حقیقت ذہن نشین کر لیں کہ چاہے وہ اربوں کھربوں روپے بے ایمانی سے کما لیں، ان کا آخری ٹھکانا تین گز کی قبر ہی بنے گی۔ اور کرپشن سے بنائے محل و چوبارے دنیا ہی میں رہ جائیں گے۔ تین سو برس قبل نظیر اکبر آبادی انسان کو خبردار کر گئے تھے:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں
مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے، دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گونی، پلا سربھارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارا

◆●●

بارہ روپے میں دو چائے

ایک کفایت شعار باپ نے عملی قدم اٹھا کر بیٹے کو جینے کا ڈھنگ سکھا دیا

بشیر احمد بھٹی

اتوار کا دن تھا۔ سرکاری تعطیل ہونے کے باعث باپ بیٹا' دونوں گھر میں موجود تھے۔ بیٹے نے والد سے کہا "چلیے باوا جانی! ہوٹل سے اچھی سی چائے پی کے آتے ہیں۔"

باپ ذرا کنجوس طبیعت کا مالک تھا۔ بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "جانتے ہو' ہوٹل کی چائے کتنے کی ہے؟...... بیس روپے۔ اگر ہم نے وہاں دو پیالی چائے پی تو چالیس روپے خرچ ہو جائیں گے۔ اس رقم سے تو ایک وقت کی سبزی خریدنا ممکن ہے۔ چناں چہ ہوٹل سے چائے پینا بے وقوفی ہے۔ یہی چائے گھر بنا کے پی جائے تو سستی پڑے گی۔ بیٹے! کفایت شعاری کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ تم بیٹھو، میں تمہیں چائے بنا کے پلاتا ہوں۔ ساتھ ہی تمہیں اس پر آنے والا خرچ بھی بتاؤں گا۔"

یہ کہہ کر باپ باورچی خانے میں گھس گیا۔ سوئی گیس والا چولھا جلایا' دیگچی میں ڈیڑھ پیالی پانی ڈالا۔ پانی میں اُبال آیا تو دو چھوٹے چمچ پتی کے ڈالے۔ پھر چار چمچ چینی ڈالی۔ اُبلتے پانی میں پتی نے خوب رنگ نکالا۔ آخر میں بوڑھے کنجوس نے ایک پیالی دودھ ڈالا تو چائے "اسٹرانگ" ہوگئی۔

دو چار اُبالے آئے تو چائے دو پیالیوں میں انڈیلی۔ دونوں پیالیاں لبریز ہوگئیں۔ دیگچی میں کچھ چائے بچ بھی

گئی۔ بوڑھے کفایت شعار باپ نے پیالیاں ٹرے میں رکھیں اور کمرے میں لے آیا۔ ٹرے میز پر رکھی اور بیٹے سے مخاطب ہوا ''سنو، پتا ہے، اس چائے پر کل کتنا خرچ آیا؟''

بیٹے نے استفسار طلب نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا۔

باپ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ''پانی مفت کا۔ دو چمچ پتی دو روپے اور چار چمچ چینی تین روپے کی، دودھ پانچ روپے کا۔ دو روپے کی گیس خرچ ہوئی۔ لو! بارہ روپے میں دو پیالی چائے تیار۔ یوں اٹھائیس روپے کی خصوصی بچت ہوئی۔ اگر ہم پورے دن تین بار دو دو پیالی چائے پئیں تو تمام دن ہمارا کل خرچہ چھتیس روپے ہو گا۔ اوپر کے چار روپے بھی بچے۔ گویا گھر میں ہم چھے پیالی چائے چھتیس روپے میں پی سکتے ہیں، لیکن ہوٹل پر جا کر یہ چائے پئیں تو ایک سو بیس روپے خرچ ہوں گے۔ یہ ہوئی نا بات۔ ہم گھر بیٹھ کے دن میں بہترین چائے کی پیالیاں پی سکتے ہیں۔ اس طرح چوراسی روپے کی شاندار بچت ہو گی۔ جنگل میں بین بجاوے جوگی، سنسار میں باجے ڈھول، دنیا میری طرح ہے گول کہ پیسا بولتا ہے۔ بیٹے! انسان اگر عقل سے کام لے، کفایت شعاری کا دامن تھام لے تو کبھی تنگ دستی گھر کا دروازہ نہ دیکھے۔ تم ابھی نادان ہو، میں اُڑتی چڑیا کے پر گن سکتا ہوں۔''

بیٹے نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''ابا جان! چڑیا کے پر تو میں بھی گن سکتا ہوں۔ میں کیا...... سب کو علم ہے کہ چڑیا کے دو پر ہوتے ہیں۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو کہ سب چڑیا کے پر گن لیں۔ بیٹے، بات یہ ہے کہ یہی چائے کسی دور میں ایک آنے کی ملتی تھی۔ پھر دو آنے کی ہوئی۔ پھر اٹھنی کی ہوئی۔ ساتھ ہی کولڈ ڈرنک یعنی بوتل کا دور آ گیا۔ اب چائے اور بوتل کی قیمتوں میں دوڑ شروع ہوئی۔ جب چائے تین روپے کی ہوئی تو بوتل کا نئی کس ریٹ سات روپے تھا۔ چائے چار روپے کی ہوئی تو بوتل نو روپے کی ہو گئی۔ چائے پانچ روپے کی ہوئی تو بوتل بارہ روپے تک جا پہنچی۔ یہ مقابلہ زور شور سے جاری رہا۔ چائے کچھوے کی چال چلتے ہوئے بیس روپے فی پیالی تک جا پہنچی۔ پھر مجبوراً بوتل بھی بیس روپے میں فروخت ہونے لگی۔ مہنگائی کا یہ عفریت حکمرانوں کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''مہنگائی کا جن غریبوں کی گردن دبوچتا ہے، امیروں پر اس کا داؤ نہیں چلتا۔ میرے بچے ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ یہ چائے غریب مزدوروں کی خوراک ہے۔ میٹھی چائے پینے سے بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک کا مزدور طبقہ چائے پر چل رہا ہے۔ یہ شے مزدور کو ملتی رہے تو وہ بارہ گھنٹے کام کر سکتا ہے، مگر حکومت ہر اس چیز کو مہنگا کر دیتی ہے جو مزدوروں کی ضرورت ہے۔ چائے پینے سے کھانے کی طلب نہیں رہتی۔ اگر یہ چائے نہ ہوتی تو اس ملک میں خوراک کی کمی ہو جاتی تھی۔''

بیٹے کو لیکچر دیتے ہوئے باپ نے ایک پیالی اٹھا کے اسے دی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ بیٹے نے بلب جلا رکھا تھا۔ باپ بیٹا چائے پینے لگے تو باپ نے اُٹھ کر بلب بجھا دیا۔

بیٹے نے پوچھا ''آپ نے بلب کیوں بجھایا؟''

باپ نے جواب دیا ''بے وقوف بات سمجھا کرو۔ ہم دونوں بارہ روپے کی کفایت شعاری والی چائے پی رہے ہیں۔ اگر بلب جلتا رہا تو چائے پینے تک دس روپے کی بجلی خرچ ہو جائے گی۔ اس طرح یہ بارہ روپے والی چائے ہمیں بائیس روپے میں پڑے گی۔ یعنی ہوٹل کی چالیس روپے والی چائے سے دو روپے کا زیادہ خرچہ ہو گا۔ پھر ایسے کام کا فائدہ؟ کفایت شعاری کریں اور خرچہ ہوٹل کی چائے سے بھی زیادہ ہو! بات کی تہ تک پہنچا کرو۔ میرے نادان اور بے وقوف بیٹے۔''

◆◆◆

جہاں قائدؒ نے قیام فرمایا

وہ خوش نصیب عمارتیں

بابائے قوم کی عظیم ذات سے وابستہ رہنے والی تاریخی عمارتوں کا دلچسپ تذکرہ

رانا محمد شاہد

انسان جس جگہ رہے، اُس سے دلی قربت ہو جانا فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معروف شخصیات جس جگہ ٹھہریں یا کچھ عرصہ قیام کریں، وہ مشہور ہو جاتی ہے۔ بانیٔ پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے سے بھی بعض عمارات مشہور ہیں۔ ذیل میں چند ایسی عمارات و جگہوں کا تذکرہ پیش ہے جو کسی نہ کسی طور قائداعظم سے منسوب ہوئیں۔

وزیر مینشن

یہ عمارت کراچی کے علاقے کھارادر میں برکاتی اسٹریٹ میں واقع ہے۔ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۷۰ء کے درمیانی عرصے میں یہ عمارت تعمیر ہوئی۔ تاریخی اہمیت کی حامل اسی عمارت میں قائداعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین ۱۸۷۴ء میں کاٹھیاوار سے کراچی آئے تو وہاں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۸۷۲ء میں آپ کے والد نے یہ عمارت بغرض رہائش خریدی۔ اس چار منزلہ عمارت کی پہلی منزل پر دکانیں تھیں۔ اوپر رہائش کا حصہ تھا۔ عمارت کی تعمیر میں پہاڑی پتھروں کے بلاک، چونا، پٹ سن کے ریشے اور گارا استعمال ہوا۔ اس کا رقبہ تقریباً ۱۲۵ مربع گز ہے۔ قائداعظم کے والد بیس سال اس عمارت میں رہائش

پذیر رہے۔ اسی میں قائداعظم کے علاوہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اور محترمہ شیریں بائی نے بھی جنم لیا۔ فاطمہ جناح کی پیدائش (۱۸۹۳ء) کے بعد جناح پونجا کسی اور عمارت میں منتقل ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں یہ عمارت مقامی تاجر، وزیر علی پونہ والا نے خرید لی۔ اسی کے نام سے یہ عمارت بطور وزیر مینشن مشہور ہوئی۔

نومبر ۱۹۵۲ء میں کراچی کے میئر نے تجویز دی کہ قائد کی اس رہائش گاہ کو قومی یادگار کا درجہ دیا جائے۔ چناں چہ حکومت پاکستان نے ۱۹۵۳ء میں عمارت وزیر علی سے خرید کر اپنی تحویل میں لی اور تعمیرِ نو شروع کر دی۔ ۱۴راگست ۱۹۵۳ء کو عمارت محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دی گئی۔ پھر اسے عجائب گھر میں تبدیل کیا گیا۔ اب عمارت کی پہلی منزل پر کتب خانہ اور مطالعہ گاہ واقع ہے۔ دوسری منزل پر برآمدہ ہے اور ساتھ تین کمرے ہیں۔ ان کمروں میں قائد کے زیرِ استعمال اشیا مثلاً صوفہ، سائیڈ ٹیبل، مسہری وغیرہ موجود ہیں۔ تیسرے کمرے میں جہاں قائداعظم کی پیدائش ہوئی، وہاں جنم دن کی تاریخ کندہ ہے۔ قائد کی ذاتی کتابوں کی الماری، میز اور کرسی بھی رکھی نظر آتی ہیں۔

سندھ مدرستہ الاسلام

مسلمانوں کی ایک قدیم درس گاہ...... سندھ مدرستہ السلام ۱۸۸۵ء میں خان بہادر حسن علی آفندی نے قائم کی۔ خان بہادر حسن علی آفندی نے اس مدرسے کو بطور خاص مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بنایا تھا۔ عمارت کی تعمیر پر ۱۸۸،۱۹۷ روپے (کم و بیش) لاگت آئی۔ اس میں سے نصف مقامی حکومت نے ادا کیے جبکہ باقی رقم شہر کے مخیّر حضرات کی مدد سے اکٹھی ہوئی۔

ابتدا میں یہ مدرسہ بولٹن مارکیٹ کے نزدیک بند روڈ پر ایک دو منزلہ عمارت میں واقع تھا۔ ۱۸۹۰ء میں سندھ مدرسہ کی موجودہ عمارت کی تکمیل پر اسے وہاں منتقل کر دیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح اس مدرسے کے نمایاں ترین طالب علم ہیں۔ آپ اس ادارے میں تین بار داخل ہوئے۔ پہلے بعمر دس سال گجراتی زبان کی چوتھی جماعت میں آپ کو داخل کیا گیا۔ پھر آپ بمبئی انجمن الاسلام اسکول میں پڑھنے لگے جہاں قائد نے گجراتی کی چوتھی جماعت پاس کی۔

والدین نے بتاریخ ۲۳ردسمبر ۱۸۸۷ء دوسری بار بیٹے کو سندھ مدرسے میں داخل کروایا۔ پھر تبدیلی کے رجحان کی وجہ سے قائد کے کہنے پر ۵ فروری ۱۸۹۱ء کو انھیں لارنس روڈ (کراچی) پر واقع سی ایم ایس ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ قائداعظم ۹ فروری ۱۸۹۱ء کو تیسری بار ادارے میں انگریزی کی چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔ ۳۰ جنوری ۱۸۹۲ء کے دن انھوں نے

سندھ مدرستہ اسلام کو خیر باد کہہ دیا۔ تب آپ انگریزی کی پانچویں جماعت میں تھے۔ سندھ مدرستہ الاسلام کو علی گڑھ کے بعد برصغیر کا دوسرا جدید علمی ادارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

گورنر ہاؤس

قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے ''سندھ گورنر ہاؤس'' میں ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء تا گیارہ ستمبر ۱۹۴۸ء یعنی اپنی وفات تک وہاں قیام پذیر رہے۔ ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو آپ نے موجودہ گورنر ہاؤس کے پچھلے حصے میں ایک اونچے چبوترے پر گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اُٹھایا تھا۔

سندھ کا گورنر ہاؤس چالیس ایکڑ کے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ سول لائن میں واقع ہے۔

اس عمارت کو سر چارلس نیپئر (کمشنر سندھ) نے اپنی رہائش گاہ کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں یہ رہائش گاہ حکومت نے خرید لی اور اسے صوبے کے گورنر کی رہائش قرار دیا۔

۱۸۵۶ء میں اس وقت کے قائم مقام کمشنر جنرل جیکب نے اس کی تعمیر و توسیع کا کام کروایا اور دوسری منزل کا اضافہ بھی کیا۔ ۱۹۰۶ء میں ویلز کے شہزادوں اور شہزادیوں کی آمد پر عمارت میں روشنی اور پنکھوں کا انتظام کیا گیا۔ یہ دو منزلہ عمارت پیلے رنگ کے خوبصورت تراشیدہ قیمتی پتھروں سے تعمیر کی گئی۔

گورنر ہاؤس میں گیلری کے آخری حصے پہ دائیں جانب ''قائداعظم روم'' واقع ہے۔ یہی کمرا گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم کے زیر استعمال رہا۔ وہ دفتری امور یہیں انجام دیتے تھے۔ کمرے کا رقبہ ۵۳۲ مربع فٹ ہے۔ اب اس کمرے میں گورنر ہاؤس کے دوسرے حصوں سے قائد کے زیر استعمال اشیا لا کر محفوظ کی گئی ہیں۔

قائداعظم روم کا دوسرا دروازہ گورنر ہاؤس کے باغ کی جانب کھلتا ہے۔

میز پر دفتری استعمال کی اشیا کے علاوہ چاندی کا ایک خوبصورت خوشبودان دکھائی دیتا ہے۔ خیال ہے قائداعظم اپنے مہمانوں کو اس سے خوشبو لگایا کرتے تھے۔

میز پر موجود لیمپ عیاں کرتا ہے کہ قائداعظم رات گئے تک ملک و قوم کی خدمت میں محو رہتے۔ انھوں نے گورنر ہاؤس میں گزارے اپنے مختصر ایام کو قوم کی ترقی کے لیے وقف کیے رکھا۔

آج ہمارا ملک حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے لوڈشیڈنگ کے بدترین بحران کا شکار ہے۔ جبکہ قائداعظم کی عادت تھی کہ گورنر ہاؤس کا کوئی بلب یا پنکھا فالتو نہ چلاتے اور غیر ضروری روشنیاں خود بند کر دیتے تھے۔

قائداعظم ریذیڈنسی

یہ خوبصورت عمارت زیارت' بلوچستان میں واقع ہے۔ قائداعظم نے زندگی کے آخری دو ماہ یہیں بسر کیے۔ زیارت میں داخل ہونے والی مرکزی شاہراہ سے دائیں ہاتھ ایک سڑک اوپر کی طرف جاتی ہے۔ اس پہ تیر کے نشان سے قائداعظم ریذیڈنسی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قائداعظم ریذیڈنسی دراصل زیارت میں وائسرائے ہند کا متبادل گھر تھا۔ اس کے دروازے پر عمارت کی تاریخ رقم ہے۔ ریذیڈنسی کی عمارت کے دائیں بائیں خوبصورت تراشی گئی گھاس کے برآمدے ہیں۔ رنگ برنگ پھول اور چنار کے درخت انتہائی خوبصورت ماحول تخلیق کرتے ہیں۔ سیڑھیوں سے برآمدے میں آئیں تو قدرتی حسن کا دور تک نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

صنوبر کی لکڑی سے تیار کردہ اس دلکش عمارت میں داخل ہوں تو آگے پیچھے' اوپر نیچے چار چار کمرے دکھائی دیتے ہیں۔ دائیں جانب والے کمرے میں قائداعظم کھانا کھاتے تھے۔ اسی کمرے میں لکڑی کا ایک اسٹینڈ ہے جس میں پیتل کا تھال لٹکا ہوا ہے۔ یہ گھنٹی کا کام دیا کرتا۔ چونکہ اس زمانے میں زیارت میں بجلی نہیں تھی' اس لیے تھال بجا کر گھنٹی کا کام لیا جاتا۔

اس کمرے میں اب تحریک پاکستان کے راہنماؤں اور جلسوں کی تصاویر دیوار پر آویزاں ہیں۔ اس کے بالکل سامنے بائیں طرف سے پہلے کمرے میں بانیٔ پاکستان مہمانوں سے ملاقات کیا کرتے۔ دائیں طرف کے پہلے کمرے کے پیچھے والا کمرا قائداعظم کے نجی سیکرٹری کا تھا۔ اس کے بالمقابل کمرا قائداعظم بطور دفتر استعمال کرتے تھے۔ بالائی منزل پر بائیں ہاتھ کا پہلا کمرا قائد کا بیڈروم تھا۔ جبکہ دائیں ہاتھ کا کمرا آپ کی ہمشیر محترمہ فاطمہ جناح کی خواب گاہ رہا۔

اس کمرے کا دروازہ کھلا ہو تو قائداعظم کا بیڈروم واضح نظر آتا ہے۔ آپ کے کمرا استراحت میں ایک ڈریسنگ ٹیبل بچھی ہے۔ جبکہ دوسری جانب کرسی اور میز پڑی ہے جہاں علالت کے باوجود قائداعظم حکومتی فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ ریذیڈنسی سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ بلند ہے۔ ۹۲۔۱۸۹۱ء میں اس کی تعمیر پر ۳۹۰۱۲ روپے کی کثیر رقم خرچ ہوئی تھی۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے ۱۹۸۵ء میں اسے قومی یادگار کا درجہ دیا اور آثار قدیمہ کی فہرست میں شامل کر لیا۔ تب ہی اس کا نام "قائداعظم ریذیڈنسی" قرار پایا۔ ۱۵ رجون ۲۰۱۳ء کو دہشت گردوں نے یہ تاریخی عمارت راکٹ اور ہینڈ گرنیڈ مار کر تباہ کر ڈالی۔ اسے پھر پرانی طرز تعمیر کے مطابق نئے سرے سے بنایا گیا۔
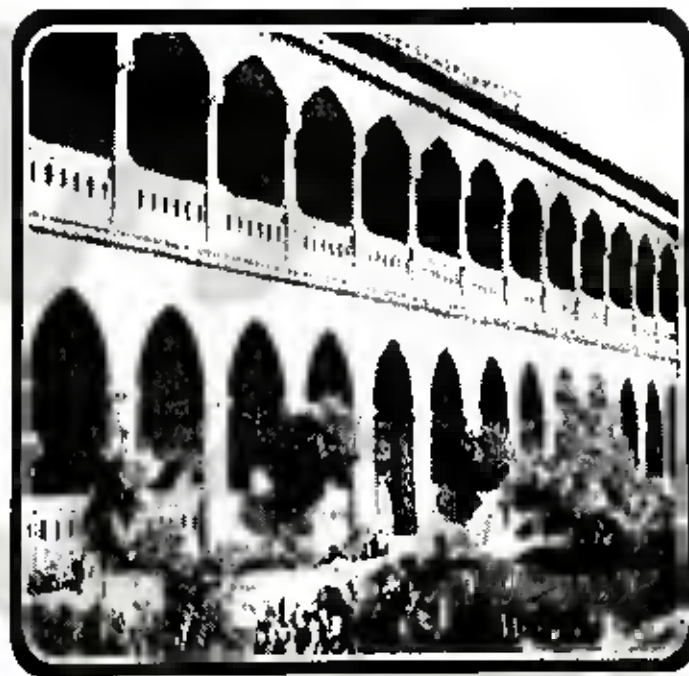
مزار قائد

قائداعظم کا مزار کراچی کے خوبصورت ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ اسے بچوں و بڑوں کی مقبول ترین عمارت بھی کہا جا سکتا ہے۔ روزانہ ہزارہا سیاح اسے دیکھنے اور فاتحہ خوانی کرنے آتے ہیں۔ قائداعظم کا مزار ۹۰ فٹ کی اونچائی پر ایم اے جناح روڈ پہ واقع ہے۔

مزار کا نقشہ بمبئی کے ماہر تعمیرات یحییٰ مرچنٹ نے بنایا۔ نقشے کی حتمی منظوری ۱۹۵۹ء میں محترمہ فاطمہ جناح نے دی۔ پہلی بار مقبرے کی تصویر ڈاک ٹکٹ پر ۱۱ ستمبر ۱۹۶۴ء کو شائع ہوئی۔ مزار کے پہلو میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان، قائد کی ہمشیر، محترمہ فاطمہ جناح، سابق گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر اور نورالامین مدفون ہیں۔ مزار کے اطراف میں خوبصورت باغات واقع ہیں۔ یہ باغات "باغ قائداعظم" کے نام سے منسوب ہیں۔ ان باغات کی تعمیر سے مزار کی خوبصورتی اور دلکشی میں اضافہ ہوا۔ اطراف میں چھے فرلانگ دور تک مزار کے پلیٹ فارم سے اونچی عمارت بنانا منع ہے۔

◆●●

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

ایک روز قائداعظم اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک خاتون کا ذکر کرنے لگے جو بار بار اُن کے پاس آ کر انھیں پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے سے منع کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ پنجاب میں لیگ کے ٹکٹ پر کوئی امیدوار کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیر تاج الدین صاحب بھی اس محفل میں موجود تھے۔ پیر صاحب قائداعظم کے پرانے ساتھی اور رفیق کار تھے۔ برسوں پنجاب میں مسلم لیگ کے سیکرٹری رہ چکے تھے۔ اُن کی شمشیر زبان کی روانی کے سامنے کوئی مصلحت نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ قائداعظم پیر صاحب کے رنگ طبیعت سے خوب واقف تھے۔ جب قائداعظم اس خاتون کا ذکر کر چکے تو پیر صاحب نے بے تکلفی سے فرمایا "مسٹر جناح! اس خاتون نے آپ سے بہت میل جول بڑھالی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں آپ اس کے ناز و غمزہ کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں۔" قائداعظم نے ہنس کر انگریزی میں جو جواب دیا، اس کا مفہوم اُردو میں یہ شعر من و عن ادا کرتا ہے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

عاشق حسین بٹالوی

پہلے صحیح فیصلہ، پھر عمل

اپنی سیاسی زندگی میں قائداعظم نے سستی شہرت اور نام و نمود کی خواہش نہیں کی۔ قائداعظم وہی کچھ کرتے جسے وہ درست سمجھتے ...... قطع نظر اس امر کے کہ عوام کو وہ پسند ہے یا ناپسند۔ ایک دفعہ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے کہا "تم پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ عوام کو کیا یہ پسند ہوگا اور پھر ان کی پسند کے مطابق عمل کرتے ہو۔ لیکن میرا طریقہ عمل بالکل مختلف ہے۔ پہلے میں فیصلہ کرتا ہوں کہ صحیح کیا ہے؟ درست کیا ہوگا؟ اور پھر اس پر عمل شروع کر دیتا ہوں۔ لوگ میرے گرد جمع ہونے لگتے ہیں اور مخالفت غائب ہو جاتی۔

ہیکٹر بولائیتھو

روسی بابشکاؤں نے مجھے لوٹ لیا

روس میں گزرے گرم و سرد لمحوں کی دلچسپ و سبق آموز یادیں... معروف مصنّفہ کے البیلے قلم سے

سلمیٰ اعوان

سچی بات ہے، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ روسی بوڑھی عورتیں جنھیں بابشکائیں کہتے ہیں اس درجہ ہوشیار اور چالاک ہوں گی کہ دن دہاڑے آنکھوں میں دھول جھونک دو ٹکے کی چیز سونے کے مول دیں گی۔

ہوا یہ کہ میں سینٹ پیٹرزبرگ میں واقع مشہور روسی ادیب دوستوفسکی کا گھر دیکھنے گئی۔ اسی میں ایک عجائب گھر بھی بنا ہوا ہے جس میں دوستوفسکی سے متعلق اشیا

محفوظ ہیں۔ میں غلطی سے ذرا آگے نکل گئی۔ جب واپس پلٹنے لگی تو پیادہ راہ پر چار بوڑھی عورتوں کو سُرخ مولیاں، ہرا پیاز، پودینہ اور گاجریں بیچتے دیکھا۔ مُولیوں اور گاجروں کی خوش رنگی اور تازگی اپنی جگہ، جو بوڑھیاں دکانداری کر رہی تھیں، وہ اپنے پہناوؤں کے ساتھ روسی قدیم تہذیب کی نمائندہ لگیں۔ موٹی چنٹوں والے لمبے اسکرٹ، پوری آستینوں والے بلاؤز اور سروں پر خاص قسم کی ٹوپیاں۔ مولیاں اتنی تازہ اور خوش رنگ تھیں کہ بے اختیار جی چاہا ابھی پکڑوں اور کچر کچر کھانا شروع کر دوں۔ یقیناً ایسا کر بھی لیتی پر بھاری بھرکم ناشتا کلیجے پر دھرا تھا۔ دوسرے ''گرو'' کے گھر جا رہی تھی۔ لہٰذا طے کیا کہ واپسی پر یہ نعمتیں خریدی جائیں۔

دوستوفسکی اور اینا کے گھر سے نکلے تو وہیں جا کر مولیوں کی خریداری کا سوچا۔ اُنگلیوں سے ایک خوبصورت و اسمارٹ بابشکا نے چار کا اشارہ دیا۔ سات آٹھ بندھی مولیوں کا یہ گچھا ہم نے دو تین روبل میں خریدنا چاہا مگر وہ چار کے اشارے پر ڈٹی رہی۔

خیر پانچ روبل کا سکہ دیا اور ایک روبل واپس لینے ہاتھ کیا بڑھایا، لگا کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھی خونخوار چیلوں کے نرغے میں آ گئی، خوفناک شکاری کتّوں کے گھیر میں پھنس چکی۔ اُس کی ساتھی عورتوں نے فی الفور چار اور صفر کا اشارہ دیتے ہوئے غصیلی نگاہوں سے یوں گھورا جس میں پیغام تھا: فوراً پیسے دو چالیس روبل۔

''چالیس روبل۔'' میری آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ گئیں۔ اِن پانچ چھے مولیوں کے چالیس روبل! ناممکن۔ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ پل بھر کو سوچا، مولیاں پھینک کر بھاگ جاؤں، کیا کر لیں گی؟ پھر سوچا اگر تعاقب ہو گیا تو مارے جائیں گے..... جو مرضی الزام لگا دیں..... ہماری کس نے سُننی ہے؟

قہر درویش بر جان درویش، چالیس روبل دے کر جان کی خلاصی کروائی۔ تھوڑا سا آگے چلنے پر سبزی اور پھل منڈی نظر آئی تو اندر جا گھسے۔ پختہ چبوتروں پر تازہ خوش رنگ پھلوں اور سبزیوں کے سلیقے سے لگے ڈھیروں پر قیمتوں کے کارڈ بھی دھرے تھے۔ پوری منڈی میں عورتوں کی حکمرانی تھی۔

او ہو تو یہی بابشکا منڈی ہے۔ ہر روسی کا مضافات میں چھوٹا یا بڑا گھر ہونا ضروری ہے جسے ڈاچا کہا جاتا ہے۔ اس کے باغیچے میں سبزیاں اور پھلدار درخت لگائے جاتے ہیں۔ اکثر بوڑھیاں صبح سویرے اپنے ڈاچاؤں سے سلاد اور پھل لا کر فروخت کرتی ہیں۔ کہیں یہ دکانداری منظم صورت میں اور کہیں پیادہ راہوں اور چوراہوں پر بکھری نظر آتی ہے۔ جنھوں نے ہمیں لوٹا وہ ذرا ''ماٹھی'' قسم کی بابشکا ہیں تھیں جو تھوڑے سے مال متاع کے ساتھ سڑکوں پر ڈیرہ لگا لیتی ہیں۔ مگر جہاں داؤ چلا، مہنگے داموں اشیا بیچ باچ اپنی دہاڑی بنا گھر لوٹ جاتی ہیں۔ منڈی کی عورتیں تو سچی بات ہے، بڑی مرد مار قسم کی تھیں۔ پکے بنیوں کی طرح اپنے اڈوں پر ٹھسّے سے بیٹھی تھیں۔ گاہکوں میں بھی قسم کھانے کو کوئی مرد نہ تھا۔ وہیں پتا چلا کہ مولیوں کا گچھا پانچ روبل کا تھا۔ دل نے رج کے اُن کھوسٹ بڈھیوں پہ لعن طعن کیا۔

اب فیصلہ ہوا کہ پیٹرہوف محل جایا جائے۔ محلات اور باغات کا یہ سلسلہ روسی بادشاہ پیٹر اعظم نے تعمیر کرایا تھا۔ مگر اپنی منزل تک کیسے پہنچا جائے؟ بہرحال پوچھتے پاچھتے اس اسٹیشن تک جا پہنچی جہاں سے مقامی ریل پیٹرہوف محل جاتی تھی۔

اب ہجوم کو آنکھوں میں قصائی جیسی نظر بھر کر دیکھا

کہ ہے کوئی مہربان چہرہ جسے پوچھیں تو وہ مونڈھے مار کر آگے نہ بڑھے۔ دو عورتیں منفرد سی لگیں۔ انہی کے پاس جا کر مدعا گوش گزار کیا کہ ہمیں پیٹر ہوف محل جانا ہے۔

لگتا تھا وہ اسی انتظار میں کھڑی ہیں کہ کب کوئی کچھ پوچھے اور وہ نیکی کمائیں۔ پل جھپکتے میں ہاتھ سے پکڑ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر لے آئیں۔ بولیں ”ہمیں بھی اسی طرف جانا ہے۔ کچھ فکر کی بات نہیں۔“

ایک تو سیاح‘ اُوپر سے اجنبی ماحول اور لوگوں کے بارے میں کچے چٹھے جاننے کی خواہش، تیسرے مدمقابل انگریزی بولنے والا، جہاں اتنی باتیں سازگار مل جائیں تو اندھے کو دو آنکھوں کے سوا اور کیا چاہیے؟ کیسا خوش نصیب دن تھا!

آلا سیاہ زمین پر سفید بُندکیوں والا فراک پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ جرسی اور لمبی سیاہ جرابیں۔ پوری جتی نظر آتی۔ عمر یہی کوئی چالیس کے ہیر پھیر میں ہوگی۔ رُوسی لڑکیوں کو انگریزی سکھاتی تھی۔

نتاشا کی گردن کے دو مہرے کھسکے ہوئے تھے۔ کالر پہننے کی وجہ سے گردن میں اکڑاؤ تھا۔ بیماری کی اذیت سے دوچار ہونے کے باوجود ہنس مکھ تھی۔ جسم پر کوٹ اور سر پر لمبی سی ٹوپی تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ہی ڈھیر ساری معلومات ایک دوسرے کے بارے میں حاصل ہو گئیں۔ آلا کی اپنے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی۔ اکلوتے بیٹے کے بارے میں بات کرتے ہوئے اُس کے لہجے میں دُکھ اور ملال تھا:

”نشہ کرتا ہے۔ چھے ہزار روبل میری تنخواہ ہے۔ کہاں سے اُس کے آئے دن کے بڑھتے مطالبات پورے کروں؟ میں نے گھر سے نکال دیا ہے۔“

”یہ کمبخت مائیں پالنے سے لے کر اولاد کے بوڑھا ہونے تک بھی اُنہی کی فکروں میں مری جاتی ہیں۔“ میں نے سوچا۔

نتاشا کا شوہر بس ڈرائیور تھا۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ تینوں شادی شدہ۔ وہ اگر گھریلو زندگی سے سکھی تھی تو بیماری اور اس پر اٹھنے والے اخراجات نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ روس میں طبی علاج تو حکومت کی ذمے داری ہے آلا کہنے لگی:

ایک روسی بوڑھی سموسے نما چیز تیار کرتے ہوئے

”زیادہ مہنگے علاج کرانے اب حکومت کی ذمے داری نہیں رہے۔ وہ دور ختم ہوگیا۔ جب زبان تو بند تھی پر باقی فقر فاقے نہیں تھے۔“

میں دُھوپ میں کھڑی تھی۔ جب سر چکرانے لگا تو آلا سے چھاؤں میں چلنے کی درخواست کی۔ عین اُسی وقت وہ مجھے ہاتھ سے تھام کر گاڑی میں لے آئی کہ روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔ کمپارٹمنٹ بہت کشادہ تھا۔ نشستیں شاہ بلوط کی نئی نکور لکڑی سے بنائی گئی تھیں۔ مگر ان پہ نرم سی پوشش نہیں تھی‘ رُوسیوں کی طرح ٹھنڈی ٹھار اور سخت لگی۔

آلا کے لہجے میں ایک اچھے اُستاد کا تاسف چھلکتا

جب وہ اپنی شاگردوں کے بارے میں بات کرتی: ''رُوسی لڑکیاں امریکی زندگی اور آسائشوں کے حصول کی خاطر مری جاتی ہیں۔ اُنہیں خوابوں کی دنیا میں رہنا بہت پسند، مگر انگریزی سیکھنے میں پکی چور اور پوری ہڈحرام ہیں۔ ڈکٹیشن سے اُن کی جان جاتی ہے۔ ہجے یاد کرنے پر موت پڑتی ہے۔ اور ٹینس سیکھتے ہوئے تو گویا بیہوش ہو جاتی ہیں۔ کبھی میری جماعت میں آؤ تو گرامر پڑھاتے ہوئے اُن کے چہروں پر پھیلی بیزاری دیکھنا۔ ''اُف یہ تو انتہائی بور ہیں'' جیسے جملے سننا میرا روز کا معمول ہے۔''

آلا جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی ''وائس (Active Passive) اور نریشن (Direct and indirect) سکھاتے ہوئے میں کِس عذاب سے گزرتی ہوں' تم اُس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتی۔''

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اُسے بتایا ''ارے آلا' پرائی زبانیں سیکھنا کوئی خالہ جی کا گھر ہے! کچی جماعت سے ہمارے ہاں انگریزی پڑھنے اور سیکھنے پر زور ہے۔ پھر بھی حالت وہی ہے کہ دھوبی کے کُتّے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ آدھے تیتر آدھے بٹیر۔''

مگر ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی تھی۔ یہ بات میں نے اپنے دل میں نہیں رکھی' آلا سے کہہ ہی دی ''آخر روسیوں کو وختہ کیا پڑا تھا حروف کو اُلٹا پلٹا کرنے کا؟ اب B کی آواز V کی ہے۔ H پڑھنا ہو تو N کی آواز نکالو۔ P نے R کی آواز دینی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال بقیہ حروف تہجی کا ہے۔ رُوسی رسم الخط اور لاطینی رسم الخط میں اگر مشرق و مغرب جیسا فرق نہیں تو مغرب اور مشرق وسطیٰ جتنا تو ضرور ہے۔''

یہ سن کر آلا زور سے ہنسی اور کہنے لگی ''تم رُوسیوں کو کیا سمجھتی ہو؟ ہم ہر معاملے میں اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں۔ ہمارے تن و توش ہی کو دیکھ لو، کیا عورتیں اور کیا مرد سبھی گھٹے ہوئے مضبوط جسم و جان کے مالک ہیں۔''

آلا پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولی ''ہاں البتہ اب نئی نسل مایوس کررہی ہے۔''

کمپارٹمنٹ میں بڑا سا تھرموس ہاتھ میں پکڑے آئس کریم بیچنے والے لڑکے کی آمد وطن عزیز کا ایک مانوس منظر یاد دلا گئی۔ نتاشا کی میزبانی نے خوشی سوا کر دی' ٹی الفور چاکلیٹ آئس کریم خرید ہمارے ہاتھوں میں تھمائی کہ چلو کھاؤ۔ چلتی گاڑی سے باہر کے نظارے دیکھو اور باتیں بھی کرتے جاؤ۔

بیرونی مناظر میں جنگلوں کی کثرت تھی۔ کہیں کہیں عمارتوں کے ٹانکے لگ جاتے۔ آلا سے پتا چلا کہ ہماری منزل قریب ہے۔ لیکن اس سے قبل ہی ایک جملہ میرے لبوں سے پھسل پڑا!

''آلا! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں؟ ایک عام رُوسی کا گھر دیکھنے کی شدید تمنا ہے۔''

آلا خاموش سی ہوگئی۔ نتاشا نے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں پھر رُوسی زبان میں بات کرنے لگیں۔

میرے خیال میں یقیناً نتاشا نے ہلہ شیری دی ہوگی۔

''ہمارے گھر اتنے بڑے نہیں اور نہ ہی خوبصورت ہیں۔'' آلا مجسّم معذرت تھی۔

''گھر تو مکینوں سے ہوتا ہے اور آلا صُورت کے ساتھ ساتھ دل کی بھی حسین ہے۔'' سچی دلداری سے بھرے میرے لفظوں نے آلا کو پگھلا کر رکھ دیا۔

صنوبر و چیڑ کے چھدرے جنگلوں میں مستطیل اور مربع نما عمارتوں کے بلندوبالا سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ پختہ سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی مختلف عمارات تک

رسائی کا ذریعہ تھیں۔ آلا کا گھر تیسری منزل پر تھا۔ لفٹ تنگ اور دمے کے کسی مریض کی طرح ہونکتی تھی۔

کھڑ کھڑ دھڑ دھڑ نے ذرا سا ہراساں تو کیا مگر نتاشا اور آلا کی آنکھوں اور ہونٹوں پر بکھری تسلی نے سمجھایا کہ یہ تو لفٹ کی پرانی عادت ہے۔ اگر کوئی ''وختہ ٹائپ'' حادثہ ہو جائے تو پھر ہنگامی گھنٹی بجادی جاتی ہے۔

یہ کمیونزم دور کی عمارتیں تھیں جنھیں مالکانہ حقوق پر لوگوں کو دیا گیا تھا۔ ہر عمارت میں گرم پانی کا پلانٹ اپنا ہے۔ لیکن خستگی اور کہنہ سالی اُن کے چہرے مہروں اور اندرون تک اُتری ہوئی ہے۔

بند دروازہ آلا کے گھنٹی بجانے اور کچھ بولنے پر فوراً ہی کھولا گیا۔ سفید نیلی رگوں سے پُر کمزور ہاتھ میں پکڑا دروازے کا پٹ تھامے ایک خزاں رسیدہ پھول کانچ کے بنٹے جیسی بھوری آنکھوں کو پوری طرح کھولے ہماری طرف متوجہ تھا۔ عام روسی بوڑھیوں کے برعکس دُبلا پتلا اور اسمارٹ سا یہ وجود آلا کی ماں کا تھا۔

پتلے باریک ہونٹوں پر ہمیں دیکھ کر مسکراہٹ اُبھری۔ دروازے کے ساتھ ریک تھا اور ایک کرسی! نتاشا نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے اُتارے۔ آلا نے کھڑے کھڑے انھیں ریک میں سجادیا۔ عام رُوسیوں کے ہاں جوتے گھر میں لے جانے کا کوئی رواج نہیں۔ ذرا اوپر کوٹ برساتی یا جرسی وغیرہ ٹانگنے کی جگہ تھی۔ ایک میں کوٹ لٹکایا۔ دوسری میں جرسی۔ ہم نے بھی اُن کی تقلید کی اور ہلکے پھلکے ہو کر آگے بڑھے۔ برآمدے میں قالین بچھا تھا۔ گیلری میں باہر کی سمت شیشے لگے تھے۔

دو کمروں کے اس فلیٹ میں ڈرائنگ اور بیڈ روم ۶x۸ فٹ کے تھے۔ دوسرے بلاک میں نتاشا کا گھر بھی اسی قسم کا تھا۔ کمروں میں بھی قالین بچھے تھے۔ دیواریں رنگین وال پیپروں سے بجی تھیں۔ یہ وال پیپر آلا نے خود لگایا تھا۔ چھوٹے موٹے کاموں سے لے کر بڑے بڑے کام کرنے تک میں روسی عورتیں خود کفیل ہیں۔ عام اوزاروں کی موجودگی ہر گھر میں ضروری ہے۔

ڈرائنگ روم میں دیوان (بستر نما صوفہ) شوکیس، دو کرسیاں اور ٹی وی مع ٹرالی موجود تھا۔ خواب گاہ میں عام سا بستر دھرا تھا۔ چھوٹے سے عقبی برآمدے میں دُھوپ کے رُخ دھرے گملوں میں چھوٹے چھوٹے کاسنی اور سفید مُسکراتے پھول گھر میں زندگی کا لطیف احساس بکھیر رہے تھے۔

جب ہم نشست گاہ بیٹھے تو مہنگائی کا رونا رویا جانے لگا۔ خواتین کو معاشرے کے دو انتہاؤں...... بہت امیر اور بہت غریب میں بٹ جانے کا صدمہ کھائے جاتا تھا۔

سودیت یونین ٹوٹنے، طبقاتی تقسیم جنم لینے اور معاشرے میں بے راہروی کے بڑھتے رجحان کا دُکھ آلا سے کہیں زیادہ اس کی ماں کو تھا۔ زبان سمجھ نہ آنے کے باوجود آنکھوں، چہرے کی بولتی سلوٹوں، ہاتھوں کی سیمابی اور اضطرابی لہراؤ سبھوں میں اس کا عکس نظر آتا۔ باتوں کی شاہراہ پر سرپٹ بھاگی جاتی آلا جب ترجمانی کرتی اُس سے بھی لقمے جاری رہتے۔

''ارے اس وقت جائدادوں کے لیے لوگ پاگل نہیں تھے۔ اپنے کاروبار کرنے کا بھی کوئی ہوکا نہیں تھا۔ ضروریات زندگی کی فراہمی یقینی اور ارزاں نرخوں پر ہوتی۔ راشن کارڈ سسٹم رائج تھا۔ شراب پر بھی ایک حد تک پینے کی پابندی تھی اس امر کے باوجود کہ واڈکا رُوسیوں کی کمزوری ہے۔ آج کی نسل تو پب باروں میں بیٹھی بوتل پر بوتل چڑھائے چلی جاتی ہے، کوئی روک ٹوک کرنے اور پوچھنے والا نہیں۔

آلا کے لڑکے کا ذکر کیا ہوا بابشکا (بوڑھی عورت) کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ وہ پھر شروع ہوگئی:

"تب زندگی میں سکون تھا۔ اگر بہت خوشحالی نہیں تھی تو غریبی بھی نہ تھی۔ ٹیکس کم تھے۔ سبھی گھروں میں معیار زندگی ایک جیسا تھا۔ اب جیسی دوڑ نہیں لگی ہوئی تھی۔ دنیا کی کوئی خبر نہ تھی۔ ٹی وی کا ایک چینل جو دکھاتا دیکھ لیا' جو سنا تا سُن لیا۔ سوویت قوم کام کرتی تھی۔ قوم کی عظمت کے لیے جان ماری جاتی۔ افراتفری، آپادھاپی اور مار دھاڑ کچھ نہیں تھا۔"

میں نے آلا سے پوچھا کہ اُس کی سوچ کیا ہے؟ نئی نسل سے قربت رکھنے والی عورت بولی: "آزادی کسے بُری لگتی ہے؟ بہرحال اس وقت جبر تو تھا۔ تب منفی اور مثبت پہلو دونوں ملتے تھے اور اب بھی ہیں۔"

میں پھر ہم غسل خانے گئی۔ منہ ہاتھ دھویا اور رخصت چاہی۔ پر آلا چھوٹے سے باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی۔ میری بات پر پھدک کر باہر آئی اور کہا: "گھر میں جو دال دلیہ ہے اسے تو آپ کو کھانا پڑے گا۔"

متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے ہاں کھانا کمرے نہیں باورچی خانے میں کھایا جاتا ہے۔ میز پر چار پیالے سجے تھے۔ دو میں پیاز اور کھیرے تیر رہے تھے۔ بڑے سے چینی کے ڈونگے میں گائے کے گوشت اور سبزیوں کی یخنی اور پلیٹ میں چورنی خلیب (گندی ڈبل روٹی) دھری تھی۔

سچی بات ہے، شرمندگی کا ہلکا سا غبار میرے چہرے پر پھیل گیا۔ گھر آنے کا مقصد تو رہن سہن سے آشنائی حاصل کرنا تھا نہ کہ کھانے سے۔ جب اس کا دو تین بار اظہار میری زبان سے ہوا' تو آلا کے لہجے میں اگر محبت تھی تو وہیں صاف گوئی کی سچائی بھی تھی۔ وہ بولی "یہ سب ریفریجریٹر میں تھا۔ نہ ہوتا تو تم لوگوں کو صرف چائے ہی پر ٹرخا دیتی۔"

سادہ بے تکلفانہ ماحول تھا۔ کن انکھیوں سے کھانے کا انداز دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے کھاتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ آلا نے کہا "سبھی رُوسی بوڑھوں کی سوچ کم و بیش میری ماں جیسی ہے۔ انھیں یہ نہیں سمجھایا جا سکتا کہ دنیا گلوبل ویلج بن چکی اب دنیا سے کٹ کر کنویں کا مینڈک بنے نہیں رہا جا سکتا۔ ذات کا شعور اور ادراک آگہی ہونا بہت ضروری ہے۔ معاشروں اور تہذیبوں میں جنم لیتی تبدیلیاں روکنا نا ممکن ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ جابجا کام کرتی رُوسی عورت نک سک سے آراستہ بہترین لباس میں ملبوس کتنی ہشاش بشاش اور چاق چوبند ہے۔ اُسے فیشن کی دنیا سے گہری دلچسپی ہے۔ میری خوابگاہ کا بستر میری ماں کے زمانے کا ہے۔ تب حکومت چار پانچ ڈیزائن کے بستر بنوا کر ہر خاندان میں بانٹ دیتی تھی۔ اب یہ ممکن ہی نہیں۔ وقت تو قلانچیں بھرتا آگے چلا گیا۔ لوگوں کے طور طریقوں میں تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ انھیں خوش دلی سے قبول کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ کیپٹل ازم اور ماڈرن ازم کے سیلاب کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکتا۔

زندگی کی گاڑی بمشکل کھینچنے کے باوجود آلا کی سوچیں کسی حد تک مثبت تھیں۔ میں حیران ہوگئی۔

اس بے حد ٹھنڈی ٹھار اور اجنبیوں کے لیے محبت سے عاری سرزمین پر میں نے آلا اور نتاشا کو دل کی دنیا کے اُس گوشے میں جا بٹھایا جہاں چند ہی اجنبی اپنی مہربانیوں کے باعث براجمان ہیں۔ ♦♦♦

پھل چمگادڑوں کے ذریعے پھیلنے والے وائرس

ایبولا کا مہلک حملہ

اس موذی جرثومے کا بیان جو انسان کو راتوں رات کنارِ قبر پہنچا دیتا ہے

ابو صارم

پچھلے چند ماہ کے دوران مغربی میڈیا میں ایبولا وائرس سے پھیلنے والی بیماری نے کافی اچھل مچائے رکھی۔ یہ ایک وبائی مرض ہے جس کا فی الوقت کوئی علاج دستیاب نہیں۔ اسی امر نے خصوصاً نازک مزاج امریکی عوام کو خوفزدہ کر دیا۔ جب امریکا میں اس وبا یا چھوت کے چار کیس دریافت ہوئے، تو مریضوں سے اچھوت جیسا سلوک کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایبولا وائرس وسیع پیمانے پر پھیل سکتا ہے، مگر یہ فی الوقت اتنا ہلاکت خیز نہیں جتنا

اسے ظاہر کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں ایڈز وائرس اب تک پندرہ لاکھ انسانوں کی جانیں لے چکا۔ جبکہ ایبولا وائرس کی حالیہ وبا کے باعث تادم تحریر پانچ ہزار سے زیادہ مرد و زن زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بہرحال دین اسلام کی رو سے ہر انسان کی جان قیمتی ہے۔ اسی لیے اسلام پہلا مذہب ہے جس نے بنی نوع انسان کو وبائی امراض کی ہلاکت آفرینی سے خبردار کیا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"مسلمانو! اگر تمھیں معلوم ہو کہ ایک مقام پر وبا پھیل چکی، تو اس طرف کا رخ نہ کرو۔ اور اگر تمھارے علاقے میں وبا پھیل جائے، تو کسی دوسری جگہ کا رخ نہ کرو۔" (صحیح بخاری)

درج بالا مقدس حدیث میں پہلی بار قرنطینہ (Quarantine) کا تصور پیش کیا گیا۔ یعنی جو فرد وبا کا شکار ہے، اسے صحت مند انسانوں سے الگ جگہ پر رکھا جائے۔ ایک اور حدیث مبارک ہے: "جو فرد وبا میں مبتلا ہو جائے، وہ صحت مند انسانوں کے قریب نہ جائے۔" یہ حدیث بھی نظریہ قرنطینہ پیش کرتی ہے تاکہ تندرست انسان اپنی جانیں چھوت سے محفوظ رکھ سکیں۔

☆☆

وائرس جرثومے (Germ) کی ایسی قسم ہے جو صرف زندہ خلیے ہی میں پلتا بڑھتا ہے۔ وائرسوں کی پانچ ہزار اقسام دریافت ہو چکیں اور ان کی لاکھوں ذیلی قسمیں ہیں۔ کئی وائرس انسانی خلیوں میں داخل ہو کر انسان کو متفرق بیماریوں مثلاً چیچک، خسرہ، فلو، ایڈز، ہیپاٹائٹس وغیرہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ انہی خطرناک وائرسوں میں ایبولا وائرس بھی شامل ہے۔

ایبولا وائرس کی پانچ اقسام ہیں...... سوڈان، سینڈی بیوگو، تائی فوریسٹ، ایبولا اور ریسٹون۔ ان میں سے اوّل الذکر اقسام انسانوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ اور ان میں سے سب سے خطرناک ایبولا وائرس ہے۔ ریسٹون وائرس بندروں میں بخار پیدا کرتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ افریقا میں پائی جانے والی پھل (Fruit) چمگادڑوں کے ذریعے ایبولا وائرس انسان تک پہنچا۔ دراصل کسی وجہ سے یہ وائرس پھل چمگادڑ کے جسم میں پہنچ کر اسے نقصان نہیں پہنچاتا...... گویا وہ چمگادڑ کو اپنی کمین گاہ بنا لیتا ہے۔ جسم میں وائرس پل بڑھ کر اس ممالیہ کے خون و تھوک میں پھیل جاتا ہے۔

اب چمگادڑ کوئی پھل کھائے، تو وائرس بذریعہ تھوک اس سے لگ جاتا ہے۔ بعدازاں کوئی بھوکا انسان یہ پھل کھا لے، تو ایبولا وائرس اس کے بدن میں پہنچ گیا۔ اسی طرح کسی انسان کے ہاتھوں میں زخم ہے۔ اور کسی طرح مردہ چمگادڑ کا خون زخم پر لگا تو تب بھی وائرس اسے چمٹ جائے گا۔ یاد رہے، افریقا میں پھل چمگادڑ کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ تاہم گوشت پکانے سے ایبولا وائرس زندہ نہیں رہتا۔

کئی افریقی باشندے بندروں کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ اگر بندر ایبولا وائرس کی حامل پھل چمگادڑ کا ادھ کھایا پھل کھا لے، تو وائرس اس کے بدن میں بھی جا پہنچے گا۔ پھر بندر کا خون، تھوک یا پسینا بھی کسی انسان کو ایبولا وائرس کا شکار بنا سکتا ہے۔ گویا یہ وائرس متاثرہ چمگادڑ، بندر، ہرن یا انسان کے صرف مائع جات (تھوک، خون، قے، پاخانہ، آنسو، پیشاب، دودھ وغیرہ) سے دوسرے کو منتقل ہوتا ہے۔

اگر ایک ایبولا وائرس بھی کسی انسانی یا حیوانی جسم میں داخل ہو جائے، تو وہ قریب ترین خلیے میں جا گھستا ہے۔ تب وائرس اپنا جینیاتی مواد خلیے میں خارج کرتا ہے۔ یہ جینیاتی مواد خلیے کی مشینری اپنے قبضے میں لے کر اپنی نقل تیار کرنے لگتا ہے۔ یوں آنے والے وقت میں ہزاروں لاکھوں ایبولا وائرس پیدا ہو جاتے ہیں۔

انسانی جسم میں وائرس داخل ہونے کے بعد عموماً دو دن بعد ابتدائی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ انسان بخار، تھکن اور اعصاب و ہڈیوں میں درد محسوس کرتا ہے۔ پھر

گلے میں تکلیف جنم لیتی ہے۔ بعدازاں تے آتی ہے اور پیٹ بھی درد کا نشانہ بنتا ہے۔ مریض سانس بمشکل لیتا اور گھبراہٹ کا شکار رہتا ہے۔ ساتویں دن اندرونی یا بیرونی اعضا سے خون نکلنے لگتا ہے۔ انسان دو ہفتے کے اندر اندر صحت یاب نہ ہو، تو عموماً موت ہی اس کا مقدر بنتی ہے۔

شناخت

مرض کے ابتدائی دنوں میں یہ جاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ ایبولا وائرس کا پیدا کردہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ٹائیفائیڈ اور ملیریا میں بھی درج بالا جسمانی علامات جنم لیتی ہیں۔ بہرحال ابتدائی دنوں میں ایبولا وائرس کی شناخت کے لیے یہ چار طبی امتحان استعمال ہوتے ہیں:

☆ پی سی آر یعنی (Polymerase chain reaction)

☆ وائرس کی علیحدگی (Virus isolation)۔

☆ انٹی جن۔ کیسپچر انزائم۔ لنکڈ امیونوسوربنٹ ایلسا (Elisa) ٹیسٹنگ۔

☆ آئی جی ایم ایلسا (Igm Elisa)

علاج

ایبولا وائرس سے جنم لینے والے مرض کی دوا تاحال نہیں بنائی جا سکی۔ ایک وجہ یہ ہے کہ مرض نے غریب افریقی ممالک میں جنم لیا۔ چونکہ وہاں مہنگی ادویہ کی کھپت کم ہے، اس لیے کسی مغربی دوا ساز ادارے نے مرض کی ویکسین تیار کرنے میں دلچسپی نہیں لی۔ یہ مادہ پرستی کا بڑا منفی پہلو ہے۔

بہرحال جسے یہ موذی مرض چمٹ جائے، اسے علیحدہ مقام پر رکھا جاتا اور مائع جات اور جسمانی درد کم کرنے والی دوائیں دی جاتی ہیں۔

مریض کی دیکھ بھال کرنے والے اور ڈاکٹر خصوصی لباس پہنتے ہیں تاکہ ایبولا وائرس انھیں شکار نہ بنا سکے۔ گو یہ وائرس ہوا کے ذریعے ایک سے دوسرے میں منتقل نہیں ہوتا تاہم بطور احتیاطی تدبیر نقاب، دستانے، گاؤن اور عینک پہنی جاتی ہے۔

تاریخ

ایبولا وائرس کا پہلا ریکارڈ شدہ حملہ جون ۱۹۷۶ء میں سامنے آیا۔ تب جنوبی سوڈان کے شہر، زارا (Nzara) میں ایک اسٹور کیپر ایبولا وائرس کا شکار ہوا۔ وہ ۳۰؍جون کو اسپتال پہنچا اور ۶؍جولائی کے دن چل بسا۔

ایبولا وائرس کے اس حملے نے ۲۸۴ انسانوں کو متاثر کیا۔ ان میں سے ۱۵۱ اپنی جان سے گئے۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) کے عملے نے کئی مریضوں کی جانیں بچائیں۔ تاہم وہ اس پراسرار مرض کی ماہیت نہیں جان سکے۔

اگلے ہی مہینے، اگست میں زائرے (جمہوریہ کانگو) میں ایبولا وائرس کی نئی وبا پھوٹ پڑی۔ اس نے گاؤں کے ایک ہیڈ ماسٹر، مابالو لوکیلا کو اپنا پہلا شکار بنایا۔ یہ بھی وائرس کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

۸؍ستمبر ۱۹۷۶ء کو لوکیلا کی موت واقع ہوئی۔ بعدازاں جن مرد و زن سے لوکیلا کا میل ملاپ رہا تھا، وہ بھی مرض میں مبتلا ہو کر مرنے لگے۔ جلد ہی وائرس نے علاقے میں تباہی مچا دی۔

یہ گاؤں علاقہ یمبوکو میں واقع تھا۔ صدر زائرے، موبوتو سیکو نے وہاں مارشل لا لگا دیا۔ علاقے میں ۵۵۰ دیہات آباد تھے۔ وہاں مقیم سبھی باشندوں کو علاقہ چھوڑنے سے منع کر دیا گیا۔ بعدازاں عالمی ادارہ صحت

کے ڈاکٹروں نے مریضوں میں بذریعہ ٹیسٹ نیا وائرس دریافت کیا۔ قریب ہی بہتے ایبولا دریا کے نام پر اسے ایبولا وائرس کہا گیا۔

یمبوکو میں ۳۱۸ افراد اس وائرس کی وجہ سے بیمار ہوئے۔ ان میں سے ۲۸۰ چل بسے۔ ایبولا پھر وقتاً فوقتاً انسانوں پر حملے کرتا رہا۔ تمام حملے افریقی ممالک میں ظہور پذیر ہوئے۔ مارچ ۲۰۱۴ء میں عالمی ادارہ صحت نے خبر دی کہ گنی میں ایبولا وائرس نئی قیامت مچا چکا۔

گنی میں وبا ایک دو سالہ بچے سے پھیلی جو دسمبر ۲۰۱۳ء میں ہلاک ہوا تھا۔ جن لوگوں نے بچے کی دیکھ بھال کی تھی، وہ پھر مرض میں مبتلا ہوئے۔ ان سے وبا پھیلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ پڑوسی ممالک، سیرالیون اور لائبیریا جا پہنچی۔ ان تینوں غریب ممالک میں ڈاکٹروں کی شدید کمی ہے۔ نیز عوام حفظان صحت کے اصولوں سے آگاہ نہیں۔ ان عوامل نے وبا پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اگست ۲۰۱۴ء میں وبا نائیجیریا تک پھیل گئی۔ پھر سینیگال اور مالی میں بھی مریض سامنے آئے۔ ۳۰ ستمبر کو امریکا میں ایبولا وائرس کا پہلا مریض رپورٹ ہوا۔ وہ آٹھ دن بعد چل بسا۔ یہ لائبیریا سے آنے والا تھامس ڈنکسن تھا۔

بعد ازاں ڈنکسن کے علاج میں شامل دو نرسوں میں بھی ایبولا وائرس پایا گیا۔ انہی کیسوں نے امریکا میں ہلچل مچا دی۔ امریکی و مغربی میڈیا نے راتوں رات ایبولا وائرس کو ایسا خوفناک عفریت بنا دیا جو انسانی جانوں کے درپے ہے۔

تاہم دونوں نرسیں صحت یاب ہو گئیں۔ مغربی افریقا میں مریضوں کا علاج کرنے والے امریکی ڈاکٹر، کریک اسپنر میں بھی ایبولا وائرس پایا گیا مگر اس کی حالت بھی اب تسلی بخش ہے۔

گنی سے پھوٹنے والی وائرس کی حالیہ وبا نے مجموعی طور پر ۱۳،۲۶۸ مرد و زن کو نشانہ بنایا۔ ان میں سے پانچ ہزار بدنصیب چل بسے۔ اس وبا کا حملہ ابھی جاری ہے اور خدشہ ہے، مزید کئی ہزار انسان اس کے ہاتھوں لقمہ اجل بن سکتے ہیں۔

ایبولا وائرس کی پہلی وبا کو تقریباً چار عشرے بیت چکے۔ اگر یہ وبا امریکا یا کسی یورپی ملک میں پھوٹی ہوتی، تو یقیناً اب تک اس کا علاج دریافت ہو جاتا۔ مگر غریب ممالک میں جنم لینے کے باعث ادویہ ساز اداروں نے اس پر توجہ نہ دی۔ ان اداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی جان کو روپے پیسے پر مقدم سمجھیں۔ عقل، شعور، اخلاقیات اور مذہب اسی بات کی ترویج کرتے ہیں۔

انگور میٹھے ہیں

مجھے یاد ہے کہ جب میں ۶ اگست کے روز لاہور سے واپس آیا، تو بیگم محمد اکبر خان نے کوئٹے میں مجھے کچھ انگور دیے کہ میں قائداعظم کو پیش کروں۔ آپ نے انگور بہت پسند فرمائے اور دریافت کیا کہ میں نے یہ کہاں سے خریدے؟ میں نے بتایا "یہ بیگم محمد اکبر خان نے بھیجے ہیں اور اگر آپ پسند فرمائیں تو وہ روزانہ بھیجنے کو تیار ہے۔" آپ نے بیگم کے اس طرزِ عمل کی تعریف کی اور بڑے احسن طریقے سے مزید انگور لینے سے انکار کر دیا۔

(کرنل الٰہی بخش)

تازہ افسانہ

اندھیروں میں بھی جو چمکیں دمکیں

حالات سے تنگ آئے دیور کو بھابھی
کے مسکت جوابات نے لاجواب کر دیا

سمیرا کلثوم

کتاب کا اگلا صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے گھڑیال کی جانب دیکھا، صبح کی اذان ہونے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔

"تمھارے بن ہر دن گزارنا پہاڑ کاٹنے کے مترادف ہے اور رات چٹان تراشنے کے برابر۔" ایمن نے سامنے دیوار پر لگی شوہر کی تصویر دیکھتے ہوئے سوچا۔

موسم میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ اس نے پہلو میں لیٹے ثوبان کا کمبل ٹھیک کیا۔ پھر اٹھ کر "بے بی کارٹ" کی طرف گئی جہاں دو سالہ رانیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ بیٹی کو بھی ٹھیک سے کمبل اوڑھا کر وہ پھر کتاب لیے بیٹھ گئی۔ مگر اس سے مزید پڑھا نہیں گیا، آنسو ٹپ ٹپ

کتاب کے صفحے بھگونے لگے۔ کبھی کبھار اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہتا تھا۔ اس نے کتاب بند کرتی بجھائی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

''یا اللہ! مجھے صبر دے، حوصلہ دے۔'' وہ دعاؤں میں پناہ ڈھونڈنے لگی۔

اگلے دن ثوبان کو اسکول بھیجنے کے بعد اس نے حسب معمول اپنا اور اماں کا ناشتا تیار کیا اور دالان میں چلی آئی۔ وہاں اماں ٹانگوں پر گرم شال لپیٹے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

''ایمن! رات کو پھر روتی رہی ہو؟'' انھوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں اماں جان...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''بیٹا! اپنے آپ کو چٹان کی طرح مضبوط کر لو۔ مجھے دیکھو، وہ میرا لختِ جگر تھا مگر میں نے اپنے دل کو پتھر کر لیا۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

''اماں! آپ میرے متعلق پریشان مت ہوا کریں، میں جانتی ہوں کہ مجھے جینا ہے، آپ کی خاطر، حیدر اور اپنے بچوں کی خاطر...... بس کبھی کبھی دل جب غم کی شدت سے پھٹنے لگے، تو آنسوؤں کا سہارا لے لیتی ہوں۔'' وہ پھر مسکرائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بوڑھی ساس اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ اماں کو کیسے سمجھاتی کہ جب عزیز از جان ہستی بچھڑ جائے، تو اس کی یادیں دل کو بے قرار رکھتی ہیں۔

ناشتا کرتے ہوئے اس نے ٹی وی چلا دیا۔ روز کی طرح وہی سیاسی جوڑ توڑ کی باتیں، کوئی نیا سانحہ، کوئی حادثہ، بم دھماکا، بجلی و پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کی نوید، وزیرستان میں فوج کا آپریشن ضرب عضب، کراچی کے دل دہلا دینے والے حالات اور آخر میں تفریح کے نام پہ کسی بھارتی حسینہ کے ناز و انداز اور ناچ گانے!

''کیا ہمارا معیار اس قدر گھٹیا ہو گیا ہے کہ تفریح کے لیے کسی بھارتی اداکارہ کے مختلف حیاسوز انداز دکھانا ضروری ہیں؟'' ایمن نے سوچا۔ دکھی کر دینے والی خبروں کے بعد کسی بھارتی اداکار یا اداکارہ کی خبر دل مزید دکھا جاتی! ہر چینل میں ایک جیسے مناظر نظر آتے۔ خبریں تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ رات گئے بلکہ اگلی صبح تک دکھائی جاتی ہیں۔ اخبارات و رسائل میں پڑھنے کو ملتا ہے کہ قوم بے حس ہو رہی ہے۔ معاشرے میں برداشت اور رواداری کا فقدان ہو چکا۔ مگر جہاں دن رات ٹی وی پر تفریحی پروگرام اور ناچ گانے دکھائے جائیں، ''خبریں'' سنتے ہوئے بھی چینل بدلنا پڑے کہ آخر میں بھارتی فلموں کا ٹریلر دکھایا جاتا ہے، وہاں یہ سب کچھ تو ہو گا...... کوئی فرمان قائد دیکھنے کو نہیں ملتا اور نہ علامہ اقبالؒ کا شعر سنایا جاتا ہے۔ بس ''انٹرٹین'' کرو، مگر کس قیمت پر؟ وہ سوچنے لگی۔

☆☆

''بھابی! آج کھانے میں کیا پکا ہے؟'' حیدر نے آج بھی کالج سے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا۔

''تمھارا امتحان کیسا ہوا......؟'' اس نے الٹا سوال کر دیا۔

''اچھا ہوا بلکہ بہت اچھا...... آج تو کھانے کے بعد میں خوب سوؤں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا اور پھر قالین پر بیٹھی کھلونوں سے کھیلتی رانیہ کو گود میں اٹھا لیا۔

شام کو سردی اور زیادہ ہو گئی۔ وہ ننھی رانیہ کا سوئیٹر تبدیل کر رہی تھی کہ اماں اس کے پاس آئیں اور بولیں ''ایمن! جاؤ ثوبان کو اندر لے آؤ۔ باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں نے بہت کہا مگر میری بات نہیں

مان رہا۔"

رانیہ کو اماں کے پاس چھوڑ کر وہ باہر آئی۔ دیکھا بیٹا کرسی پر اداس بیٹھا ہے۔ "ثوبان! میری جان، یہاں اتنی سردی میں کیوں بیٹھے ہو؟" وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولی۔

"امی! میں ابو کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ کہتی ہیں نا کہ شہید زندہ ہوتے ہیں۔ میں کب سے دروازے کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ شاید آج وہ آجائیں۔" ثوبان نے معصومیت سے کہا۔ یہ سن کر اس کا کلیجا کٹ کے رہ گیا۔ بیٹے کو سینے سے لگایا اور اپنے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ آنکھوں سے ساون بھادوں بہنے لگا تھا۔

"ہاں بیٹا! وہ زندہ اور جنت میں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ انھیں اجازت نہیں دیتے کہ وہ واپس آئیں۔ تم دیکھنا، تمھاری سالگرہ کی رات وہ تمھارے سرہانے تمھارا پسندیدہ تحفہ ضرور رکھ کے جائیں گے۔"

"واقعی امی؟" ثوبان نے بے یقینی سے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میری جان واقعی!" وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

"ثوبان! آؤ یار باہر چلتے ہیں، جا کر گرما گرم مونگ پھلی لاتے ہیں۔ مزے سے کھائیں گے اور میں آپ کو کہانیاں بھی سناؤں گا۔ کل چھٹی ہے نا آپ کی۔" حیدر بولا جو جانے کب سے پیچھے کھڑا دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ثوبان خوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلا گیا۔ لیکن وہ کرسی کو تھامے سخت سردی میں دیر تک کھڑی رہی۔

کون جانتا تھا کہ شادی کی سالگرہ منانے کی تیاری کرتے ہوئے وہ اپنے شوہر کے جانے کا ماتم کرے گی۔ ٹھیک ایک سال پہلے احمد جب اس کا تحفہ لینے بازار گئے تو نماز مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ انھوں نے گاڑی کھڑی کی اور قریبی مسجد میں نماز ادا کرنے لگے۔ چند لمحوں بعد ہی وہاں خودکش بم دھماکا ہو گیا۔ احمد سمیت دس لوگ شہید ہوئے۔ ان کی لاش کے نام پر چند ٹکڑے انھیں مل گئے۔ انھی پر نماز جنازہ پڑھ انھیں دفنا دیا گیا۔

"اپنے پیاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی حالت میں مرتے دیکھنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔" وہ سوچتی رہی۔

"بھابی! آپ ابھی تک یہیں کھڑی ہیں، سردی بہت ہے، چلیے، اندر چلیں۔" حیدر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آگئی۔

رات کھانے کے بعد سب لوگ کافی دیر تک ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ حیدر لطیفے سنا سنا کر اسے اور اماں کو ہنساتا رہا۔ ثوبان بھی بہت خوش تھا۔ بہت دن بعد وہ سب مل کر بیٹھے تھے کہ حیدر اپنی پڑھائی میں مشغول رہتا تھا۔

"بھابی! پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟" حیدر نے اچانک پوچھا۔

"کس بارے میں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"وہی کینیڈا جانے کے بارے میں! عمر بھائی کا آج بھی فون آیا تھا۔ وہ وہاں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں بھی آسانی سے "سیٹ" کرا دیں گے۔"

"میرا فیصلہ تو وہی ہے...... تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں پاکستان چھوڑ کر نہیں جاؤں گی لیکن تمھیں بھی روکنا نہیں چاہتی۔ تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ ہم یہ گھر بیچ کر امی ابو کے پاس گھر لے لیں گے۔ وہاں بھائی بھی میری خبر گیری کر سکیں گے۔ باقی رہی اماں کی بات تو تم جانتے ہی ہو، میں بہو سے زیادہ ان کی بیٹی ہوں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"بھابی! میری مانیں تو ہم سب چلتے ہیں وہاں بچوں اور آپ کو اچھی زندگی ملے گی۔ اس ملک میں کیا رکھا ہے؟ آئے دن دہشت گردی اور دیگر مسائل..... نہ دن کا چین نہ رات کو سکون، لوڈ شیڈنگ کا عذاب پٹرول اور گیس کا مسئلہ اور....."

"بس، بس!" ایمن نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "کسی غیر ملک جا کر دوسرے درجے کا شہری بننے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"اماں! آپ بھابی کو سمجھائیں نا، آپ کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔ وہاں ہر چیز خالص ملتی ہے۔ بیماریاں بہت کم ہوتی ہیں۔ آپ کا بلڈ پریشر اور ذیابیطس بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ اماں کی خوشامد کرنے لگا۔

"ایمن ٹھیک کہتی ہے بیٹا! تم اپنے بھائی کے پاس جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ لیکن میں بھی اپنا وطن نہیں چھوڑ سکتی۔ ارے یہاں پانچ وقت اذان گونجتی ہے، عید میلاد النبی ﷺ پر محفلیں سجتی ہیں، کیا وہاں یہ سب کچھ ہے؟ میں یہ سرزمین چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی بھلے یہاں کتنے ہی مسائل ہوں۔ میں اپنی مٹی میں دفن ہونا چاہتی ہوں۔" اماں نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

حیدر نے اس موضوع پر مزید بات کرنا مناسب خیال نہ کیا، وہ بھابی اور اماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر اس نے قریب پڑے ریموٹ سے ٹی وی چلا دیا کہ ماحول کی اداسی کم ہو سکے۔

ٹی وی پہ "آپریشن ضرب عضب" سے متعلق پاک فوج کی کامیابیوں اور جوانوں کی شہادتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔

"آج کی کارروائی میں پاک فوج کے چار جوان شہید ہو گئے جب کہ گیارہ دہشت گرد مارے گئے۔"

"ہماری فوج بلاشبہ دنیا کی بہترین آرمی ہے۔" حیدر جوش سے بولا۔

"ہماری سرحدیں مضبوط ترین ہیں جبھی دشمن پاک سرزمین کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔" ایمن بولی۔

"اگر ہماری فوج اتنی مضبوط نہ ہوتی تو شاید ہمارا حال بھی افغانستان، عراق اور فلسطین کی طرح ہوتا۔ یہ پاک فوج کی قربانیاں اور بہادری ہی ہے کہ دشمن ہمارے وطن پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔" وہ ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

"اگر ہماری فوج اتنی مضبوط نہ ہوتی تو شاید ہمارا حال بھی افغانستان، عراق اور فلسطین کی طرح ہوتا۔ یہ پاک فوج کی قربانیاں اور بہادری ہی ہے کہ دشمن ہمارے وطن پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔"

"جس طرح فوج اس ملک سے محبت کرتی ہے، اگر ہم عوام بھی ویسی ہی اپنے وطن سے کریں تو سرحدوں کی طرح یہ بھی مضبوط و خوشحال ہو جائے۔" ایمن نے کہا۔

حیدر استفہامیہ نگاہوں سے بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔

"پاک فوج بیرونی خطرات کا مقابلہ کرتی ہے اور اب اندرونی سازشوں سے نمٹ رہی ہے۔ اس اندرونی خلفشار کا سبب ہم خود ہیں، اور وطن سے ہماری بے مہری۔ ہم اپنے گناہوں کا سارا بوجھ اس دھرتی پر ڈال کر فوج سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر دے۔" وہ رانیہ کو صوفے پر لٹا کر تھپکتے ہوئے بولی۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ میں کچھ سمجھا نہیں!" حیدر نے بٹن دبا کر ٹی وی بند کر دیا۔

"ابھی کچھ دن پہلے تم نے بتایا تھا کہ تمہارے دوست کے ابو نماز فجر ادا کرنے جا رہے تھے کہ راستے میں ٹھوکر لگنے

سے گر گئے۔ اس حادثے میں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی، پھر کوئی لڑکا گن پوائنٹ پر ان کا موبائل اور ساری رقم چھین کر لے گیا۔ میں اس واقعہ سے متعلق سوچتی رہی۔ ابھی کل رات کتاب میں پڑھا، خدا کہتا ہے کہ جب تم میری خاطر برائی کرنا نہیں چھوڑ سکتے تو میری راہ میں قربانی کیوں پیش کرتے ہو؟ اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ تمھارے دوست کے ابو رشوت لیتے ہیں۔ یہ جو علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے نا کہ

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

تو اس کا مطلب بہت گہرا ہے۔

''ہمارے وطن میں برائیاں جس تیزی سے پھیل رہی ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ ناراض تو نہیں ہو گئے؟ شاید اسی لیے ہم امن کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہماری فوج اس وطن سے دیوانہ وار پیار کرتی ہے، محبت میں ایسی دیوانگی دنیا کی کسی اور فوج میں نہیں۔ گوشت پوست کے بنے فوجی بھی کسی کے بھائی، بیٹے، شوہر اور باپ ہیں۔ مادر وطن کی حفاظت کے لیے نرم گرم بستروں سے نکل کر دشمن کے آگے سینہ سپر ہوتے اور انجام کی پروا کیے بغیر اس سے بھڑ جاتے ہیں۔ کس کی خاطر، صرف اور صرف اس وطن کی خاطر، ہماری خاطر...... لیکن ہم سارا بوجھ فوج کے کندھوں پر ڈال کر دن رات ٹی وی کے چینل بدلنے میں گزار دیتے ہیں۔''

حیدر بڑے غور سے بھابھی کی باتیں سن رہا تھا۔

''تمھیں پتا ہے حیدر؟ محبت کا مطلب کیا ہے؟'' وہ بولی'' محبت کا مطلب ہے! سچائی، دیانت داری!'' اس نے خود ہی جواب دیا۔ ''یہ کینیڈا، جاپان، چین وغیرہ اتنے مضبوط کیوں ہیں؟ اس لیے کہ وہاں کی اقوام اپنے وطن سے مخلص ہیں۔ ان ممالک میں بھی بیشتر لوگ خواہشات نفسانی میں جانوروں کی مثل ہیں لیکن ان کی حکومتیں انھیں زبردستی ''ایماندار'' بناتی اور اپنے وطن سے وفا کرنا سکھاتی ہیں۔''

''وہ کیسے بھابی؟'' حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہر غلط کام پر جرمانہ عائد کر کے اور سزا دے کر! اگر سڑک پر تھوکا تو اتنے ڈالر جرمانہ، اگر کچرے کی ٹوکری گھر سے باہر نہیں رکھی تو جرمانہ، اشارہ توڑا تو جرمانہ......'' پھر ان ملکوں میں انصاف اور مساوات ہے، امیر اور غریب، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ ہر آدمی قانون کا احترام کرتا ہے، نہ کرے تو پھر سزا، چاہے وہ ملک کا صدر ہی کیوں نہ ہو۔

''اور ہم کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ مہذب ہیں، ہوائی اڈے یا کسی عوامی جگہ نہیں تھوکتے تو اچھی بات ہے۔ اگر تھوکتے ہیں تو کوئی آپ کو پوچھنے والا نہیں۔ مغربی حکومتیں کبھی اپنے باشندوں کو بے ایمانی کرنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔ چناں چہ وطن سے محبت تو خود بخود جنم لے گی نا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر ہم اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں اپنے کام سے مخلص ہونا چاہیے، خواہ ہم کوئی بھی ہوں، کہیں بھی ہوں۔ ہم جب رشوت، حق تلفی، ظلم، عدم مساوات، غرور، سستی، دھوکا دہی، ذخیرہ اندوزی، خود غرضی اور دیگر گناہوں میں ملوث ہو جائیں تو کیا ہم خدا کو ناراض نہیں کرتے؟ کیا اپنے وطن کا حق پامال نہیں کر دیتے؟

''ہمیں اپنے مردان مجاہد کی طرح گرم جھلستی دوپہروں میں صحرا کی خاک نہیں چھاننی، سخت سردی میں جوانوں کے مانند سرد سمندری پانی میں غوطے نہیں لگانے، کھردرے راستوں اور پتھروں پہ کہنیوں کے بل نہیں چلنا، اور فوجیوں کی طرح صعوبتیں برداشت نہیں کرنا۔ ہمیں تو گھر بیٹھے صرف اپنی خواہشات نفسانی کو خیرباد کہنا ہے۔ کیا اپنے وطن کی محبت میں اتنا بھی نہیں کر سکتے؟ ہمیں میدان جنگ جا کر اپنا سر نہیں کٹانا، صرف اپنے رب کے حضور جھکانا ہے کہ اے اللہ!

ہم تیری خاطر ساری برائیاں چھوڑتے ہیں، تو ہم سے راضی ہو جا۔ ہمیں اس دھرتی پر اپنے گناہوں کا بوجھ کم کرنا ہے تاکہ ہم امن سکون جیسی قیمتی نعمت پھر سے پا سکیں۔

"کیا وطن سے محبت کرنا صرف فوج پر فرض ہے؟ ان سیاستدانوں پر فرض نہیں جو اس ملک میں انصاف اور مساوات کا بول بالا کرنے سے کتراتے ہیں؟ کیا ان قانون دانوں پر فرض نہیں جو اس ملک میں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتے؟ کیا محبت ان ڈاکٹروں پر فرض نہیں جو مریضوں سے منہ مانگی فیسیں لیتے ہیں؟ کیا ذخیرہ اندوز، رشوت لینے و دینے والا، نقل کر کے پاس ہونے، کسی کا حق مارنے اور سود کھانے والا اس وطن سے محبت کرتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ ہماری فوج دنیا کی بہادر ترین آرمی ہے اور ہر حال میں ہماری حفاظت کرے گی۔ لیکن کیا اس وطن کو چمن بنانے میں ہماری کوئی ذمے داری نہیں؟"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ کیا فوج سے منسلک لوگوں کے علاوہ کوئی اس وطن سے محبت نہیں کرتا......؟ حیدر کے لہجے میں تلخی در آئی۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"دراصل ہمارے وطن کی مثال ایک ایسے کمرۂ جماعت کی سی ہے جس میں تعلیم یافتہ استاد درس دے رہا ہے لیکن وہ طلبہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا! اب جس کا جی چاہے وہ درس سنے اور سمجھے، جو چاہے شرارتیں کرے، شور مچائے اور دوسرے طلبہ کو تنگ کرے، استاد صاحب تو درس دے کر چلے گئے۔ اب تم خود ہی بتاؤ، ایسی جماعت کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

"اس کے برعکس ایسی جماعت میں جہاں استاد ڈسپلن کا خیال رکھے، تمام طلبہ پر درس نوٹ کرنے اور امتحان دینے کی پابندی عائد ہو تو وہاں "معمولی ذہانت والا" طالب علم بھی کچھ کر دکھائے گا۔ تو میرے بھائی! ترقی یافتہ ملکوں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ ذرا سوچو ان حالات میں بھی پاکستانیوں کی ذہانت اور ہنر کو ساری دنیا مانتی ہے۔ اگر ہم میں بقول قائداعظمؒ نظم و ضبط اور ایمان پیدا ہو جائے تو فوج کی طرح پاکستانی قوم بھی دنیا میں نمبر ون ہو جائے۔ ہمارا ایمان ہی ہمیں محبت کرنا سکھاتا ہے۔ اور وطن سے محبت بھی ایمان کا حصہ ہے۔"

"میرا خیال ہے، رات کافی بیت چکی، اس موضوع پر صبح بات ہوگی۔" ایمن سوئی رانیہ کو گود میں لیتے ہوئی بولی۔

ثوبان بھی امی کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ اماں جان تہجد کی نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگیں۔ حیدر تنہا بیٹھا بھابی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ ایمن بچوں کو ٹھیک سے کمبل اوڑھا کر بستر پر کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ آج اسے نیند آ جائے۔

حیدر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا کچھ دیر میز پر پڑے رسائل کی ورق گردانی کرتا رہا پھر اٹھ کر اپنے لیے کافی بنا لایا۔ باہر ہر سو تاریکی اور سردی کا راج تھا۔ اس نے کافی کا مگ میز پر رکھا اور ٹی وی چلا دیا۔ نیوز چینلوں پر حسب معمول افسردہ خبریں چل رہی تھیں۔ وہ بور ہو کر چینل بدلتا رہا۔ ہر دوسرے چینل پر بھارتی گانے آ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ ریموٹ اور آنکھیں ٹی وی پر جم کر رہ گئیں۔

اس نے صوفے پر ٹیک لگائی اور ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر دھیرے دھیرے گرم کافی پینے لگا۔ بھارتی لڑکوں اور لڑکیوں کا ہوشربا ناچ جاری تھا۔ نیچے ایک سلائیڈ مسلسل دکھائی جا رہی تھی: "ہم آپریشن ضرب عضب میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والے سرفروشوں کو سلام پیش کرتے ہیں۔" منجانب ہالی وڈ کیبلز۔

◆●●

رسول اللہ ﷺ کی نظر میں

بہترین مرد

گھر کو جنت کا ٹکڑا بنادینے والا
بیش قیمت قلمی تحفہ

ڈاکٹر سید حسنین ندوی

ایک معاشرے میں بہترین مرد کسے قرار دیا جائے؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے، ہر شخص اپنے ذوق، نقطۂ نظر اور سوچ کے مطابق دے گا۔ اہلِ علم اور اربابِ دانش کی نظر میں ہوسکتا ہے اس کا مستحق وہ ہو جس نے علم و دانش کی سنگلاخ وادیوں میں آبلہ پائی کی اور معرفت و حکمت کی بلند و بالا چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ جبکہ مادیت کے متوالوں کی نگاہیں ان افراد پر مرکوز ہوجائیں گی جنھوں نے مال و دولت کی دوڑ میں بہتوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ بینک بیلنس نہ صرف عزیز و اقارب، بلکہ انکم ٹیکس والوں کے لیے بھی مرکزِ توجہ بن جائے۔ اس کے برعکس شہرت و ناموری کو سب کچھ سمجھنے والے یہ خطاب اسے دینا پسند کریں گے جس کا ڈرائنگ روم تمغوں اور انعامات سے بھرا ہو قریہ و شہر اس کے پرستاروں کی بھیڑ ملے۔ ہوسکتا ہے بعض لوگوں کا ذہن سماجی راہنماؤں کی طرف جائے جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ ان سب آرا کا المیہ یہ ہے کہ یہ سب محدودیت کا شکار اور زندگی کی خاص جہت کی آئینہ دار ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے، ان حوالوں سے بہترین سمجھا جانے والا شخص زندگی کے وسیع تناظر میں بدترین ثابت ہو۔

اس سوال کا شاندار اور جامع

مالی تعاون کی اپیل

ادارہ آمنہ جنت فاؤنڈیشن و ماڈل اسکول، چونیاں سٹی

کارکردگی کے آئینے میں

اسکولوں اور کالجز کی طالبات میں تعلیم القرآن کے فروغ کے لیے کوشاں

بلاشبہ ایک بچی کی تربیت ایک خاندان کی تربیت ہے۔ ادارہ ہذا میں غریب اور مفلس، یتیم بچیوں اور نادار طالبات کو بہترین ماحول میں دینی و دنیاوی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

ادارہ آمنہ جنت فاؤنڈیشن ماڈل اسکول

میں اس وقت 185 طالبات اور ترجمہ و حفظ میں 37 طالبات زیرِ تعلیم ہیں

تمام مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے اپیل ہے کہ اپنے صدقات، خیرات، عطیات، زکوٰۃ فنڈ سے نقد یا قرآن مجید کے نسخوں، تفاسیرِ قرآن، کتب حدیث، رحلیں چھوٹی و بڑی، ڈیسک اور دریاں ادارے کو عطیہ کریں۔

اس کارِ خیر میں ہمارا ساتھ دیں۔ جزاکم اللہ

صدقات و زکوٰۃ فنڈ منی آرڈر، چیک کے ذریعے ارسال فرمائیں

قرآن مجید کے نسخہ جات (قرآن مجید کے سیٹ) دینی کتب و احادیث دستی یا ڈاک کے ذریعے ارسال کرنے کے لیے پتا درج ذیل ہے:

رضیہ پروین فاضل وفاق المدارس

چیئرمین و پرنسپل

نوٹ: ہمارے پاس مفلس گھرانوں کے مزید 125 بچے شعبہ انگلش میڈیم میں داخلے کے منتظر ہیں

چیک یا ڈرافٹ ارسال کرنا چاہیں تو ڈرافٹ یا چیک آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 02745 ایم سی بی چونیاں برانچ نمبر 0240 کے نام بھجوائیں۔ آن لائن بھی جمع کروا سکتے ہیں۔

اس صورت میں مطلع ضرور کریں آن لائن اکاؤنٹ ایم سی بی PK86MUCB0673440401002745 ٹائٹل اکاؤنٹ آمنہ جنت ویلفیئر فاؤنڈیشن ایم سی بی چونیاں برانچ

نوٹ: ادارہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے ادارے کو دیے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں، مزید رابطے کے لیے:

پرنسپل آمنہ جنت فاؤنڈیشن ماڈل اسکول چونیاں ضلع قصور

فون نمبر: 0322-7614497 0300-4735932

عبدالرشید

ربیعہ حمید

عائشہ گلزار

محمد بلال

فہد مسعود

ڈاکٹر دلشاد رشید

میزان بنک سمن آباد لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0240 0100882859
بنک آف پنجاب سمن آباد لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0110 002 000424 0003
بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0247 002 000827 0003
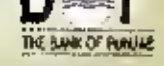
لاہور 19/21 اقرا اسکیم ایوانِ اردو ڈائجسٹ سمن آباد، لاہور فون: 42-042-37522741 فیکس: 042-37552576

آفس موبائل: 0321-8461122, 0333-8461122, 0345-8461122 ای میل: info@klf.com.pk

کراچی آفس: 3/1 ڈی بلاک 6۔ پی ای سی ایچ ایس، کراچی فون: 021-34382303 فیکس: 021-34532420 موبائل: 0300-9280487

اسلام آباد آفس: کمرہ نمبر 5 فرسٹ فلور مسرت آرکیڈ G-11 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2220933 موبائل: 0300-8187044, 0321-5587250

USA Address: 'Karwan-e-ilm Foundation' 19 West 34th Street 1024, New York, NY 1001.
Ph: (212) 268-3500/3501, Fax (212) 268-3502

جواب وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی جانب سے دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ''بہترین مرد'' کے خطاب کا مستحق وہ ہے جس کا سلوک اپنی گھر والی کے ساتھ بہترین ہو۔

(سنن الترمذی)

بظاہر یہ بات عجیب لگتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ شاید ازدواجی معاملات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی۔ لیکن اگر سنجیدگی سے اس حدیث کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ بہترین مرد کے انتخاب کے لیے گھر والی کے ساتھ سلوک سے بہتر کوئی معیار نہیں! یہ اتنی جامع اور وسیع کسوٹی ہے جس پر کسی کو بھی پرکھنے کے بعد یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کیا واقعی وہ بہترین شخص ہے یا اس نے شرافت کا محض مکھوٹا لگا رکھا ہے۔

بعض لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہوتے نہیں۔ بلکہ ظاہر کبھی کبھی اتنا پرفریب ہوتا ہے کہ اس سے اچھے خاصے جہاں دیدہ اور تجربہ کار لوگ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ لوگ دینداری کا لبادہ اس مہارت کے ساتھ اوڑھتے ہیں کہ لوگ ان کی شرافت کی قسمیں کھائے ہوئے نہیں جھجکتے۔ لیکن ان کی عائلی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلے گا کہ ظاہری شرافت و دینداری سب گھر سے باہر ہے۔ گھر کے اندر وہ شخص بدتمیز، خودغرض اور شقی القلب ہے۔ باہر شرافت و مروت کا دم بھرنے والا گھر میں انتہائی وحشی ہے اور ہر دن ظلم و بربریت کی نئی داستان رقم کرتا ہے۔ اسے اللہ و رسول کے احکام و تعلیمات کی پروا ہے اور نہ ہی اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا گھر منور کر کے اسے جنت کا ایک ٹکڑا بنانے کی فکر جہاں اضطراب کے بجائے سکون کا ڈیرا ہو، تنگی کے بجائے فراخی ملے اور کراہت کی تیرگی کے بجائے انسیت کے دیپ جھلملاتے ہوں۔

اس طرح بیوی کے ساتھ سلوک ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر مرد کی اصلی تصویر نظر آجاتی ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی بالادستی کے جوہر عموماً کمزوروں کے سامنے دکھانا پسند کرتا ہے۔ صنف نازک سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بیویاں عموماً کمزور، بے بس و بے کسی کا پیکر ہیں۔ عزیز و اقارب اور حامی و ناصر سے دور بڑی حد تک شوہر اور اس کے گھر والوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے، ان کی تھوڑی سی کوتاہی شوہر کے آتش غضب کو بھڑکا دیتی ہے۔ وہ معمولی سی غفلت پہ چراغ پا ہو جاتا ہے۔ عام طور پر وہ بیوی کی مستقل حیثیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس خیال سے کہ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والی ہستی کی حیثیت ہی کیا ہے؟ چناں چہ وہ بیوی کے ساتھ توہین آمیز رویہ اپنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔

نازیبا کلمات کا استعمال تو عام سی بات ہے، بعض گھروں میں معاملہ گالم گلوچ اور مار پیٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس معاملہ میں جاہل اور تعلیم یافتہ کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں، اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ کچھ تعلیم یافتہ افراد اپنے رویے کو حق بجانب قرار دینے کے لیے بعض اقوال کا سہارا لینے سے بھی نہیں چوکتے، جیسے یہ کہ شوہر کی حیثیت مجازی خدا کی ہے۔ اسلام میں اگر اللہ کے سوا کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو بیویوں کو اپنے شوہر کو سجدہ کرنا پڑتا۔ وہ ہندو فلسفے کے قائل ہیں جو بیویوں کو داسی اور شوہروں کو سوامی قرار دے کر بیویوں کے ساتھ کسی بھی سلوک کی اجازت دیتا ہے۔

جب کبھی عورتوں کے حقوق کی بات اٹھے، مسلمان یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ اسلام نے تو آج سے

پندرہ سو سال قبل عورتوں کو دے دیے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے خواتین کو معاشرے میں جو عزت واحترام دیا اور وسیع و جامع حقوق عطا کیے، مغرب اپنی طویل جدوجہد کے باوجود اس حد تک نہیں پہنچ سکا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے عطا کردہ حقوق مسلم خواتین کو حاصل ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ہو سکتا ہے اس سلسلے میں کچھ استثنا ہوں لیکن عام طور پر مسلم خواتین کے حالات غیر مسلم سے اچھے نہیں۔ وہ بھی انھی کی طرح گھریلو تشدد کا شکار ہیں۔ مظلومیت ان کا مقدر ہے اور خوش نصیب خواتین ہی کو نجات مل پاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین مرد ہونے کے لیے جو معیار متعیّن فرمایا، اس کی روشنی میں اگر حیاتِ طیبہ کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اس حوالے سے بھی عالمِ انسانیت کے لیے مثالی نمونہ ہے۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اسے اپنی زندگی میں سمو لیں اور اپنی عائلی زندگی سنواریں۔

رشتہ ازدواج میں اللہ تعالیٰ نے مودت و رحمت کا تخم فطری طور پر ڈال دیا ہے۔ جو لوگ اس کی آبیاری و دیکھ بھال کریں، وہ نہ صرف اس کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتے؛ بلکہ اس کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کا سفر آسان و سہانا بنا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ قدر نہ کریں، وہ اس کے فیضان و برکات سے بہت حد تک محروم ہی رہتے ہیں۔ یہ رشتہ اپنی پائیداری اور برگ و بار کے لیے باہمی اعتماد، تعاون و ہمدردی، ایثار و قربانی، عزت و احترام اور پیار و محبت کا محتاج ہے۔

آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی پر انھی خصوصیات کی گہری چھاپ رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ و مشفقانہ ہوا کرتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دلجوئی و احترام میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دیتے اور اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا خیال رکھتے۔ ایک سفر میں جب انجشہ نامی غلام نے اس اونٹ کو تیز چلانے کی کوشش کی جس پر بعض ازواج مطہّرات سوار تھیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آہستہ چلانے کا حکم دیا، اس خیال سے کہ کہیں وہ ڈر نہ جائیں یا انہیں کوئی تکلیف نہ ہو (صحیح بخاری)

''حضرت صفیہؓ ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے اس بات پر رونا شروع کر دیا کہ وہ جس اونٹنی پر سوار تھیں، وہ بہت آہستہ چلتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے، اپنے دست مبارک سے ان کے آنسو پونچھے اور دلاسہ دیا'' (سنن النسائی: ۹۰۷۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیویوں کی تعریف میں بھی کمی نہ فرماتے' بلکہ برملا اس کا اظہار کیا کرتے۔ چناں چہ ایک مرتبہ فرمایا ''خدیجہ سے مجھے شدید محبّت ہے'' (صحیح مسلم) حضرت عائشہؓ کے بارے میں فرمایا: ''حضرت عائشہؓ کی فضیلت دیگر عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے ثرید کی دیگر کھانوں پر۔'' (صحیح البخاری)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کی دلجوئی کا اس حد تک خیال رکھتے کہ جب ایک ایرانی پڑوسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ ڈش ''مرق'' بنایا اور آپ کو دعوت دی' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول نہیں فرمایا۔ دراصل اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا آنے کے لیے کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گوارا نہ تھا کہ شریکِ حیات کے بغیر دعوت میں جائیں۔ لہٰذا جب اس نے آپ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کو بھی دعوت دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت قبول فرمائی اور تشریف لے گئے۔'' (صحیح مسلم) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات

کا نہ صرف حد درجہ خیال رکھتے، بلکہ ان کے مزاج شناس تھے اور ان کے چشم و ابرو کے اشارے کو بھی اچھی طرح سمجھتے۔ چناں چہ ایک مرتبہ عائشہؓ سے فرمایا: ''میں یہ جان جاتا ہوں کہ کب تم مجھ سے ناراض ہو اور کب خوش؟''

انھوں نے دریافت کیا: ''وہ کیسے یا رسول اللہ؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب تم ناراض ہو تو کہتی ہو: رب ابراہیمؑ کی قسم اور جب خوش رہتی ہو تو کہتی ہو: رب محمدؐ کی قسم'' (صحیح مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج کے ساتھ اس حد تک عزت و احترام کا معاملہ فرماتے کہ ایک مرتبہ حضرت صفیہؓ دوران اعتکاف آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد نبوی میں ملنے آئیں۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم احتراماً انھیں مسجد کے دروازے تک چھوڑنے تشریف لائے'' (بخاری)

رائے کی اہمیت

خواتین کو گھروں میں خاص اہمیت نہیں دی جاتی لہٰذا اہم امور میں ان سے مشورہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ تمام اہم فیصلے شوہر خود کرتے ہیں۔ بیگم کا کام صرف سمع و طاعت ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف گھریلو بلکہ امت سے متعلق بعض امور میں بھی بوقت ضرورت ازواج سے مشورہ فرماتے تھے، اور ان کے مشوروں پر عمل بھی کیا کرتے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے باوجود حضرات صحابہؓ میں سے کسی نے نہ قربانی کی اور نہ بال منڈائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت حال سے کافی پریشان ہوئے۔ خیمہ میں آکر اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہؓ سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ یا رسول اللہ! آپ باہر تشریف لے جائیے، اپنی قربانی ذبح کیجیے، بال منڈائیے اور واپس آجائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ یہ دیکھ کر حضرات صحابہؓ بھی با دل ناخواستہ اٹھ کھڑے ہوئے، قربانی کی اور پھر بال منڈائے (صحیح البخاری)

گھریلو امور میں تعاون

شریک حیات کے ساتھ گھریلو امور میں مشارکت و تعاون میں شوہر حضرات کم ہی دلچسپی لیتے؛ بلکہ بعض تو کسر شان سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے بھی بیوی پر انحصار کرتے ہیں۔ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ گھریلو کام میں اپنی بیویوں کا ہاتھ بٹاتے۔ چناں چہ حضرت عائشہؓ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر کے اندر کیا معمول ہوا کرتا تھا تو انھوں نے بیان کیا ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاموں میں گھر والوں کی مدد کیا کرتے تھے، (صحیح البخاری) ایک اور روایت میں انھوں نے فرمایا ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے خود ہی سی لیا کرتے۔ چپل کی مرمت کر لیتے۔ اس کے علاوہ وہ سارے کام کرتے جو اکثر مرد اپنے گھر میں انجام دیتے ہیں۔'' (مسند الامام احمد)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے خود ہی سی لیا کرتے۔ چپل کی مرمت کر لیتے۔ اس کے علاوہ وہ سارے کام کرتے جو اکثر مرد اپنے گھر میں انجام دیتے ہیں۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ زندگی کی یکسانیت، معمول اور سنجیدہ و ٹھوس اعمال کے تسلسل سے بور ہو جاتا ہے۔ قویٰ مضمحل، اعصاب پژمردہ اور دلچسپیاں مدہم پڑ جاتی ہیں۔ ایسے میں کچھ تبدیلی، تنوع اور چٹپٹی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ تھکن کے غبار چھٹ جائیں

انسان تازہ دم ہو کر نئی آن اور شان سے کشاکشِ حیات کی جانب متوجہ ہو۔ کھیل تفریح یا آج کی اصطلاح میں ''انٹرٹینمنٹ'' اس میدان میں تیر بہدف کا کام کرتا ہے۔

اسلام فطری مذہب ہے، وہ انسان کی اس فطری طلب پر قدغن لگانے کے بجائے درست انداز میں تسکین کی راہیں کھلی رکھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف جلوت بلکہ خلوت میں بھی اسے برتا اور رزم و بزم کے علاوہ اپنی خانگی زندگی کو بھی اس کی پھلجھڑی سے گلنار و گلزار بنائے رکھا۔ چناں چہ ایک مرتبہ حبشہ کے کچھ لوگ مسجد نبوی کے سامنے اپنے کرتب اور کھیل تماشہ کا مظاہرہ کرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا یہ تماشہ دیکھنا چاہو گی؟ انھوں نے ہاں میں جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دروازہ کے پاس کھڑے ہوگئے اور حضرت عائشہ ؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے پر ٹیک لگا کر کھیل دیکھتی رہیں۔'' (النسائی)

ایک غزوہ سے واپس آتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلے کو آگے جانے کا حکم دیا۔ ان کے جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ ؓ کے ساتھ دوڑ لگائی۔ (سنن ابی داؤد) حضور ﷺ جب گھر پر نہ ہوتے تو حضرت عائشہؓ کی سہیلیاں آجاتیں اور سب مل کر کھیلا کرتی تھیں۔ حضور ﷺ کے آتے ہی سب ادھر ادھر چلی جاتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بلواتے اور خود باہر چلے جاتے۔ اس طرح حضرت عائشہؓ کو سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارنے اور کھیلنے کے مواقع فراہم کرتے۔'' (صحیح مسلم)

ناپسندیدہ بات

عام زندگی کی طرح ازدواجی زندگی بھی نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ من میں لڈو پھوٹنے والی باتوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی تن میں آگ لگا دینے والی باتیں بھی سننے کو ملتی ہیں۔ کاشانہ ﷺ نبوت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج مطہرات سے کوئی نامناسب بات سننے کو ملتی تو اس پر ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کرنے کے بجائے حکیمانہ انداز میں اس طرح غلطی کی تصحیح فرماتے کہ اصلاح ہو جائے اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت صفیہؓ زار و قطار رو رہی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت حفصہؓ نے مجھے یہودی کی بیٹی ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تسلی دی اور فرمایا ''اس میں عار کی کوئی بات نہیں، بلکہ یہ تو ایک اعزاز ہے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا۔ تم ان سے کہہ دو کہ میرے شوہر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، باپ ہارونؑ ہیں اور چچا موسیٰؑ؛ لہٰذا میرے سامنے کیا اہمیت جتاتی ہیں؟'' (سنن الترمذی)

ازدواجی چشمک

میاں بیوی کے درمیان نوک جھونک، بحث و تکرار اور شکر رنجی ہونا بھی عجیب چیزیں ہیں۔ پیار و محبت کی اس نگری کے اصول و ضابطے عام دنیا کے آئین و قوانین سے بالکل الگ ہیں۔ یہاں ہار میں جیت ہوتی ہے اور جیت میں ہار لہٰذا وہ ناداں جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں، اس رشتے کی لطافت و لذت سے محرومی ان کا مقدر بنتی ہے۔ دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے مواقع پر کیا انداز ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کا کسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا: ''ہمارے درمیان تم کس سے مفاہمت کرانا پسند کرو گی؟ کیا حضرت عمرؓ پر تم متفق ہو؟''

حضرت عائشہؓ نے کہا: ''حضرت عمرؓ کے مزاج میں

سختی ہے، میں انھیں اس معاملے میں لانا نہیں چاہتی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "کیا تم یہ پسند کروگی کہ تمہارے والد، حضرت ابوبکرؓ ہم دونوں کے درمیان صلح کرادیں؟"

انھوں نے کہا: "ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو بلوالیا۔ جب وہ تشریف لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے پھر پوچھا کہ پہلے تم اپنی بات کہوگی یا میں؟ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ پہلے آپ ہی اپنی بات کہیں، لیکن بالکل ٹھیک ٹھیک کہیں۔ یہ سنتے ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بیٹی کو ایک تھپڑ رسید کردیا۔ اس سے پہلے کہ مزید کچھ ہوتا۔ حضرت عائشہؓ بھاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اوٹ میں آگئیں۔

یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: "آپ جاسکتے ہیں، میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلایا تھا۔" جب حضرت ابوبکرؓ چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے کہا: اِدھر قریب آو۔" وہ نہ آئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابھی تو باپ کے ڈر سے قریب آگئی تھیں اب کیا ہوگیا؟"

تھوڑی دیر بعد حضرت ابوبکرؓ واپس آئے تو دیکھا دونوں ہنس رہے ہیں۔ انھوں نے کہا: "مجھے بھی اپنی صلح میں ویسے ہی شریک کریں، جیسا کہ ناچاقی کے دوران شریک کیا تھا۔" (ابوداود: ۴۹۹۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی بات پر اہلیہ سے شدید ناراض ہوتے تو اس کا اظہار یوں کرتے کہ انھیں تنہا چھوڑ دیتے۔ آپ ﷺ نے اس وقت یہ قدم اٹھایا جب ازواجِ مطہرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کثیر نان ونفقہ کا مطالبہ کیا تھا۔

کردار سے متعلق شکوک وشبہات

ازدواجی رشتے کی خوب صورت شاہراہ پر کبھی کبھی خطرناک پیچ وخم آکر سفر مشکل بنا دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے مواقع پر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتے اور حادثے کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کہ بیوی کے کردار سے متعلق شکوک وشبہات کا تصور ہی کسی شوہر کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے۔ یہ وہ حساس موضوع ہے جو بسا اوقات ایک شریف اور سنجیدہ شخص کو بھی مشتعل کردیتا ہے۔ بعض تو جوشِ غضب میں انتہائی خطرناک اقدام تک کرجاتے ہیں۔ ایسے مواقع سے حضور ﷺ کو بھی گزرنا پڑا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیوی، حضرت عائشہؓ کے کردار پر بعض شرپسندوں نے کیچڑ اچھالا اور اس افواہ کو مدینہ کی گلی کوچے میں پھیلا دیا۔ اس کی خبر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ ﷺ نے محض بے بنیاد افواہ کی بنیاد پر بیوی کو قصوروار گرداننے کے بجائے مسجدِ نبوی کے منبر سے ان کا دفاع کیا۔ چناں چہ فرمایا: "اے مسلمانو! میرے اہل سے متعلق تکلیف دہ بات مجھ تک پہنچی ہے۔ خدا کی قسم میں ان کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔" اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست حضرت عائشہؓ سے بات کی اور فرمایا: مجھ تک تمہارے بارے میں ایسی ایسی باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تم اس تہمت سے بری ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری برات واضح کردے گا۔ اگر تم سے ایسا کوئی گناہ ہوگیا، تو اللہ سے توبہ واستغفار کرو!

یہ محض چند نمونے سیرتِ نبوی سے پیش کیے گئے۔ ورنہ سیرتِ نبویؐ اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مسلمان اگر اپنی زندگی کو بھی سیرتِ نبویؐ کے مطابق ڈھال لیں تو کئی ازدواجی پیچیدگیوں سے نجات پاجائیں گے۔

(صاحب مضمون حیدرآباد دکن (بھارت) سے نکلنے والے سہ ماہی رسالے "صنعا" کے مدیرِ اعلیٰ ہیں)

دنیا میں مسلم حکومتوں کا طوطی بولتا

ترکی جب سپر پاور تھا

عثمانی ترک خلافت کے خلاف
مغربی ممالک کی سازشوں اور
اپنوں کی غداری کا عبرت ناک قصہ

محسن فارانی

آخری قسط

اپریل ۱۹۰۹ء میں سامراجی ایجنٹوں کے ذریعے خلیفہ عبدالحمید کی معزولی خاتمہ خلافت عثمانیہ کا پہلا اقدام تھا۔ اب عبدالحمید ثانی کے بھائی، سلطان محمد خامس کو خلیفہ بنایا گیا۔ وہ ایک کمزور اور بے بس حکمران تھا۔ چناں چہ انجمن اتحاد و ترقی کے کارپرداز ترکی میں مختارِ کل بن گئے۔

اگست ۱۹۰۹ء میں دستوری ترمیم سے قرار پایا کہ آئندہ خلیفہ صرف صدر اعظم کو نامزد کرے گا۔ باقی وزرا کے تقرر کی ذمے داری صدر اعظم کی ہوگی۔ خلیفہ کو پارلیمان توڑنے کے اختیارات سے بھی محروم کر دیا گیا۔ کابینہ پارلیمان کے سامنے ذمہ دار قرار پائی۔ پارلیمان کو مسودات پیش کرنے کا بھی مساوی حق مل گیا۔ یہ منصب خلافت کو اختیارات سے محروم کرنے کی صہیونی صلیبی سازش کا دوسرا قدم تھا۔

طرابلس (لیبیا) پر اطالوی قبضہ

ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے یورپی طاقتوں سے ساز باز

کر کے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا۔ عذرِ لنگ یہ پیش کیا گیا کہ ترک اٹلی کی جانب سے طرابلس میں پرامن داخلے کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ ادھر برطانیہ نے عثمانی فوج کو مصر سے گزر کر لیبیا جانے کی اجازت نہ دی۔ ۵/اکتوبر کو اٹلی نے طرابلس الغرب میں فوج اتار ڈالی۔ ترک فوج نے انور پاشا کی سرکردگی میں بہادرانہ مقابلہ کیا مگر اطالوی بحریہ نے ساحل شام کے متعدد شہروں پر گولہ باری کر کے ترکوں کو بے بس کر دیا۔ جہاد طرابلس کے حوالے ہی سے علامہ اقبالؒ نے ''فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے'' نامی مشہور نظم لکھی۔

مئی ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے جزیرہ روڈس اور جزائر دوازدہ (Dodecanese) پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸/اکتوبر کو صلح کا معاہدہ ہوا۔ ترکوں نے اس شرط پر طرابلس کی سیادت چھوڑ دی کہ اٹلی جزائر دوازدہ خالی کر دے گا۔ دراصل بلقان جنگ کا خطرہ مدنظر رکھ کر ترکی، طرابلس سے دستبرداری پر مجبور ہو گیا۔ تاہم طرابلس کے سنوسی قبائل نے اٹلی کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ ۱۹۱۲ء میں البانیہ نے ترکی سے علیحدگی اختیار کر لی۔

جنگ بلقان میں پسپائی

جنوری ۱۹۱۲ء میں خلیفہ نے پارلیمان توڑ دی۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں نئی پارلیمان کے انتخابات ہوئے جن میں انجمن اتحاد و ترقی نے ہر طرح کا ناجائز دباؤ استعمال کر کے بھاری اکثریت حاصل کر لی۔ ۱۲/جولائی کو اعتدال پسند احمد مختار پاشا نے کابینہ تشکیل دی۔ نئی حکومت نے پارلیمان توڑ کر ۵/اگست کو مارشل لا لگا دیا۔ دریں اثنا جزیرہ نما بلقان میں بلغاریہ، سرویا (سربیا) اور یونان نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر ڈالا۔

کرک کلیسا اور برگاس کی لڑائیوں میں ترکوں کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ بلغاری فوجیں شتلجہ تک پہنچ گئیں جہاں قسطنطنیہ کے آخری دفاعی مورچے قائم تھے۔ جانباز ترکوں نے ۲۱۔۲۲/نومبر کو محاذِ شتلجہ پر بلغاری فوج کا حملہ ناکام بنا دیا۔ انہی دنوں بلغاری فوج نے ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں لندن میں صلح کانفرنس کا آغاز ہوا۔ اس دوران نوجوان ترکوں نے انور پاشا کی سرکردگی میں حکومت پر قبضہ کر لیا اور محمود شوکت پاشا کو وزیراعظم بنا دیا۔ صلح کانفرنس (لندن) کی قرارداد کی رو سے ۳۰/مئی ۱۹۱۳ء کو پہلی جنگ بلقان ختم ہو گئی۔ ترکی جزیرہ اینوس، مقدونیہ کے بڑے حصے، البانیہ اور جزائر ایجین سے دستبردار ہو گیا۔

جلد ہی ترکی کے مفتوحہ علاقے بانٹنے پر جھگڑا ہوا اور بلغاریہ پر سرویا اور یونان نے حملہ کر دیا۔ بلغاریہ کو مات ہو گئی۔ رومانیہ اور ترکی بھی بلغاریہ کے خلاف شریک جنگ ہوئے۔ غازی انور پاشا نے دس ہزار فوج کے ساتھ یلغار کر کے بلغاریہ سے ادرنہ واپس لے لیا۔ دریں اثنا یورپی طاقتوں نے دباؤ ڈال کر پھر جنگ بند کرا دی۔ سرویا اور یونان نے مقدونیہ کے مفتوحہ علاقے اپنے تسلط میں رکھے۔ معاہدہ قسطنطنیہ (۲۹/ستمبر ۱۹۱۳ء) کی رو سے بلغاریہ نے ادرنہ (ایڈریانوپل) پر ترکوں کا تسلط تسلیم کر لیا جو آج تک برقرار ہے۔ ۲۸/نومبر ۱۹۱۳ء کو ترکی نے البانیہ کی آزادی تسلیم کر لی۔ البانیہ یورپ کا مسلم اکثریت والا پہلا آزاد ملک تھا۔

اس دوران صدراعظم محمود شوکت پاشا کو قتل کر دیا گیا۔ نوجوان ترکوں میں سے اصل حکمران اب تین شخص تھے: انور پاشا، طلعت پاشا اور جمال پاشا۔ ان تینوں نے ہر مخالفت کو سختی سے دبائے رکھا۔ انور پاشا وزیر جنگ مقرر رہا۔

جنگ عظیم میں ترکی کو گھسیٹنے کی سازش

۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو آسٹریا کا ولی عہد فرڈی ننڈ سرائیوو (بوسنیا) میں ایک سرب کے ہاتھوں قتل ہوا جو بھاگ کر سربیا (سرویا) میں پناہ گزین ہو گیا۔ آسٹریا نے سربیا کو قاتل حوالے کرنے کا الٹی میٹم دیا اور پھر سربیا پر لشکر کشی کر دی۔ سربیا کے سرپرست روس نے ۳۰ جولائی کو آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس کے بعد ۴ اگست کو جرمنی، آسٹریا جبکہ برطانیہ و فرانس سربیا کے حق میں جنگ کے میدان میں کود پڑے۔

یوں پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا۔

اس جنگ میں ترکی کو گھسیٹنے کی سازش تیار کی گئی اور نوجوان ترک سامراجیوں کے آلۂ کار بن بیٹھے۔ ابتدا میں حکومت ترکیہ غیر جانبدار تھی لیکن یہود و نصاریٰ کی سازش سے ترکی کو جنگ میں الجھانے کا اسٹیج تیار تھا تاکہ سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر لیے جائیں جو چھ صدیوں سے یورپ کے خلاف مصروفِ جہاد چلی آ رہی تھی۔ انگریز راہنما علی الاعلان کہنے لگے کہ اس جنگ کا نتیجہ خواہ کسی صورت برآمد ہو، اس کے خاتمے پر خلافتِ اسلامیہ برقرار نہیں رہے گی بلکہ ترکی کا وجود ختم ہو جائے گا۔ دراصل یہود و نصاریٰ کا اس پر اتفاق ہو گیا تھا کہ فلسطین اب مسلمانوں کے تسلط میں ہرگز نہیں رہے گا تاکہ وہاں یہودی ریاست وجود میں آسکے۔

انگریزوں کی دغا بازی

جنگ طرابلس (۱۹۱۱ء) کے موقع پر جدید بحری بیڑے کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے ترکیہ نے ایک برطانوی جہاز ساز کارخانے کو دو جنگی جہاز بنانے کا آرڈر دیا۔ جہاز تیار ہو گئے مگر جنگ عظیم چھڑ جانے پر برطانیہ نے یہ کہہ کر روک لیے کہ ان کی خود اسے ضرورت ہے۔ دریں اثنا دو جرمن جنگی جہاز بحیرہ روم میں برطانوی جہازوں سے بچ کر درہ دانیال کی راہ ترکی کے سمندر میں چلے آئے۔ جرمنوں نے یہ دونوں جہاز ترکی کی نذر کر دیے اور اس طرح ترکوں کو اپنا حلیف بنا لیا۔

چناں چہ خلافت ترکیہ نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو برطانیہ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ خلیفہ محمد خامس نے خود اعلان جہاد کیا۔ ادھر انگریزوں نے ہندوستانی فوج کے ذریعے عراق پر چڑھائی کر دی۔ جنرل ٹاؤن شینڈ کی زیر قیادت ۹۰ ہزار برطانوی فوج بصرہ سے آگے کوت العمارہ تک پہنچ گئی۔ ترکوں نے یہ ساری فوج گھیرے میں لے لی۔ محاصرہ دسمبر ۱۹۱۵ء سے اپریل ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ آخر ۲۹ اپریل کو برطانوی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

شرمناک سائیکس۔ پیکو اور بالفور معاہدے

مئی ۱۹۱۶ء میں برطانوی وزیر خارجہ مارک سائیکس اور فرانسیسی وزیر خارجہ جارج پیکو کے مابین ایک خفیہ معاہدہ ہوا۔ اس نے ترک ایشیائی صوبوں کی تقسیم سے

متعلق برطانیہ، روس اور فرانس کے معاہدے (۱۶/اپریل ۱۹۱۶ء) کی توثیق کر دی۔ ادھر برطانوی حکومت نے شریف مکہ، حسین بن علی ہاشمی کو شاہ عرب بنانے کا چکمہ دے کر ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرلیا۔ شریف مکہ کو برطانوی جاسوس ولد الزنا، لارنس آف عریبیا نے گمراہ کیا تھا۔ برطانوی وزیر جنگ لارڈ کچنر نے شریف مکہ کو آزادی کی مشروط "ضمانت" دی۔

دوسری طرف نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر خارجہ لارڈ آرتھر بالفور نے عالمی صہیونی تنظیم (WJO) سے ایک خفیہ معاہدہ کر کے فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے عوض یہودی سائنس دان، شائم وائزمین نے تیل کے متبادل کے طور پر ایسی ٹون (Acetone) ایجاد کر کے اس کا فارمولا برطانیہ کو دیا کیونکہ برطانوی حکومت اپنے بحری و ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور ٹرکوں کے لیے تیل کی کمی محسوس کر رہی تھی۔ یہی وائزمین ۱۶/مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کا پہلا صدر بنا۔ دوسری طرف ایک یہودی کیمیا داں نے روایتی بارود کے بجائے تباہ کن نیا بارود، ٹرائی نائٹروٹالوئین (TNT) ایجاد کیا۔ یہ فارمولا لارڈ بالفور کو پیش کرتے ہوئے اس نے معاوضے میں یہودی وطن مانگ لیا۔

شریف مکہ جس نے مسلمانوں کو تقسیم کردیا

آخری صلیبی فاتح یروشلم میں

انگریزوں کے بھڑے میں آکر عربوں نے ۵/جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف بغاوت کرڈالی۔ شریف مکہ کے بدوؤں نے لارنس کی مدد سے حجاز ریلوے لائن جگہ جگہ سے تباہ کرڈالی۔ وہ پھر مدینہ منورہ میں متعین ترک فوج پر حملہ آور ہوا۔ ۷/جون کو شریف مکہ نے حجاز کی آزادی کا اعلان کیا۔ ۱۰/جون کو مکہ مکرمہ کی ترک فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ ۲۹/اکتوبر کو حسین نے اعلان کیا کہ وہ پورے عرب کا بادشاہ ہے۔ ۱۵/دسمبر کو برطانیہ نے اسے شاہ حجاز تسلیم کرلیا۔ حسین ہاشمی کی اس غداری پر علامہ اقبال نے فرمایا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ!
خاک و خوں میں لوٹتا ہے ترکمانِ سخت کوش

دسمبر ۱۹۱۶ء میں نئی برطانوی فوج عراق میں پیش قدمی کرنے لگی۔ ۲۳/فروری ۱۹۱۷ء کو کوت العمارہ اور ۱۱/مارچ کو بغداد پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ برطانوی لشکر ۲۳/اپریل کو سامرا، ۹/ستمبر کو رمادی اور ۶/نومبر کو تکریت پہنچا۔ ادھر اکتوبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی جنرل ایلن بی نے عقبہ (اردن) پر قبضہ کر کے فلسطین پر یلغار کی۔ ۷/نومبر کو غزہ اور ۸/دسمبر کے دن بیت المقدس (یروشلم) پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا۔ ایلن بی نے یروشلم میں داخل ہو کر کہا: "میں آخری صلیبی فاتح ہوں۔"

یوں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں بیت المقدس کی فتح (۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء) کے ۷۳۰ برس بعد صلیبی لشکر ایک بار پھر بیت المقدس پر قابض ہو گیا۔ برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے یہ کہہ کر خوشی ظاہر کی

کہ آج عیسائیوں نے صلیبی جنگ جوؤں کی شکست کا بدلہ لے لیا۔ اس پر شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے بڑے قلق سے کہا تھا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ہندوستان میں انگریز حکومت کو آیۂ رحمت سمجھنے والی مرزا قادیانی کی امت کے لوگوں نے بھی خوشیاں منا کر سرکار برطانیہ سے وفاداری کا اظہار کیا۔ برطانوی اور عرب لشکر کرنل لارنس کی زیر قیادت ۱۔۲ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو دمشق پر قابض ہو گیا۔ فرانس نے ۷ر اکتوبر کو بیروت، ۱۵ر اکتوبر حمص اور ۲۶ر اکتوبر کو حلب پر قبضہ جما لیا۔

گیلی پولی کا صلیب شکن معرکہ

آغاز جنگ میں ترک فوج کو اسماعیلیہ (مصر) کے مقام پر شکست ہوئی۔ برطانیہ نے پھر درہ دانیال پر حملے کے لیے بہت بڑی مہم بھیجی جس میں برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا، ہندوستان، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقا کی فوجیں شامل تھیں۔ ۱۸ر مارچ ۱۹۱۵ء کو اتحادی فوجیں گیلی پولی کے ساحل پر اترنے لگیں۔ اس دوران ترکوں نے گولہ باری کر کے کئی برطانوی جہاز غرق کر دیے۔

گیلی پولی کے محاذ پر مصطفیٰ کمال پاشا انچارج افسر تھا۔ یہ لڑائی ۲۵ر اپریل ۱۹۱۵ء سے ۸ر جنوری ۱۹۱۶ء تک جاری رہی۔ اس میں ترکوں نے بے مثال مزاحمت دکھائی۔ آخر کار اتحادی فوجیں شکست کھا کر جزیرہ نما گیلی پولی سے بھاگ گئیں۔ اس جنگ میں فریقین کے دو لاکھ سے زیادہ سپاہی مارے گئے۔

وحید الدین محمد سادس کی خلافت

۳ر جولائی ۱۹۱۸ء کو سلطان محمد خامس نے وفات پائی اور وحید الدین محمد سادس خلیفہ بن گئے۔ انھوں نے جنگ کے ذمہ دار طلعت پاشا، جمال پاشا اور انور پاشا کو وزارت سے الگ کر دیا۔ یہ تینوں ملک سے باہر چلے گئے۔ اب عزت پاشا صدرِ اعظم بنا۔ دفاعی لحاظ سے ترکی کی حالت بہت نازک ہو چکی تھی۔ ترکوں نے مجبور ہو کر ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جنگ بندی قبول کر لی، آبنائے باسفورس اور درہ دانیال کھول دیا گیا۔ جنرل ٹاؤن شینڈ سمیت اتحادی قیدی واپس کر دیے اور فوجیں میدان جنگ سے ہٹا لیں۔

جنرل ایلن بی۔۔۔۔ بیت المقدس پر قبضے کے دوران

۱۳ نومبر کو اتحادی بیڑہ قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ ترکوں کے اتحادیوں، آسٹریا نے ۴ر نومبر اور جرمنی نے ۱۱ر نومبر کو شکست تسلیم کر لی۔ اگلے سال اناطولیہ میں ادالیہ پر اطالوی (۲۹ر اپریل ۱۹۱۹ء) اور سمرنا (ازمیر) پر یونانی (۱۴ر مئی) قابض ہو گئے۔ ۱۳ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال کی زیر قیادت ترک قوم پرستوں نے میثاق ملی کا اعلان کیا۔ اس میں قسطنطنیہ کی حفاظت اور ترک

علاقوں کے اتحاد کا عزم ظاہر کیا گیا۔ قسطنطنیہ میں پارلیمان نے میثاق ملی کو اپنا لیا۔ ۸ردسمبر ۱۹۱۹ء کو قسطنطنیہ کا نظم ونسق اتحادی افواج نے سنبھال لیا۔ اسی برس ہندوستان میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا جس میں علی برادران پیش پیش رہے۔

معاہدہ سیورے کی سامراجی شرائط

مارچ ۱۹۱۹ء سے داماد فرید پاشا صدراعظم بن گئے۔

معرکۂ گیلی پولی میں شریک ترک فوجی

۱۱راپریل ۱۹۲۰ء کو پارلیمان توڑ دی گئی تو قوم پرستوں نے انگورہ (انقرہ) میں عارضی حکومت بنا لی۔ ادھر معاہدہ سیورے (۱۰جون ۱۹۲۰ء) ترکوں پر مسلط کر دیا گیا۔ اس معاہدے میں سبھی غیرترک علاقوں سے سلطنت عثمانیہ کی دست برداری، مملکت حجاز میں شریف حسین کی خودمختاری، شام پر فرانس اور عراق و فلسطین پہ برطانیہ کی عمل داری، سمرنا کا علاقہ پانچ سال کے لیے یونان کے زیرتسلط رہنے، جزائر دوازدہ اور روڈس اٹلی کے تسلط میں دیے اور آرمینیا کی خودمختاری کے نکات نمایاں تھے۔ خلیفہ کی طرف سے پرزور احتجاج ہوا۔ ترک قوم پرستوں نے بھی شدید مخالفت کی مگر قسطنطنیہ پر قابض صلیبی ان کا احتجاج خاطر میں نہ لائے۔

اب یونانیوں نے اناطولیہ میں پیش قدمی کی۔ انھیں برطانوی وزیراعظم لائڈ جارج کی آشیرباد حاصل تھی۔

یونانیوں نے بتاریخ ۹رجون ۱۹۲۰ء برسہ اور ۲۵رجون کو ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰راگست ۱۹۲۰ء کو حکومت قسطنطنیہ نے معاہدہ سیورے پر دستخط کر دیے۔ اس دوران اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال نے آرمینیا کی فوجوں سے قارص اور اردا خان (شمال مشرقی ترکی) کے علاقے آزاد کرا لیے۔

۲۱رجنوری ۱۹۲۱ء کو مجلس انقرہ نے قانون اساسی منظور کر لیا جس کی رو سے پارلیمان کا انتخاب بالغ حق رائے دہی

سے قرار پایا۔ نیز صدرِ اعظم کو وسیع اختیارات دیے گئے۔
یہ خلافت کو عضوِ معطل بنانے کا اگلا اقدام تھا۔

یونانیوں کی ذلت سے پسپائی

۱۳؍مارچ ۱۹۲۱ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے اٹلی سے معاہدہ دوستی کر لیا۔ جون تک اطالوی فوج ترکی سے نکل گئی۔ دریں اثنا یونانیوں نے ۲۸ تا ۳۰؍مارچ کو افیون قرہ حصار اور ''اسکی'' نامی شہر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷؍جولائی ۱۹۲۱ء کو یونانی کوتاہیہ پر بھی قابض ہو گئے۔ جنگ سقاریہ (۲۴؍اگست۔ ۱۶؍ستمبر ۱۹۲۱ء) میں ترکوں نے جانبازی سے مدافعت کی اور یونانی انقرہ پہنچنے میں ناکام رہے۔ اُدھر فرانس نے سلیشیا کا علاقہ خالی کر کے اقتصادی مراعات لے لیں۔

اب ترکوں نے جوابی کارروائی کر کے افیون قرہ حصار (۳۰؍اگست ۱۹۲۲ء) بروسہ (۵؍ستمبر) اور سمرنا (۹۔۱۱؍ستمبر) آزاد کرا لیے جسے یونانی آگ لگا کر برباد کر چکے تھے۔ ۸۰؍ہزار یونانی فوج کا بیشتر حصہ گرفتار کر لیا گیا۔ انہی دنوں مدانیہ کانفرنس ہوئی جس میں ترکوں کی نمائندگی عصمت پاشا (عصمت انونو) کر رہے تھے۔ اتحادیوں نے مشرقی تھریس اور ادرنہ ترکوں کو واپس کرنے پر صاد کر دیا۔

خلافت کا خاتمہ

یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مصطفیٰ کمال نے ترک سلطنت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ گویا ترکی اب ایک جمہوریہ قرار پایا جس کا مدارالمہام ''غازی'' مصطفیٰ کمال مقرر ہوا۔

سلطان محمد سادس برطانوی جنگی جہاز ''مالٹا'' میں سوار ہو کر قسطنطنیہ سے سنگاپور چلا گیا۔ ۱۸؍نومبر ۱۹۲۲ء کو مجلس ملی کبیر کی طرف سے اس کے چچیرے بھائی عبدالحمید ثانی کی خلافت کا اعلان ہوا۔

۲۴؍جولائی ۱۹۲۳ء کو معاہدہ لوزان طے پایا۔ دریائے مرزا تک مشرقی تھریس اور جزائر امبروس اور ٹینی ڈوس کے علاقے ترکی کو مل گئے۔ بحیرہ ایجین کے باقی تمام جزیرے یونان کی ملکیت قرار پائے۔ اٹلی جزائر دوازدہ پر قابض رہا اور قبرص کا برطانیہ نے الحاق کر دیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا جس کے ہاتھوں خلافت کا خاتمہ ہوا

ترکوں نے عدالتی نظام کی اصلاح یعنی شرعی قوانین کے خاتمے کا وعدہ کیا' تاہم کوئی تاوان قبول نہ کیا۔

۲۳؍اگست ۱۹۲۳ء کو اتحادی فوجیں قسطنطنیہ سے نکل گئیں۔ دولت ملیہ ترکیہ کا آئندہ دارالحکومت انقرہ قرار پایا۔ ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی میں جمہوریت کا رسمی اعلان ہوا اور مصطفیٰ کمال صدر اور عصمت انونو وزیر اعظم بن گئے۔ رجب ۱۳۴۲ھ/۳؍مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت منسوخ کر دی۔ خاندانِ عثمان کے تمام افراد جلاوطن کر دیے گئے۔ خلیفہ عبدالحمید ثانی نے فرانس کا رخ کیا۔ یوں ''غازی'' کے ہاتھوں عالم اسلام کی وحدت کی علامت' خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ ڈاکٹر امین اللہ وثیر مرحوم استاد عربی، قیصری یونیورسٹی (ترکی) بتاتے تھے کہ ترک مسلمان مصطفیٰ کمال کو یہودی بچہ کہتے تھے۔

مصطفیٰ کمال کے خلافِ اسلام اقدامات

نئے ترک صدر نے اقتدار حاصل کر کے کینچلی بدلی

اور وہ تمام خلافِ اسلام اقدامات کیے جن کا وہ اپنے سرپرست یہود و نصاریٰ سے وعدہ کر چکا تھا۔ ان کی تفصیل یوں ہے:

☆تعددِ ازدواج کی تنسیخ اور نئے قانون طلاق کا نفاذ (اگست ۱۹۲۴ء)

☆علما کے حلقے توڑ دیے گئے (۲ ستمبر)

☆ترک ٹوپی پہننے کی ممانعت (نومبر)

☆عورتوں کے لیے برقع پہننا اختیاری بنا دیا گیا۔ بعد میں نسوانی پردے کی کامل ممانعت کر دی گئی۔

☆اسلام کے سرکاری مذہب ہونے کی دفعہ منسوخ ہوئی۔ (۹ر اپریل ۱۹۲۸ء)

☆سرکاری سند خطابت کے بغیر مساجد میں وعظ کی ممانعت۔

☆مردوں کے لیے کوٹ پتلون اور ہیٹ پہننے کو لازم قرار دیا گیا۔

☆عربی رسم الخط ختم کر کے ترکی زبان پر لاطینی رسم الخط تھوپا گیا تاکہ ترکوں کو ان کا شاندار ماضی بھول جائے۔

☆ترک زبان میں اذان دینے کی پابندی (جو ۱۹۵۱ء تک لاگو رہی)

احیائے خلافت کی کوشش ناکام

یوں مغربی فرنگیوں نے اسلامی وحدت ختم کرانے کی خاطر تنسیخِ خلافت سمیت تمام غیر اسلامی اقدامات مصطفیٰ کمال سے کروائے جسے ترک اب اتاترک (ترکوں کا باپ) کہنے لگے تھے۔ یہود و نصاریٰ کو خلافت سے اس قدر اِبا (انکار) تھا کہ جب عثمانی خلافت ختم ہونے پر شریفِ مکہ حسین بن علی نے خلیفہ بننے کی کوشش کی تو برطانیہ نے اسے انتباہ کیا ''نہیں، خلیفہ نہیں.....تم صرف کنگ (بادشاہ) ہو گے۔'' یوں برطانوی کٹھ پتلی حسین بن علی ہاشمی نے بادشاہ (الملک) کہلانے ہی پر اکتفا کیا۔

۳ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اس نے بادشاہت سے دست برداری اختیار کی اور ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو اس کا جانشین بیٹا علی بھی دست بردار ہو گیا۔ ۸ر جنوری ۱۹۲۶ء کو عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آلِ سعود نے ملک حجاز اور سلطان نجد ہونے کا اعلان کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز نے ۱۹۲۴ء میں طائف اور مکہ اور دسمبر ۱۹۲۵ء میں مدینہ اور جدہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

ادھر احیائے خلافت کے سدباب کے لیے انگریزوں نے جامعہ ازہر (قاہرہ) میں بلائی گئی خلافت کانفرنس کو بھی سبوتاژ کر دیا۔ اس طرح ۱۳۳۱ سال سے چلی آ رہی اسلامی خلافت کا مستقل طور پر خاتمہ ہو گیا۔ ◆◆◆

صالح فکر

قائداعظم ہمیشہ صاف گوئی سے کام لیتے اور ہر مسئلے کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کے ذہن میں اُن کا مقصد اور وہ راستہ جو انھیں اپنی منزلِ مقصود کے حصول کے لیے اختیار کرنا ہوتا' ہمیشہ واضح رہتا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ جس راہ پر وہ گامزن تھے وہ کٹھن اور ناہموار تھی ۔ اُس میں جگہ جگہ ایسی دشواریاں اور رکاوٹیں موجود تھیں جن پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ لیکن وہ بے باک، مطمئن اور باعزم رہے۔ انھوں نے جذبات کو کبھی اپنے فکر اور فیصلے میں دخل اندازی کی اجازت نہ دی۔

(ایم۔ اے ایچ اصفہانی)

سرخ و سفید رنگت اور بھاری جسم رکھنے والے مصطفیٰ احمد بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ زمیندار خاندان سے تعلق تھا۔ علاقے کے تمام افراد انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے۔

ان کے تین بچے تھے: دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ امیدوں کا مرکز خاندان کا واحد چشم و چراغ عریش مصطفیٰ تھا۔ وہ جب مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے تو بیٹے کو اپنی مسند پر جلوہ افروز دیکھتے مصطفیٰ احمد مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھوئے رہتے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی فیصلہ منظور تھا۔

عریش مصطفیٰ زمین دار گھرانے کا واحد سپوت تھا۔ مگر خاندانی روایات اور ملک کے دگرگوں حالات سے بے حد نالاں رہتا۔ وہ بچپن ہی سے ہونہار طالب علم ثابت ہوا۔ تعلیم میں اور ہم نصابی سرگرمیوں میں آگے آگے رہتا لیکن تھوڑا بہت خودغرض انسان بھی تھا۔

سنگ مرمر پہ چلتے نہ پھسلو

مٹی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو

دولت کمانے اور جھوٹی انا پانے کی خاطر دیار غیر جانے والوں کے لیے ایک تازیانہ

کبریٰ شاہین

بچپن میں جب مصطفیٰ احمد گھر میں بچوں کے لیے چیزیں لاتے تو سب سے پہلے عریش کے آگے رکھی جاتیں۔ وہ پسند کر کے اپنی مرضی سے کوئی چیز لے لیتا۔ بقیہ چیزیں بچیوں کو دی جاتیں۔ یوں خود غرضی کا بیج عریش احمد میں بویا گیا جو بعد کو تناور درخت بن بیٹھا۔

مصطفیٰ احمد کی پوری کوشش ہوتی کہ بیٹے کو کسی چیز کی کمی نہ رہے اور اس کے منہ سے نکلی ہر خواہش پوری کی جائے۔اس لاڈ پیار نے عریش کو ضدی اور مغرور بنا دیا۔

وقت گزرتا گیا۔ عریش مصطفیٰ نے اپنی زندگی کی پچیس بہاریں گزار لیں۔اس دوران عریش کی ماں چل بسی۔ مصطفیٰ احمد بھی اب خود میں وہ توانائی نہ پاتے جو دس بیس سال پہلے محسوس کرتے تھے۔ وہ اب زمینداری عریش کے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن بیٹا کچھ اور ہی سوچ بیٹھا تھا۔عریش کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ زمین دارہ یا پاکستان میں کاروبار کرے۔

مصطفیٰ احمد اپنے تخت پر براجمان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں غرق تھے۔ ''السلام علیکم بابا جان۔''

''وعلیکم السلام عریش بیٹے، کیسے ہیں آپ؟'' بیٹے کو دیکھ کر مصطفیٰ احمد کے سوچوں میں ڈوبے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔ وہ غور سے اسے دیکھنے لگے۔''عریش! آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟'' بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے الجھتا دیکھ کر مصطفیٰ احمد بولے۔

''جی بابا جان، آپ جانتے ہیں کہ میری تعلیم مکمل ہو چکی ۔میں چاہتا ہوں کہ امریکا جاؤں اور وہیں اپنا کاروبار کروں۔'' عریش احمد نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ بیٹا؟ یہ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا؟ آپ کو شروع ہی سے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے تھی کہ آپ کو خاندانی زمین دارہ ہی سنبھالنا ہے۔ مصطفیٰ احمد نے رسانیت سے کہا۔

''ہونہہ......زمین داری! اگر مجھے گنواروں والے کام ہی کرنے ہوتے تو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اتنی تگ و دو کیوں کرتا؟ بس بابا جان میں نے کہہ دیا مجھے امریکا ہی جانا ہے۔ آپ پلیز میرا ویزہ لگوا دیں۔''

مصطفیٰ احمد ہونق کھڑے اپنے لاڈلے سپوت کا منہ تکنے لگے۔ آخر خود کو سنبھالتے ہوئے بولے''عریش بیٹے! اگر آپ زمین دارہ پسند نہیں کرتے تو کوئی بات نہیں، آپ پاکستان ہی میں کاروبار کر لیں۔ یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ ماشاءاللہ ہر چیز یہاں موجود ہے۔''

''کیا ہر چیز ہے بابا جان؟...... بتائیے...... یہاں اپنی جان تک تو محفوظ نہیں، آئے دن دھماکے ہو رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ کوئی جرم ایسا نہیں جو یہاں نہ ہو۔ بابا جان میں یہاں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''لیکن بیٹے......'' باپ نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے۔''

لیکن ویکن کچھ نہیں بابا جان۔'' عریش نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا''میں نے جو کہہ دیا، مجھے امریکا جانا ہے اور بس جانا ہی ہے۔''

اور...... مصطفیٰ احمد بالآخر مان گئے۔ انھوں نے اپنی لاڈلی اولاد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ مانتے نہ تو کیا کرتے؟ عریش اپنی دھن کا پکا تھا۔

بات اگر ظرف کی ہو تو یوں کر لو
تم جیت جاؤ اور ہار اپنے نام کر لو

اس طرح عریش مصطفیٰ امریکا سدھار گیا۔ ڈگری تو اس کے پاس پہلے ہی سے تھی۔ ذہین بھی تھا۔ جلد اسے اچھی ملازمت مل گئی اور وہ دن بدن ترقی کے مدارج طے

کرنے لگا۔ شروع شروع میں بابا جان سے رابطہ رہا۔ لیکن [illegible]ن و دولت میں کھو کر رفتہ رفتہ وہ اپنے بوڑھے باپ کو [illegible]ھلا گیا۔ بس کبھی کبھار فون کر دیتا۔ کچھ عرصے بعد عریش کی ملاقات نیلم نامی ایک پاکستانی لڑکی سے ہوئی جو مادہ پرستانہ سوچ میں اس سے دو ہاتھ آگے اور دولت کی رسیا تھی۔

عریش نے نیلم سے شادی کر لی۔ جلد ہی اللہ نے انھیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔ عریش کے ہاں بھی تین بچے ہوئے۔ وہ ان کی تربیت مغربی انداز میں کرنے لگا۔ ان کا بولنا چالنا، پہننا، اوڑھنا، غرض ہر طرح سے وہ انھیں مغربی طرز پر رنگنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی اصل مکمل طور پر بھول جائے۔

تینوں بچوں میں اس کی بیٹی، دعا بالکل الگ نکلی۔ وہ بہت کم گو تھی اور اپنا زیادہ وقت لائبریری میں گزارتی۔ کم عمری ہی میں اس نے موٹی موٹی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ایک دن دعا کی اپنی ہم جماعت سے لڑائی ہو گئی۔ انگریز لڑکی نے طعنہ دیا "یہ میرا ملک ہے، تم اپنے ملک کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

دعا روتی ہوئی گھر آئی۔ عریش نے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا "کیا ہوا ہماری بیٹی کو؟ کسی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟" اسے دعا کی کم گوئی اور اچھی عادتوں کے باعث اس سے زیادہ لگاؤ تھا۔

"پاپا ہمارا ملک کون سا ہے؟"

"کیوں بیٹا، امریکا ہی ہمارا ملک ہے۔"

"پاپا یہ ہماری کنٹری نہیں۔ آج میری کیتھی سے لڑائی ہوئی تو اس نے کہا! Get out from my country۔ (یہاں سے دفع ہو جاؤ)۔ پاپا پلیز بتائیے ہمارا ملک کون سا ہے؟"

"بیٹا! میں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔ آپ کی مام بھی پاکستانی ہیں۔ مگر پیاری بیٹی، تم امریکا میں پیدا ہوئیں۔ سو تم امریکی ہی ہو۔"

عریش نے اپنے تئیں اسے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن دعا عام بچوں کی طرح نہیں تھی کہ بات آسانی سے ذہن سے نکال دیتی۔ دس سالہ دعا کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس کا ملک امریکا نہیں۔ رفتہ رفتہ وقت گزر گیا اور دعا بیس سال کی ہو گئی۔ اس دوران دعا نے دوسری بہت سی کتابیں پڑھنے کے علاوہ اسلامی لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا۔ اسے اپنے ماں باپ پر حیرت ہوتی جو مسلمان ہونے کے باوجود ان کی تربیت خالصتاً مغربی انداز میں کر رہے تھے۔

دعا کے ذہن میں ہر وقت یہ کیڑا کلبلاتا کہ اسے اپنے اصل ملک یعنی پاکستان ایک دفعہ ضرور جانا چاہیے۔ ایک دن اس نے باپ سے یہ اجازت طلب کی کہ وہ پاکستان جانا چاہتی ہے۔ عریش حیران ہوا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود آج پھر بیٹی پاکستان پاکستان کی رٹ لگا رہی ہے۔ اس نے سختی، نرمی، ہر طرح سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھی عریش کی بیٹی تھی۔ باپ جانتا تھا کہ دعا کسی چیز کے لیے ضد نہیں کرتی، اس بار اگر کر رہی ہے تو اسے جانے دینا چاہیے۔ آخر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ عریش نے اسے والدین کے گھر کا پتا دیا اور پاکستان بھیج دیا۔

☆☆

دعا لاہور کے ہوائی اڈے پر پہنچی تو اسے گوناگوں سکون کا احساس ہوا۔ وہ پاک فضا اور اپنے ملک میں آزادی کی سانسیں لے رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے گاڑی سے باہر کے مناظر دیکھنے لگی۔ اسے اپنے پاپا اور ایک طرح سے اپنا ملک بہت اچھا لگا۔ دعا اپنے دادا جان، مصطفیٰ احمد کی

حویلی پہنچی تو گھنٹی بجانے پر ایک ملازم باہر نکلا۔ دعا نے اس سے دادا کے متعلق پوچھا۔ وہ اسے مصطفیٰ احمد کے کمرے تک لے گیا۔ دعا نے ہلکے سے دروازے پہ دستک دی تو نحیف سی آواز آئی ”آجاؤ۔“

دعا اندر گئی تو کمرے میں نیم اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بستر پر جھریوں بھرے چہرے والے ایک باباجی محو استراحت ہیں۔ اکلوتے بیٹے کی جدائی نے اس چاق وچوبند آدمی کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ مصطفیٰ احمد تعجب سے دعا کو دیکھنے لگے۔ وہ آہستہ سے ان کے پاس آئی، ہاتھ پر بوسہ دیا اور بولی ”دادا جان! میں دعا عریش امریکا سے آپ کو ملنے آئی ہوں۔“

مصطفیٰ احمد کی تو یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ بائیس سال بعد اپنے لاڈلے بیٹے کی نشانی دیکھ کر انھیں خود پر قابو نہ رہا، وہ دعا کو سینے سے لگائے دیر تک زاروقطار روتے رہے۔ خاصی دیر بعد سنبھلے تو ہلکے پھلکے انداز میں پوتی سے گفتگو کرنے لگے۔ آج مصطفیٰ احمد بہت عرصے بعد کھل کر مسکرائے تھے۔

☆☆

دعا کو آئے دو تین ہفتے گزر گئے۔ ایک دن دعا نے دادا جان سے واپس جانے کی اجازت طلب کی تو مصطفیٰ احمد کو اداسی نے پھر آگھیرا۔ دعا نے پیار سے دادا کا ہاتھ پکڑا اور کہا ”دادا جان! میں چاہتی ہوں کہ پاپا پاکستان آ جائیں۔ آخر وہ اتنے ناراض کیوں ہیں کہ آپ اور پاکستان کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے؟“

مصطفیٰ احمد افسردگی سے بولے ”بیٹی! بات دراصل یہ ہے کہ عریش نے ایک آزاد ملک میں آنکھ کھولی مگر وہ آزادی کی قدروقیمت نہیں جان سکا۔ جب کوئی چیز بغیر جدوجہد کے مل جائے تو اس میں سو خامیاں نظر آتی ہیں۔ چناں چہ اس نے ہر نعمت کو ٹھوکر ماردی۔ لیکن مجھے یقین ہے، اسے احساس ضرور ہوگا کہ اس نے کتنی بڑی نعمت کو ٹھکرایا ہے۔“

دعا واپس اپنے کمرے میں آئی، تو کچھ سوچ کر اپنا سیل فون اٹھالیا۔ ”السلام علیکم پاپا۔“

”وعلیکم السّلام بیٹا! بہت دن ہو گئے، اب جلد واپس آ جاؤ۔“

دعا ان کی بات نظرانداز کر کے بولی ”نہیں پاپا! آپ پاکستان آجائیں۔“

عریش نے حیران ہوتے ہوئے کہا ”کیسی باتیں کر رہی ہو دعا، میں نے امریکا میں قدم جمانے کے لیے پوری عمر گزار دی۔ اب جب میں سیٹ ہو چکا تو تم کہہ رہی ہو کہ میں سب چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ جاؤں۔ بالکل نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”پاپا! کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ کئی سال وہاں رہ کر بھی خود کو عام شہری کی حیثیت سے نہیں منوا سکے۔ وہاں کوئی نہیں کہتا کہ آپ کی کنٹری امریکا ہے۔ کیوں پاپا کیوں آپ اپنی ثقافت کو بھول گئے؟ آپ نے ہماری تربیت بھی مغربی انداز میں کی۔ ہمیں پاکستانی تہذیب سے کیوں روشناس نہیں کرایا؟ آپ اور ماما نے ہمیشہ کہا، جینز پہنو، کلب جاؤ۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ نماز پڑھو، شلوار قمیص پہنو سر پہ دوپٹہ اوڑھو۔

”آپ دونوں تو پاکستانی تھے نا پاپا، پیدائشی مسلمان! پھر کیوں ہمیں اسلام سے دور رکھا؟ آج آپ نے وہاں دولت تو بہت اکٹھی کر لی لیکن اپنا عزت والا مقام نہیں بنا سکے۔ امریکی حکومت ایک ادنیٰ امریکی شہری کو آپ سے زیادہ حیثیت دیتی ہے۔ آپ سوچیے، آج وہاں آپ کی کیا حیثیت ہے؟ پاپا سوچیے گا ضرور اور کچھ دن بعد مجھے اپنے

فیصلے سے آگاہ کیجیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں پاکستان ہی رہوں گی۔ میں آپ کی طرح خودغرض نہیں بن سکتی پاپا کہ اپنے بوڑھے دادا کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ اگر آپ اور ماما بھی میرے ساتھ رہیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

☆☆

دعا نے دل کی بھڑاس نکال کر فون بند کر دیا۔ اُدھر فون سن کر باپ سوچوں میں گم ہو گیا۔ وہ وہیں صوفے پر ڈھے کر اپنا محاسبہ کرنے لگا۔ آج دعا کی باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ دن پہلے ہی ہمدان نشے میں مست گھر پہنچا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ "ہائی سوسائٹی" میں ایسی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا، معاملہ رفع دفع کر دیا۔ لیکن آج صبح جب ہمدان نے کاروبار میں سے اپنا حصہ مانگا تو عریش کے ڈانٹنے پہ ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔ اس نے قانون سے مدد لینے کی دھمکی دی اور گھر سے چلا گیا۔

اس واقعے سے عریش احمد ڈھے سا گیا۔ اس میں وہ پہلی والی اکڑفوں نہیں رہی اور اب دعا کی باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سوچنے لگا "آج تک میں نے کیا پایا ہے؟ صرف دولت......؟ دولت تو کما لی لیکن اپنا پیارا ملک اور اپنے پیارے رشتے کھو بیٹھا۔"

آج جب وہ تھک جاتا کسی اپنے پیارے کا کندھا ڈھونڈتا جو اسے سہارا دے سکے۔ لیکن اسے اپنے سارے عزیز و اقارب دور، بہت دور کھڑے نظر آتے جہاں وہ نہ پہنچ پاتا۔ عریش بہت تھک چکا تھا۔ وہ اپنے دیس میں پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں تلے آرام کرنا چاہتا تھا۔ غور و فکر کے بعد عریش نے پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ کر اس نے طمانیت کا گہرا سانس لیا اور موبائل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب اسے بیٹی کو یہ خوش کن خبر سنانی تھی

آئینی جدوجہد

قائداعظم کے کردار کا ایک پہلو یہ تھا کہ انھوں نے آئین و قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جدوجہد کی۔ گاندھی جی تمام عمر قانون شکنی کی تحریکیں چلاتے رہے۔ ہزارہا لوگ جیلوں میں گئے۔ اُن کے کنبے الگ صعوبتیں جھیلتے رہے۔ یہ تحریکیں زیادہ تر ناکام رہیں اور ان سے ہندو عوام میں احساس شکست پیدا ہوتا رہا۔ قائداعظم جانتے تھے کہ ہندو قوم امیر ہے، وہ ایسے صدمے برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن مسلمان قوم غریب ہے۔ اگر اُسے پے درپے آزمائش کی بھٹی میں ڈالا گیا، تو اُس کی معاشی حالت اور پست ہو جائے گی۔ دوسرے ہندو عدم تشدد یا اہنسا کے عقیدے کو اپنا سکتے ہیں، مسلمان اس منافقت کے قائل نہیں۔ اُن پر اجنبی راج کی پولیس لاٹھی برسائے گی تو وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے اور ایک غیر مسلح قوم کب تک برطانوی سامراج کی پولیس اور فوج کی طاقت کا مقابلہ کر سکے گی؟ تیسری وجہ یہ تھی کہ قانون شکنی کی تحریکیں شدید نظم و ضبط کے بغیر نہیں چل سکتیں اور مسلمان ابھی اچھی طرح منظم نہیں ہوئے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر قائداعظم نے تحریک پاکستان کو آئین و قانون کی حدود کے اندر رکھا اور صرف اس وقت باہر لائے جب لوہا گرم تھا؛ بس ایک چوٹ کی کسر تھی۔ (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید)

کہ اسی نے پاپا کی آنکھیں بائیس سال بعد کھول دی تھیں۔ چند ہی ہفتے بعد عریش اپنی پاک سرزمین کی طرف گامزن ہو گیا۔

اپنے مرکز سے اگر دور نکل جاؤ گے
خواب ہو جاؤ گے، افسانوں میں ڈھل جاؤ گے
اپنی مٹی پہ ہی چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

روزانہ سیکڑوں کام کرنے کے باوجود

بابا "ویلا" اے

ناخلف اولاد کی چیرہ دستی و سرکشی کا نشانہ بنے ایک مظلوم باپ نے جب سنائی اپنی داستانِ الم

سجاد قادر

دفتر سے چھٹی کے بعد میں بھاگم بھاگ سڑک کنارے پہنچا تاکہ سواری پکڑ کے جلدی سے گھر پہنچ سکوں' مگر انتظار لمبا ہوتا چلا گیا۔

چونکہ شام کو تمام دفاتر کی چھٹی ہوتی' اس لیے جو بھی ویگنیں یا رکشے آتے سواریوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے۔ عجلت میری آنکھوں اور حرکات سے عیاں تھی۔ میں اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ کیا کروں، ایک موٹر سائیکل سوار سامنے سے گزرا۔ وہ تھوڑا سا آگے جا کر رکا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں" کے مصداق میں بھاگ کر اس تک پہنچا۔

وہ مجھ سے کچھ یوں مخاطب ہوا "برخوردار! میں آپ کے لیے ہی رکا ہوں۔ میں نے آپ کے چہرے سے اندازہ لگالیا کہ آپ عجلت میں ہیں۔" پھر مسکراتے ہوئے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ وہ ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھے۔ کہنے لگے "اس وقت اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ سواری ملنا بہت مشکل ہے۔ اس
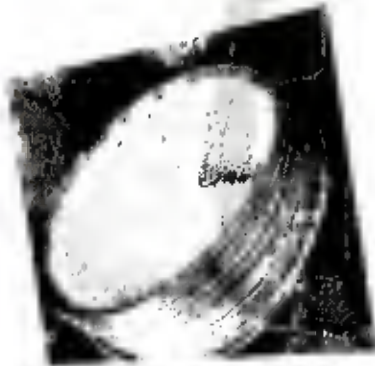
لیے سوچا' آپ پتا نہیں کب سے یہاں کھڑے ہیں۔ چلو آپ کو لفٹ دے دیتا ہوں۔'' میں نے دوبارہ شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

انھوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ میں اس غیر متوقع جواب پہ قدرتاً حیران ہوا۔ وہ پھر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بولے ''بابا ویلا اے'' ساتھ ہی ان کا گلا رندھ گیا۔

میں نے سوچا' یہ بندہ زندہ دل ہے اور دکھی بھی! جانے اسے کیسی پریشانیاں درپیش ہیں۔ میں نے قدرے حیرت سے استفسار کیا ''کیا مطلب؟''

وہ بولے ''بیٹا! صبح سویرے اُٹھ کر نماز پڑھنے کے بعد گوالے سے دودھ لاتا ہوں۔ پھر انڈے' ڈبل روٹی اور کلچے لانا بھی میری ذمے داری ہے۔ نجانے کیوں آج کل کی بہو بیٹیوں نے گھروں میں ناشتا تیار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ شاید ہر چیز بازار سے پکی پکائی جو مل جاتی ہے۔ پھر پوتے پوتیوں کو اسکول چھوڑنے جاتا ہوں۔ اس کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام انجام دیتا ہوں۔ مثلاً سوئی گیس کے چولھے کا بٹن خراب ہے یا پانی کا پائپ لیک کر رہا ہے۔ اِس ماہ بجلی کے بل میں سابقہ بل بھی لگ کر آ گیا' اُسے ٹھیک کرانا ہے۔ لیسکو والے بھی نجانے کس مٹی کے بنے ہیں' وہ ہم صارفین کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کے بجائے مزید پیچیدگیوں میں الجھا دیتے ہیں۔ وقتی طور پر کہتے ہیں بل درست کر دیا' مگر اگلے ماہ پھر وہی شکایتی بل...... بڑا وقت برباد کرتے ہیں۔ واشنگ مشین خراب ہے' اُسے مستری کی دکان پر پہنچانا ہے۔ بہو نے کپڑے درزی کو دینے ہیں' اُس کے ساتھ جانا ہے۔ غرض چھوٹے بڑے کئی کام ہوتے ہیں۔

''بیٹے کی کپڑے کی دکان ہے۔ دوپہر کو اُسے کھانا دینے جاتا ہوں۔ دکان پر بھی کئی کام میرے منتظر ہوتے ہیں۔ وہاں سے واپسی پر گھر کے لیے سبزی خریدتا ہوں۔ پھر بہو کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ غرض رات کو گھر کے سبھی افراد سو جاتے ہیں مگر میرے کام ختم نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود گھر والے یہی کہتے ہیں ''بابا ویلا اے!'' کہیں فوتیدگی ہو گئی یا دور پرے کے رشتے دار کی شادی ہے جہاں جانے میں بیٹے اور بہوئیں دلچسپی نہیں رکھتے' تو کہتے ہیں' وہاں بابے کو بھیج دو کیوں کہ ''بابا ویلا اے۔''

قدرے توقف کے بعد وہ بھرائی آواز میں بولے ''ایک رات میرے ڈیڑھ سالہ پوتے کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی اور وہ زاروقطار رونے لگا۔ بہو اُسے گود میں لے کر چپ کرانے لگی تو میرے بیٹے نے کہا' اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ سارا دن دکان پر کام کر کے تھک جاتا ہوں۔ اب تھوڑی دیر آرام بھی نہیں کرنے دے گا۔ بہو نے کہا' بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں' اِسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔ بیٹے نے کہا' بابے سے کہو وہ اِسے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ سارا دن ویلا ہی تو ہوتا ہے۔ بہو بچے کو میرے پاس لے آئی۔

میں بہو کے افسردہ چہرے اور پوتے کا رونا سن کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بچے کو لیے کلینک پہنچا۔ اپنی باری کا انتظار کرتے اور بچے کو چیک کرانے کے بعد دوائی لیتے رات کے بارہ بج گئے۔ گھر پہنچا' تو سب سو رہے تھے' صرف بچے کی ماں جاگ رہی تھی۔ میں نے پوتے کو اُس کے حوالے کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ صبح میری آنکھ نہ کھلی اور میں وقت پر دودھ اور ناشتے کا سامان نہ لا سکا' تو بیٹوں نے شور مچا دیا کہ بابا ابھی تک سویا ہوا ہے' ناشتا لینے نہیں گیا۔ سارا دن ویلا ہوتا اور ساری رات سوتا رہتا ہے۔ کوئی کام ہی نہیں بابے کو! صبح ناشتے کا سامان ہی تو لانا ہوتا ہے بس۔ انھوں نے مجھے خوب جلی کٹی سنائیں۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا اور بغیر منہ دھوئے ناشتا لینے چلا گیا۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولے "بس بیٹا" یہی کچھ کام کرتا ہوں پھر بھی "بابا دیلا اے"...... یہ فقرہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

میں افسوس اور حیرت کے ملے جلے انداز میں بس مسکرا کر رہ گیا۔ اب ان سے کیا کہتا' ان کے دکھوں پر مرہم کس طرح رکھتا؟ البتہ میں سوچنے لگا، ہمارے معاشرے میں ایسے کتنے ہی بابے روزمرہ کام کرنے کے باوجود اپنی اولاد کی نظر میں ویلے ہی ہوں گے۔ مجھے پھر اپنے گاؤں کا اسی سالہ بابا رحیما یاد آ گیا۔ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا کہ چارپائی پہ بیٹھا آرام سے اللہ اللہ کرے' مگر اس کے نصیب میں آرام و سکون کہاں؟ اولاد اگر نیک اور والدین کی خدمت گزار ہو تو ہر انسان کا بڑھاپا اچھا کٹتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اولاد ناخلف نکل آئے تو انسان جیتے جی زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

بابے رحیے کی پندرہ بیس ایکڑ زمین تھی' اچھا بھلا گھر' چار بیٹے اور دو بیٹیاں۔ عالم شباب میں اچھا وقت گزرا۔ بچوں کی اچھی پرورش کی۔ بیٹے بیٹیوں کو پڑھایا لکھایا۔ جب سبھی اپنے پیروں پہ کھڑے ہو گئے تو باری باری سب کی شادیاں کر دیں۔ زمین اور جائداد دے دلا کے اپنے لیے ایک کمرا بنایا اور وہاں رہنے لگا۔ شریکِ حیات مائی نصیبو بچوں کی شادیاں کرتے ہی وفات پا گئی تھی۔

شروع میں تو سارے بیٹے وقتاً فوقتاً باپ کے پاس جاتے اور رقم و روزمرہ استعمال کی اشیا دے آتے' مگر آہستہ آہستہ اپنے کام دھندوں میں الجھ کر باپ کی محبت ماند پڑنے لگی۔ کبھی کبھار بھولے سے کوئی ایک بیٹا باپ کی خبر گیری کر لیتا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ بابے کو روٹی بھی ہمسائیوں سے مانگنا پڑی۔ کچھ عرصہ آس پاس کے گھروں میں کھانا کھا کے گزارا کیا۔ لیکن جب بابا رحیے کو محسوس ہوا کہ پڑوسی کھانا خیرات اور صدقہ سمجھ کر دیتے ہیں تو وہ اینٹوں والے بھٹے پر مزدوری کرنے لگا۔ بھٹے کا مالک قدرے شریف آدمی تھا۔ اُس نے بابے کو آسان کام دیا کہ گندھی مٹی میں پانی ڈال دیا کرے۔ اس کے عوض اسے سو روپے دیہاڑی مل جاتی۔ یوں کھانے پینے کا خرچ پورا ہونے لگا۔

بابے کی ہمت و حوصلہ دیکھ کر گاؤں کے سبھی لوگ حیران ہوتے اور اس کے بیٹوں پر لعن طعن کرتے۔ مگر اُن بے شرموں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ حیرت ہے کہ جن بچوں کو انسان پال پوس کر بڑے ارمانوں سے بڑا کرے' وہ اولاد جب جوان ہو جائے تو اپنے بوڑھے والدین کی خبر تک نہیں لیتی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ ایک باپ اپنے گیارہ بچوں کا پیٹ پال لیتا ہے مگر اتنے بچے مل کر ایک باپ کو نہیں کھلا سکتے۔

> "لعنت ہو اس شخص پر جس نے اپنے والدین کو بوڑھے ہوتے پایا اور اُن کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کر سکا۔"

مغربی دنیا ترقی و خوشحالی اور انسانی حقوق کے حوالے سے ہم سے آگے ہے لیکن وہاں بھی والدین کے ساتھ بہتر سلوک نہیں ہوتا۔ اولاد "اولڈ ہومز" بنا کے اپنے والدین کو وہاں چھوڑ دیتی ہے جہاں وہ کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔ دین اسلام میں والدین کے حقوق کو نہایت اہمیت دی گئی ہے۔ اولاد کو حکم دیا گیا ہے "خبردار! جب تمہارے والدین بوڑھے ہو جائیں تو انھیں اُف تک نہ کہو۔" ایک اور حدیث میں ہے "لعنت ہو اس شخص پر جس نے اپنے والدین کو بوڑھے ہوتے پایا اور اُن کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کر سکا۔"

افسوس' مادہ پرستی کے اس دور میں نہ تو کسی کو اپنے بوڑھے ہونے کا خیال ہے اور نہ آخرت کی فکر۔ ہمارے بہت سے نوجوان والدین کے ساتھ یوں بدتمیزی و غرور

سے پیش آتے ہیں جیسے انھوں نے سدا جوان رہنا ہے اور اُن پہ کبھی بڑھاپا نہیں آ سکتا۔ بچہ جب چھوٹا ہو اور زمین پہ کھیلے تو جو بھی اچھی یا بری چیز ہاتھ لگے منہ میں ڈال لیتا ہے۔ ایسے موقع پر ماں باپ ہی اسے بتاتے ہیں کہ بیٹا یہ گندی چیز ہے' اسے منہ میں نہیں ڈالتے۔ مگر جب یہی بچے بڑے ہو جائیں تو والدین کے سامنے فلک شگاف آوازوں میں باتیں کرتے ہیں کہ تمہیں کسی چیز کا پتا ہی نہیں بڈھے کہیں کے! اُن کا تکبر دیکھ کر لگتا ہے' جیسے پیدائشی طور پر سمجھدار اور عاقل ہوں۔ بچپن میں ہر اچھی بری شے منہ میں ڈال لینے والا جب جوانی کی انگڑائی لے تو والدین کو ہی تمیز سکھانے اور ان پہ حکم چلانے لگتا ہے۔

چند روز پہلے کی بات ہے' مجھے پتا چلا کہ میرے دوست کے والد سخت بیمار ہیں۔ سوچا اُن کی تیمارداری کر لی جائے۔ دوست کو فون کیا تو کہنے لگا ''میں گھر سے باہر ہوں۔ آپ جا کر خبر گیری کر آئیے۔''

میں جا کر اُس کے والد سے ملا۔ وہ انتہائی ضعیف اور لاچار ہو چکے تھے۔ سہارے کے باوجود بمشکل بستر سے اُٹھ پائے۔ میں اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد دو چار باتیں کیں اور دوست کا یہ پیغام بھی سنایا کہ وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر گیا ہوا ہے۔ یہ سن کر اُس کے والد رونے لگے۔ میں پریشان ہوا اور پوچھا ''آپ کیوں رو رہے ہیں؟''

انھوں نے بتایا ''میرا بیٹا پچھلے ایک ہفتے سے گھر نہیں آ رہا۔ کہتا ہے کہ آپ کی وجہ سے گھر میں بدبو پھیل گئی ہے۔ آپ بار بار کھانستے اور بلغم پھینکتے ہیں۔ ساری رات آپ کی خرخراہٹ مجھے سونے نہیں دیتی۔ ساری رات کراہتے رہتے ہیں، چپ ہی نہیں کرتے۔ اس لیے میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔''

یہ کہہ کر اُس کے والد رندھی ہوئی آواز میں بولے ''بیٹا! دعا کرو اللہ پاک میرا پردہ کر دے تاکہ میرا بیٹا گھر آ جائے۔ پتا نہیں وہ کہاں مارا مارا پھرتا اور کس کے ہاں سوتا ہو گا؟ اُسے کھانا بھی ملتا ہے یا نہیں۔ بس دعا کرو، میں جلد مر جاؤں تاکہ میرا بیٹا چین کی نیند سو سکے۔ میں کتنا بدنصیب باپ ہوں کہ میری وجہ سے میرا بیٹا گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر مجبور ہوں کہ بیماری بھی مجھے نہیں چھوڑ رہی۔ میرا اللہ بھی مجھے ایسی زندگی سے نجات نہیں دے رہا۔''

میں وہاں سے افسردہ حال اُٹھ کر چلا آیا اور دیر تک اپنے دوست کے بارے سوچتا رہا کہ وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کیوں ہو رہا ہے؟

وہ والدین بہت خوش نصیب ہیں جن کی اولاد بڑھاپے میں اُن کا سہارا بنے اور اُن کا خیال رکھے۔ ورنہ بچارے کئی والدین بڑھاپے میں روٹی کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ مادہ پرستی کے باعث ہمارے معاشرے میں بھی بے حسی رواج پا چکی۔ حالانکہ ہماری اخلاقی اقدار تو ہمیں بڑے بوڑھوں کی عزت کرنا اور اُن کا خیال رکھنا سکھاتی ہیں۔ مگر دن بدن حالات ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔

اب بزرگ گھر میں اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ کہیں اُن کے بولنے سے بیٹا یا بہو ناراض نہ ہو جائے۔ اپنی بچی کھچی عزت محفوظ رکھنے اور کسی پریشانی سے بچنے کے لیے والدین بچوں کے خودمختار ہونے پر ڈر کے مارے زبان ہی نہیں کھولتے مبادا اُن کی بے عزتی ہو جائے۔ آج کل کی نافرمان اولاد یاد رکھے' کہ وہ وقت دور نہیں جب اُن کی بھی کمر دہری' بینائی کمزور اور ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں گی۔ تب انھیں لاٹھی کے سہارے چلنا پڑے گا۔ اس وقت انھیں اپنے بچوں سے بہتر سلوک کی توقع نہیں رکھنی چاہیے اور وہ اپنا ٹھکانہ جہنم ہی میں سمجھیں۔ ◆◆◆

اپنی ہی محفوظ چھت کے نیچے

تیس سال سرکاری ملازمت کرنے والے ایک افسر کی دلچسپ و سنسنی خیز واقعات سے پُرکھٹ میٹھی آپ بیتی

گوہر اعظمی

یہ مئی ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ جام صادق علی کا شمار سندھ کی پی پی پی حکومت کے دبنگ وزرا میں ہوتا تھا۔ ایک بڑا بلڈر ایم اے جناح روڈ پر ماسٹر پلان کے خلاف نقشہ منظور کرانا چاہتا تھا۔ اس نے جام صاحب سے مدد چاہی۔ انھوں نے ایڈمنسٹر بلدیہ عظمیٰ' جناب مجید کو فون کر کے کہا کہ یہ نقشہ پاس کروا دو۔ مجید صاحب نے معذرت کی کہ نقشہ پاس کرنے والا افسر گو ان کا ماتحت ہے' لیکن وہ کبھی غلط کام نہیں کرتا۔ لہٰذا زیادہ مناسب ہوگا کہ خود اس سے بات کریں۔

مجید صاحب نے پھر مجھے فون کیا' ساری صورت حال بتائی اور کہا کہ تم ہرگز ان سے یہ مت کہنا کہ تمہاری

مجھ سے بات ہو چکی۔ کچھ دیر بعد جام صاحب کے پی اے کا فون آیا کہ منسٹر صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ فوراً جام صاحب کی آواز سنائی دی "میں جام صادق علی بول رہا ہوں۔"

میں نے کہا، سائیں السلام علیکم۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا، میری خیر و عافیت دریافت کرتے رہے۔ پھر میری ترقی کی بات کی۔ میں نے بھی جواباً کہا کہ ان کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی فکر نہیں۔ ان شاءاللہ میری ترقی جلد ہو جائے گی۔ جب پانچ منٹ تک اِدھر اُدھر کی بات کر لی تو مطلب پر آئے، کہنے لگے "ایم اے جناح روڈ پر فلاں جگہ کا نقشہ پاس کرنا ہے، کام ہو جائے گا؟

میں نے کہا "سر! بالکل ہو جائے گا۔ لیکن میری ایک گزارش ہے۔ اگر وہ پوری ہو جائے تو....."

بولے "بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "سر! مجھے آپ لوگوں نے اس لیے یہاں بٹھایا ہے کہ میں عوام کی خدمت قوانین کے مطابق کرتا رہوں۔ یہ قوانین آپ ارکان اسمبلی بناتے ہیں۔ اگر میں ان کی خلاف ورزی کرنے لگا، تو آپ اگلے دن میری چھٹی کر دیں گے۔ ایسا ہی قانونی نکتہ نقشہ پاس کرنے میں بھی حائل ہے۔ آپ کے منظور کردہ ماسٹر پلان کے تحت اس نئی عمارت کو ایم اے جناح روڈ پر ۲۰ فٹ پیچھے ہٹ کر بننا چاہیے۔ آپ جس نقشے کی بات کر رہے ہیں، اس میں قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ آپ سے درخواست ہے، اسمبلی سے ۲۰ فٹ کٹ لائن والی شرط ختم کرا دیں، پھر نقشہ اسی دن پاس کرنے کی ذمے داری لے لوں گا۔"

جام صاحب زور سے ہنسے، کہنے لگے "مجید صحیح کہہ رہا ہے۔ میں پتھر سے سر پھوڑ رہا ہوں، ارے جب میں اسمبلی سے قانون پاس کرا دوں گا تو تم سے سفارش کی کیا ضرورت؟"

میں نے کہا، سر! میں آپ لوگوں کا بنایا قانون توڑ کر آپ کی حکم عدولی نہیں کرنا چاہتا۔ میری معذرت قبول فرمائیں۔

جام صاحب نے فون رکھ دیا۔ اس واقعے سے چند ماہ پہلے بلدیہ عظمیٰ کے ایک افسر نے جام صاحب کے کسی حکم کو بجالانے میں تساہل سے کام لیا تھا۔ اسے فوری طور پر معطل کر کے گھر بھیج دیا گیا۔ جس ملک میں جنگل کا قانون ہو وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے! لیکن میرے معاملے میں جام صاحب خاموش رہے، بلکہ انھوں نے بڑے کھلے دل کا مظاہرہ کیا۔ کئی سال بعد وہ سندھ کے وزیراعلیٰ بنے، تو ۱۹۹۲ء میں ان کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی جام گوٹھ میں ہونا قرار پائی۔ میں ان معدودے چند سرکاری افسروں میں شامل تھا جنھیں شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔

جام صاحب کا بیٹی کی شادی میں مجھے بلانا میرے لیے ایک معمہ ہے۔ بہرحال کام نہ کرنے کے باوجود انھوں نے میرا نام اپنے ذہن میں محفوظ رکھا۔

"جل تو جلال تو آئی بلا ٹال تو"

۴؍جولائی ۱۹۷۷ء کی شب جنرل ضیاء الحق نے جمہوری حکومت پر شب خون مار کر ملک پر تیسرے مارشل لا کا نفاذ کر دیا۔ کلیدی عہدوں پر فوجیوں کی تقرری شروع ہو گئی۔ سویلین حکومت کے کاموں کی چھان بین کے لیے انسپکشن ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ ایسی ہی ایک ٹیم حکومت سندھ کے "کارناموں" کی چھان بین کرنے

سندھ اسمبلی میں تھی۔ اس کے سربراہ ایک بریگیڈیئر تھے۔

ان کے دفتر والوں نے ماہ نومبر میں ایڈمنسٹریٹر مجید صاحب کوفون کر کے زیرتعمیر بھٹوٹرسٹ بلڈنگ (بیومنٹ روڈ) اور حیات ریجنسی ہوٹل کی فائلیں منگوا لیں۔ ان دونوں تعمیرات میں درپردہ بھٹو صاحب کا نام آتا تھا۔ یہ بھی اطلاع تھی کہ عمارتیں غیر قانونی طور پر بن رہی ہیں۔ ان عمارات کے نقشے آرکیٹکٹ کنٹرول بلدیہ نے پاس کیے تھے۔ مجید صاحب نے مجھے بلا کر کہا' چونکہ یہ نقشے سابقہ آرکیٹکٹ کنٹرول نے پاس کیے تھے جو اب موجود نہیں۔ لہٰذا یہ فائلیں لے کر تم خود جاؤ۔ ان کا مطالعہ کر لینا تا کہ ٹیم کو کوئی اعتراض ہو تو صحیح جواب دے کر مطمئن کر سکو۔

مجھے یہ فائلیں مقررہ تاریخ اور وقت پر ایک میجر کے حوالے کرنی تھیں۔ میں جب اسمبلی بلڈنگ میں میجر کے کمرے میں پہنچا اور آمد کی اطلاع ایک چٹ کے ذریعے دی تو انھوں نے فوراً اندر بلا لیا۔ مجھے دیکھتے ہی تمسخرانہ انداز میں فرمانے لگے "آہا! کے ایم سی سے آئے ہیں۔ کے ایم سی والوں کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں رہتا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں آپ نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔"

یہ طنزیہ باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے غصے میں کہا "میجر صاحب! بس اب کچھ مت کہیے گا۔ آپ نے گھوڑے اور گدھے کو ایک ساتھ ہانکنا شروع کر دیا۔ آپ کے خیال میں سارے سویلین بُرے ہوتے ہیں۔ حالانکہ جس دباؤ میں سویلین کام کرتے ہیں' آپ لوگ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اچھے برے آدمی ہر جگہ ہوتے ہیں۔ خراب لوگ بے شک پیسے لے کر کام کرتے ہیں۔ لیکن بعض دفعہ مجبوراً بھی انہیں کام کرنا پڑتا ہے جو بے شک وہ اپنی ذاتی کمزوری کی وجہ سے کرتے ہیں۔

سابق وزیر اعلیٰ سندھ' جام صادق علی

آپ کو شاید پتا نہیں کہ اب لوگ ملٹری والوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ یہ خبر زیرگردش ہے کہ فوجی افسر بھی سویلین کی طرح زیادہ پیسے لے کر کام نمٹانے لگے ہیں۔"

میری باتیں' میجر ہکا بکا ہو کر چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا "قریشی صاحب تشریف رکھیں' آپ ناحق ناراض ہو گئے۔ آپ کی دل آزاری کرنا میرا ہرگز مقصد نہیں تھا۔ پھر اس نے فائلیں مجھ سے لیں۔ میں نے اُن کی رسید لی۔ وہ فائلوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پہلے سے تیار شدہ سوالات کے جوابات مجھ سے پوچھ کر نوٹ کیے۔ اس دوران فوجی کروفر اور اہتمام سے مجھے چائے پلائی۔ پھر دروازے تک مجھے رخصت کرنے آیا۔ بعدازاں ان فائلوں کے سلسلے میں انسپکشن ٹیم والوں نے مجھے کبھی نہیں بلایا۔ حیات ریجنسی کا

کام مارشل لا لگتے ہی روک دیا گیا۔ مختلف قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے اس کا ڈھانچا اسی حالت میں کھڑا ہے۔

قریشی صاحب فائل پر وزن رکھ دیں

سول لائنز ایریا میں انگریزوں کے زمانے کا تعمیر کردہ دو ہزار گز رقبے پہ بنا ایک پرانا بنگلہ واقع تھا۔ وہ شہر کے ایک متمول شخص کو متروکہ املاک کے عوض الاٹ ہو گیا۔ اس میں ایک بوڑھا پارسی کرایہ دار نوکروں کے ساتھ رہتا تھا۔ بنگلے کی دونوں چھتیں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے مخدوش حالت میں تھیں۔ بنگلے کے ساتھ ہی نوکروں کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے۔ ان کی چھتیں گرنے کے بعد دیواروں پر ٹین کی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ اب ان کے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس مالدار شخص کی کوشش تھی کہ یہ مکان کسی طرح مکینوں سے خالی کرا لیا جائے۔

اس نے اپریل ۱۹۷۸ء میں بلڈنگ کنٹرول ڈیپارٹمنٹ کو درخواست دی کہ وہ بنگلہ اور سرونٹ کوارٹرز کو خطرناک قرار دے کر گرا دے کہ مکینوں کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ نچلے عملے نے الاٹی سے مل کر فائل اس کے حق میں بنائی اور مجھے بھجوا دی۔ میں نے متعلقہ عملہ اور الاٹی کے کارندے کے ساتھ جا کر جگہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ملازموں کے کمرے کو کوئی خطرہ نہیں۔ نیز بنگلے کی چھتیں مرمت سے درست ہو جائیں گی۔ لہٰذا میں نے بھاری مرمت کے آرڈر پاس کر دیے۔

یہ بات مالدار مالک کے حق میں نہیں تھی۔ اس نے ایڈمنسٹریٹر بلدیہ کے پاس میرے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ اب فائل دوبارہ میرے پاس آئی۔ اگلے دن صبح گھر کی گھنٹی بجی۔ دیکھا کہ الاٹی کا کارندہ دروازے پر کھڑا ہے۔ میں نے اسے اندر آنے کو کہا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا ”صاحب! میں اپنے اسی کیس کے سلسلے میں آیا ہوں۔ فائل دوبارہ آپ کے پاس ہے۔ سیٹھ صاحب نے بھیجا ہے، کچھ مہربانی کریں۔“

میں نے کہا ”میری طرف سے سیٹھ صاحب کو مشورہ دو کہ مکینوں کو کہیں متبادل جگہ دلا دیں۔ کرایہ دار اور اس کے دونوں نوکر جانے کو تیار ہیں۔ یوں گھر خود ہی خالی ہو جائے گا۔“

اس نے کہا ”صاحب! وہ لوگ بہت پیسے مانگ رہے ہیں جس پر سیٹھ راضی نہیں۔ اب آپ اس فائل پر وزن رکھ دیں تو میرا کام ہو جائے گا۔“

میں اس کی بات سمجھ نہیں پایا۔ جب یہی بات اس نے دوبارہ کہی تو وہ کہنے لگا ”صاحب دس بیس ہزار روپے کا وزن جو ہم آپ کو دیں گے۔“

اب میں سمجھا کہ یہ مجھے رشوت کی پیش کش کر رہا ہے۔ میں غصے سے کھڑا ہو گیا اور اس سے کہا ”آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ آپ کو بزرگ سمجھ کر اندر بلا لیا۔ آپ نے یہ پیش کش کرنے کی جرأت کیسے کی؟ براہ کرم فوراً یہاں سے تشریف لے جائیں اور آئندہ آنے کی جرأت نہ کریں۔“ میں نے انھیں گھر سے باہر کر کے دروازہ بند کر لیا۔ دفتر جا کر اپنے سابقہ فیصلہ کو حتمی قرار دیا اور فائل ایڈمنسٹریٹر کو واپس کر دی۔ یوں سیٹھ صاحب فائل پر وزن نہ رکھوا سکے۔

چچا مولوی پھڈا

ایک صاحب کو میری زندگی میں پہلے چچا بننے کا شرف حاصل ہوا۔ موصوف چار نمبر ناظم آباد میں والد کے گھر کے قریب ہی رہتے اور مولوی پھڈا کے نام سے مشہور تھے۔ ایک روز چھٹی کے دن صبح صبح گھر آئے اور انھوں نے اپنا تعارف کرایا "میں تمہارا چچا ہوں۔ تمہارے والد ناظم آباد میں میرے پڑوسی تھے۔ میں ان کی ناگہانی موت پر تعزیت کرنے آیا ہوں۔" انھوں نے پھر دعائے مغفرت کر کے مجھے صبر جمیل کی تلقین کی۔ میں نے انھیں چائے پلائی اور وہ دعائیں دیتے رخصت ہو گئے۔

دو ہفتوں بعد چچا مٹھائی کے دو ڈبے لیے وارد ہوئے۔ بقول ان کے بھتیجے کی محبت کھینچ لائی حالانکہ والد کے مکان میں ان کا چھوٹا بھتیجا رہ رہا تھا' لیکن اس کے پاس نہ تعزیت کرنے گئے اور نہ محبت جتائی۔ اب مٹھائی لانے کا یہ جواز پیش کیا "ایک سیٹھ دوست عمرہ کر کے آئے ہیں۔ انھوں نے مٹھائی کے دس ڈبے عمرے کی خوشی میں بھیجے تھے۔ میں نے سوچا کہ اپنے بھتیجے کو بھی اس خوشی میں شریک کر لوں۔"

مجھے اس بیان پر حیرت تو ہوئی لیکن اصرار کی وجہ سے مٹھائی کے ڈبے واپس نہ کر سکا۔ اب میں نے بھتیجے جمال کو فون کر کے موصوف کا نام اور جغرافیہ بتایا۔ وہ کہنے لگا' یہ بہت تیز آدمی ہیں' سارا محلہ اُن سے نالاں ہے۔ ڈاڑھی ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں۔ پھر اس نے کہا "چچا جان! آپ ان سے محتاط رہیے گا۔"

اگلے ہفتے چچا پھر آ گئے۔ اس دفعہ ان کے ساتھ شیروانی اور جناح کیپ میں ملبوس ایک بزرگ بھی تھے۔ ان کا تعارف چچا نے کرایا کہ یہ سیٹھ کپڑوں کی فلاں ملوں کے مالک ہیں۔ ان کا نام میں نے سن رکھا تھا لیکن ملنے یا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ سیٹھ صاحب نے فوراً سر سے ٹوپی اتاری اور میرے پیروں میں رکھنے لگے۔ میں نے بیچ میں ہی انھیں پکڑ لیا۔ گھبرا کر کہا کہ آپ کیوں مجھے شرمندہ کر رہے ہیں؟ آپ میرے بزرگ ہیں' بتائیں بات کیا ہے؟ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

کہنے لگے' بیٹے! میری عزت تمہارے ہاتھ میں

زیر تعمیر حیات ایجنسی ہوٹل

ہے۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا' میں صدر میں اپنے شاپنگ سنٹر میں رد و بدل کر رہا ہوں۔ مگر آپ کے محکمہ نے نقشے کے بغیر کام کرنے پر مجھے نوٹس دے ڈالا۔ اس وجہ سے میرا کام رک گیا۔ اب مارکیٹ میں میری بے عزتی ہو رہی ہے کہ اتنے بڑے سیٹھ کا کام رک چکا۔

میں نے کہا "آپ بائی لاز کے مطابق دکانوں کا نقشہ داخل کرا دیں۔ منظور کرانے کی ذمہ داری میری ہے' پھر شوق سے آپ اپنا پروجیکٹ مکمل کیجیے۔ میں نے

دونوں کو چائے پلا کر رخصت کر دیا۔ اگلے دن دفتر میں جا کر متعلقہ عملہ سے کہا کہ ایسی تمام بلڈنگیں جن میں بائی لاز کی خلاف ورزی کے کام ہو رہے ہیں اور جو منظور شدہ نقشے کے برخلاف بن رہی ہیں، مجھے ان کی رپورٹ ایک ہفتے میں پیش کریں۔ جب بلڈرز کو نوٹس ملے تو انھوں نے سیٹھ صاحب پر لعن طعن کی کہ ان کی وجہ سے بلڈنگ کنٹرول کا عملہ زیادہ فعال ہو گیا۔ اب بھلائی اسی میں ہے کہ ایمان دار آرکیٹکٹ کنٹرولر کو یہاں سے ہٹوایا جائے۔

انھوں نے پھر سیٹھ کو تیار کیا کہ وہ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کو میرے خلاف بھڑکا کے میرا فوری تبادلہ کرا دیں۔ سیٹھ نے ایک لیٹر ہیڈ چھپوایا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ پھر دو صفحوں پر مشتمل عرضداشت میرے خلاف صدر پاکستان کو بھیج دی۔ صدر صاحب نے انکوائری کا حکم دیا۔ یہ حکم چیئرمین گورنر انسپکشن ٹیم بریگیڈیئر سجاد حسین کے پاس پہنچا‘ جو اتفاق سے میرے دوست ذاکر علی خان کے دوستوں میں تھے۔

بریگیڈیئر صاحب نے ذاکر صاحب سے میرے متعلق معلومات حاصل کیں۔ پھر مجھے بلوا لیا۔ وہ سندھ سیکرٹریٹ میں بیٹھتے تھے۔ یہ اس ٹیم سے علیحدہ تھی جو اسمبلی بلڈنگ میں بیٹھتی۔ بریگیڈیئر صاحب کو میں نے سارا کیس سمجھایا اور ان سے کہا‘ اس ڈپارٹمنٹ کا میرے پاس اضافی چارج ہے۔ اگر آپ مجھے وہاں سے ہٹوا دیں تو میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔ میں ایڈمنسٹریٹر بلدیہ سے کئی بار گزارش کر چکا لیکن وہ مجھے ہٹانے پر راضی نہیں ہوتے۔

بریگیڈیئر صاحب نے فائل مجھ سے لی اور کہا کہ آپ دو دن بعد واپس لے جائیں۔ میں اس دوران تحقیقات کرا کے فیصلے سے صدر صاحب کو آگاہ کر دوں گا۔ میں دو دن بعد بریگیڈیئر صاحب کے پاس گیا۔ انھوں نے فائل واپس دی اور کہا کہ آپ اپنا کام ایمانداری سے کرتے رہیے۔ صدر صاحب کو میں نے جواب بھجوا دیا ہے۔ اب میرا جب گزر صدر میں زیب النسا اسٹریٹ سے ہوتا تو دیکھتا کہ سیٹھ کا کام بند پڑا ہے۔

جنوری ۱۹۷۹ء میں ایک روز دیکھا تو وہی ”یاجوج ماجوج“ پھر چلے آ رہے ہیں۔ طوعاً کرہاً انھیں اندر بلا کر بٹھایا۔ چچا دہائی دے رہے تھے کہ تم نے بریگیڈیئر صاحب کو سیٹھ صاحب کے پیچھے کیوں لگا دیا؟ روزانہ فوجی جوان بلڈنگ پر آ کر ان سے کہتے ہیں‘ بریگیڈیئر صاحب نے یاد کیا ہے۔ پھر بریگیڈیئر صاحب انھیں دفتر کے باہر بٹھا کر کہتے ہیں کہ کل آنا۔ گزشتہ ایک ہفتہ میں وہ چار چکر لگا چکے۔ ”بیٹا! تم اُن سے سیٹھ صاحب کی جان چھڑوا دو‘ انھیں اب مارے خوف کے رات بھر نیند نہیں آتی۔“

میں نے کہا‘ ایک شرط پر ان کی جان چھوٹ سکتی ہے۔ جس لیٹر ہیڈ پر پہلے انھوں نے صدر پاکستان کو میری شکایت لکھ کر بھیجی تھی‘ اسی پر لکھ کر اپنی غلطی تسلیم کریں اور لکھیں کہ میں اپنی درخواست واپس لیتا ہوں۔ سیٹھ ذہنی طور پر بہت پریشان تھے‘ وہ اس بات پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے اگلی پیشی پر یہ درخواست بریگیڈیئر صاحب کو بھجوا دی۔ بریگیڈیئر صاحب نے انھیں اندر بلا کر اچھی طرح سرزنش کی اور معاملہ داخل دفتر ہو گیا۔

اس کے بعد جب تک میں بلدیہ میں رہا‘ اپنے چچا

اور سیٹھ کی شکل نہیں دیکھی۔ چچا ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ویسے بھی اسی سال ماہ فروری میں کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کے ڈی اے کے پاس چلی گئی اور بلدیہ عظمیٰ سے اس کا تعلق ختم ہوا۔ چند ماہ تو سیٹھ کا کام بند رہا۔ پھر بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کے زیر سایہ ان کی مرضی کے مطابق بائی لاز کی خلاف ورزی میں چھوٹی چھوٹی دکانیں بن گئیں اور فوراً ہی ان میں کاروبار شروع ہوگیا۔ یہ غیر قانونی کام بریگیڈیئر سجاد کے جانے کے بعد انجام پایا۔

بریف کیس کی گمشدگی اور واپسی

یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ ایک روز دفتر سے واپسی کے بعد میں گاڑی میں گھر آیا تو دیکھا' میرا بریف کیس گاڑی میں نہیں ہے۔ خیال آیا کہ شاید دفتر بھول آیا ہوں۔ یہ سیمونائٹ کا عمدہ بریف کیس مجھے ایک عزیز نے پانچ سال پہلے تحفتہً دیا تھا۔ دفتر گیا تو بریف کیس وہاں بھی نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی کہ اس میں میرے چند ضروری کاغذات تھے' جنھیں دوبارہ بنوانے کے لیے مجھے تگ و دو کرنی پڑتی۔

سب سے پہلے پولیس اسٹیشن جا کر اس کی چوری رگمشدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ انچارج نے مشورہ دیا کہ اگر چوری کی رپورٹ درج کرائی تو آپ کو زیادہ زحمت اٹھانی پڑے گی۔ اس لیے کہ جب بھی کسی چور اُچکے کو پولیس نے بریف کیس کے ساتھ پکڑا' تو شناخت کے لیے آپ کے پاس بھی فون جائے گا اور آپ ناحق پریشان ہوں گے۔ لہٰذا آپ رپورٹ میں لکھوائیں کہ راستے میں کہیں گر گیا ہے۔ اس صورت میں اگر کسی نے آپ کا بریف کیس تھانے جمع کروا دیا' تو شناخت کے لیے آپ کو ایک ہی بار آنا پڑے گا۔ ویسے اس بریف کیس کو بھول جائیں تو بہتر ہے۔ مجھے ایف آئی آر کی نقل سے مطلب تھا' وہ میں نے حاصل کر لی۔ یہ تو میں بھی سمجھتا تھا کہ اتنا اچھا بریف کیس مجھے کوئی کیوں واپس کرے گا۔

بریف کیس گم ہوئے دو سال ہو چکے۔ ایک روز ایک اجنبی ملاقاتی نے نائب قاصد کے ہاتھ اپنا کارڈ میرے پاس بھیجا۔ میں نے انھیں اندر بلایا تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں بالکل ویسا ہی بریف کیس ہے جو دو سال پہلے گم ہوا تھا۔ اسے میں بالکل بھول چکا تھا۔ اجنبی نے وہ بریف کیس میرے سامنے میز پر رکھا اور کہنے لگا ''قریشی صاحب! کیا آپ اس بریف کیس کو پہچانتے ہیں؟'' میں نے جواب دیا' جی ہاں! ایسا ہی ایک بریف کیس میں دو سال قبل گم کر چکا۔

وہ بولا' جی ہاں! یہ دو سال سے میرے پاس ہے۔ یہ مجھے بلدیہ عظمیٰ کراچی کی عمارت کے پیچھے سڑک پر پڑا ملا تھا۔ میں نے لوگوں کی نظریں بچاتے ہوئے یہ سوچ کر

اسے اٹھا لیا کہ استعمال میں لاؤں گا۔ چونکہ اس میں خفیہ نمبروں والا تالا نصب ہے' چناں چہ کوشش کے باوجود اسے نہ کھول سکا۔ پھر یہ سوچ کر گھر میں الماری کے اوپر رکھ دیا کہ تالا کھولنے والے سے جا کر کھلوا لوں گا۔ لیکن یہ کام آج کل پر ٹلتا رہا' لیکن اس کے کھلوانے کی نوبت نہیں آئی۔

اس دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے مجھے خوامخواہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک روز بیٹھ کر بہت سوچا کہ آخر مجھ سے ایسے کون سی غلطی ہوئی جس کا خمیازہ میں بھگت رہا ہوں؟ معاً مجھے الماری پر رکھے بریف کیس کا خیال آیا۔ اسے لیے میں ماہر تالا کھولنے والے کے پاس گیا۔ اس نے بریف کیس کے نمبر آگے پیچھے کر کے مجھے کھول دیا۔ اس میں کچھ کاغذات اور ملاقاتی کارڈ ملا جس سے مالک کا پتا چل گیا۔

میں اللہ رب العزت سے اپنی لغزش کی معافی مانگنے اور آپ کی امانت واپس کرنے آیا ہوں۔ آپ سے گزارش ہے میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے' اس کے لیے آپ صدق دل سے مجھے معاف کر دیں تاکہ اللہ تعالیٰ مجھے مزید پریشانیوں سے دور رکھے۔

میں نے اجنبی کا شکریہ ادا کیا۔ اسے دل سے معاف کرنے کی نوید سنائی اور یہ بھی کہا کہ یہ بریف کیس آپ کو پسند ہے تو میری طرف سے تحفہ سمجھ کر لے لیجیے۔ لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔ اتنی دیر میں ہم دونوں چائے ختم کر چکے تھے۔ میں نے اسے دروازہ کھول کر ہنسی خوشی رخصت کیا۔

اگر پاس کر دو تو کیا بات ہے

میں نے ۱۹۶۶ء میں بلدیہ عظمیٰ میں عامل انجینئر ڈیزائن (Executive Engineer Design) کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی تھی۔ اگلے سال ہی این ای ڈی انجینئرنگ کالج میں بی ای (سول) کے آخری سال کا بیرونی ممتحن (External Examiner) چن لیا گیا۔ میرے فرائض منصبی میں کورس کے مطابق پرچے کی تیاری اور ان کی جانچ پڑتال (Checking) شامل تھی۔ مجھے اپنے پرچے کے تھیوری اور پریکٹیکل' دونوں کا ممتحن مقرر کیا گیا۔ بعض دفعہ تو میں دو پرچوں کا بھی ممتحن ہوتا۔

ایک بار کسی امیدوار کی کاپی چیک کر رہا تھا کہ ایک سوال کا جواب دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ لڑکے نے جواب کی نقل جو اسے کسی طرح باہر سے دستیاب ہوئی تھی' اسی طرح کاپی میں پن کے ذریعہ نتھی کر دی۔ نیچے یہ نوٹ لکھ دیا ''سر! امتحان ہال کا نگراں بہت سخت ہے۔ سوال کا جواب لکھنے سے معذور ہوں۔ لہٰذا نقل کے اس کاغذ کو اصل سمجھ کر اس پر نمبر دیں اور مجھے پاس کر دیجیے۔ ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گا۔ پھر یہ شعر درج تھا۔

مقدر کی کنجی ترے ہاتھ ہے
اگر پاس کر دے تو کیا بات ہے

میں نے باقی سوالات چیک کیے' جوابات درست نہیں تھے۔ اصولی طور پر مجھے اس امیدوار کی کاپی کو چیک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایسی ویدہ دلیری پر اس کے خلاف سخت اقدام کی سفارش کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس کے مستقبل کا خیال کرتے ہوئے اسے صرف فیل کرنے پر ہی اکتفا کیا' اس امید کے ساتھ کہ شاید اگلے سال محنت کر کے وہ پرچے میں کامیاب ہو جائے۔

جئے بھٹو

پیپلز پارٹی کا ابتدائی دور حکومت چل رہا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو ملکی حالات میں تبدیلیاں لانے کے لیے آئے دن نئے نئے گل کھلا رہے تھے۔ ان کے ہونہار کزن، ممتاز علی بھٹو وزیرِاعلیٰ سندھ تھے۔ وہ بھی تعصب کی چادر اوڑھے صوبے میں منافرت کے بیج بونے میں لگے تھے۔ صوبے میں ہر سطح پر اپنی مرضی کے مطابق تبدیلی کے خواہاں تھے۔ انہی دنوں اردو سندھی تنازع بھی کھڑا کیا گیا۔ اس پر رئیس امروہوی نے جنگ اخبار میں اپنے مرثیہ میں یہ مصرع بھی لکھا۔

''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''

اس زمانے میں بلدیہ عظمیٰ کی ملازمت صرف کراچی کے شہریوں کے لیے مختص تھی۔ یہ قانون سندھ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس کے تحت ختم کر دیا گیا۔ نئی ملازمتوں کے لیے جو فارم بنے، ان میں امیدواروں سے یہ خانے بھی پُر کرائے گئے۔

آپ کہاں پیدا ہوئے؟...... آپ کے والد کہاں پیدا ہوئے؟...... آپ کے دادا کہاں پیدا ہوئے؟

ان ملازمتوں کے لیے ''فرزند سرزمین'' (Son of the Soil) کو امتیازی درجہ اسی زمانے میں ملا اور جس کا شکار میں خود بھی ہوا۔ سول ایوی ایشن میں ڈائریکٹر انجینئرنگ کی ضرورت تھی۔ تجربے اور تعلیم کے مطابق یہ عہدہ مجھے ملنا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ میں اور میرے باپ دادا کی پیدائش اس سرزمین پر نہیں ہوئی تھی لہٰذا پوسٹ خالی رکھی گئی۔ ملازمت کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہوتے ہوئے بھی میرا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔ آئین کے مطابق میرا پاکستانی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اندرونِ خانہ سے یہ اطلاع ملی کہ انھیں ''فرزندِ سرزمین'' کی ضرورت ہے اور میں اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
یہ حاکمِ وقت اک بلا ہے

۱۵ ستمبر کی بات ہے، صبح جب اپنے دفتر پہنچا تو مجھے تب کے وزیرِاعلیٰ سید عبداللہ شاہ کا ایک مراسلہ ملا۔ ان دنوں میں بحیثیت ڈائریکٹر جنرل ٹیکنیکل سروسز کام کر رہا تھا۔ مراسلے کے ذریعے مجھے حکومت سندھ سے رجوع کرنے کو کہا گیا۔ اس میں میرے فوری تبادلے کی کوئی وجہ درج نہیں تھی، نہ ہی اس ضمن میں حکومت سندھ کا کوئی اعلیٰ و بالا افسر اپنی زبان کھولنے کو تیار تھا۔ سیکرٹری بلدیات نے البتہ اتنی عنایت ضرور کی کہ میری قبل از ریٹائرمنٹ (جس کی درخواست میں نے پہلے سے دے رکھی تھی) مختصر مدت میں منظور کر دی۔

امریکی نائب صدر لیتیر سے ملاقات کرتے ہوئے

یوں میں پندرہ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو حکومت سندھ کی ملازمت کرنے کے تیس سال بعد خوش بختی سے ریٹائر ہو گیا۔ وزیرِاعلیٰ کی ناراضی کے لیے بس اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ یہ غلط کام انجام نہ دینے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اللہ

تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے حرام کھانے سے بچائے رکھا۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ مجھے اس نے ایک دلدل سے نکال کر سکون کی زندگی عطا کی۔

وزیراعلیٰ سے جب سیکرٹری بلدیات نے میری ایمانداری اور لیاقت کی تعریف کی اور یہ بتایا کہ میں سیدھا سادہ مسلمان آدمی ہوں تو انھوں نے جواب دیا ''ایسے افسر کا ہماری حکومت میں کیا کام ہے؟ اسے کسی مسجد کا مولوی لگا دو۔'' یوں مجھے ایک ماہ کے لیے افسر برائے کار خاص (Officer On Special Duty) لگا دیا گیا۔ چند ماہ بعد ہی وزیراعلیٰ کی حکومت جاتی رہی۔ وہ بچارے غیرملک بے کسی کے عالم میں دربدر مارے مارے پھرے اور بمشکل آخری وقت دفن ہونے کے لیے وطن واپس آسکے۔ اسی واقعہ سے متاثر ہوکر میں نے دو روز بعد ایک قطعہ کہا:

انجام سے بے خبر ہے اپنے
یہ حاکم وقت اِک بلا ہے
بس صبر سے کام لو کہ پھر تم
لکھا ہوا بھی کبھی ٹلا ہے

موصوف کے غیرضروری انتقامی فعل سے میرے لیے خیر کے کئی پہلو نکل آئے۔ ایک تو یہی کہ میں خوامخواہ مصروف آدمی بن بیٹھا تھا۔ سبکدوش ہوکر اس قابل ہوگیا کہ قدرت کی عطا کردہ بقایا زندگی کو احسن طریقے سے استعمال کرسکوں اور وہ بھی ذہنی خلفشار، دفتری اور حکومتی ذمہ داریوں سے مبرا ہوکر۔ زندگی کے ان لمحات اور اوقات میں میرے دل اور دماغ سے کتنا بوجھ اتر گیا، اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ میں ایک پرسکون آدمی بن گیا۔ یہ سب اللہ رب العزت اور نبی پاک ﷺ کی رحمتوں کا صلہ ہے۔ اسی وجہ سے میں حمد باری تعالیٰ اور نعت ہائے رسول پاک ﷺ وغیرہ بھی سے لکھنے کے قابل ہوا اور میرے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آگئی۔

جان ہے تو جہان ہے

مارچ ۲۰۰۵ء کی ایک اتوار رات کو بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک مجھے زور سے دروازے پر دھکے لگنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کا تالا ٹوٹنے کے بعد دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے ملگجی آنکھوں سے تین لمبے ڈھاٹا باندھے آدمیوں کو آتے دیکھا۔ ایک نے مجھے خاموش رہنے کو کہا، دوسرے نے گن سے میرے سامنے فائر کیا جس کا میں نے شعلہ دیکھا اور آواز بھی سنی۔ پھر ایک نے کمرے کے پردے اچھی طرح بند کیے اور کمرے میں بتی جلا کر روشنی کردی۔ پھر جو چادر میں نے اوڑھی ہوئی تھی، اس سے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ ایک آدمی میری کنپٹی کے پاس بندوق لیے کھڑا ہوگیا اور مجھے وقفے وقفے سے دھمکی دیتا رہا کہ بولنے کی صورت میں گولی چلا دے گا۔ دوسرا ایک بڑی سی چھری لے کر ڈرانے لگا۔ پھر ان کے تین اور ساتھی آگئے۔ وہ الگ الگ ہر الماری کی تلاشی لینے لگے۔ جب انھوں نے میرے کمرے سے اپنی مرضی کی اشیا اور پیسے جو الماریوں میں رکھے تھے اٹھا لیے تو مجھے ملحق کمرے میں چلنے کو کہا جہاں بیگم سو رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھلواتا، دو ڈاکو پہلے ہی دستک دے چکے تھے۔ انھوں نے یہ سمجھ کر شاید مجھے کوئی کام پڑ گیا ہے، گھبرا کر دروازہ کھولا تو سامنے دو اسلحہ بردار ڈھاٹا باندھے نظر آئے۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''اچھا تم لوگ آگئے؟''

ان کے پیچھے میں تینوں ڈاکوؤں کی معیت میں

باندھے ہاتھ لیے کھڑا تھا۔ اس وقت رات کے چار بجے رہے تھے۔ ایک ڈاکو چھرا لیے بیگم کے پاس اور دوسرا میرے سر پر گن تھامے کھڑا ہوگیا۔ باقی چار کمرے میں الماریوں کی تلاشی لیتے‘ جان سے مارنے کی دھمکی بھی دیتے رہے۔ بیگم سے انھوں نے زیورات مانگے جو کپڑے میں چھپا کر رکھے تھے۔ کچھ انھوں نے خود دیے باقی انھوں نے ڈھونڈ لیے۔ بیگم نے بڑی ہمت سے کام لیا‘ وہ مستقل دعائیں پڑھتی رہیں۔ جب وہ میرے چہرے کو چادر سے ڈھک دیتے تو کہتیں کہ اسے ہٹاؤ‘ ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ یہ چھے ڈاکو مجھے افغانی لگے کہ آپس میں پشتو سے ملتی جلتی فارسی میں بات چیت کر رہے تھے۔

بیگم نے جب انھیں اللہ رسول ﷺ کے حوالے سے کچھ سمجھانا چاہا‘ تو انھوں نے کہا کہ وہ یہ کام خوشی سے تھوڑی کرتے ہیں‘ ان کی بھی کچھ مجبوری ہے۔ بہرحال ہم نے یہ سوچ کر کہ ”جان ہے تو جہان ہے“ اپنی ہر قیمتی چیز بشمول گھڑی اور موبائل انھیں دے دیے۔ گھر میں دو عدد لیپ ٹاپ تھے۔ انھوں نے ایک کو گرا کر اس پر پیر رکھ دیا اور وہ ٹوٹ کر خراب ہوگیا۔ دوسرا انھوں نے لینا مناسب نہیں سمجھا۔

جب انھیں یقین ہوگیا کہ ہمارے پاس اب کچھ نہیں تو پھر دو ڈاکو تو نیچے ہی رکے رہے‘ چار اوپر ہمارے کرایہ داروں (میاں بیوی‘ دو چھوٹی بچیوں) کے پاس دروازہ توڑ کر پہنچے۔ ان کے پاس جو ملا‘ اسے لوٹ کر انھیں بھی نیچے لے آئے اور ہمارے ساتھ ہی کمرے میں بند کر کے رفو چکر ہوئے۔ دونوں چھوٹی بچیاں مارے خوف کے اپنے ماں باپ سے چمٹی ہوئی تھیں۔

ڈاکو گئے‘ تو علی (کرایہ دار) نے میرے بندھے ہاتھ کھولے اور ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جان محفوظ رہی‘ مال تو ویسے بھی آنی جانی چیز ہے۔ تب تک سورج نکل آیا تھا۔ دس منٹ بعد باہر نکل کر دیکھا تو شہریوں کے جان اور مال کی حفاظت کے لیے خیابان تنظیم اور نیلتھ اسٹریٹ کے کونے پر پولیس موبائل کھڑی نظر آئی۔ چونکہ ہمارے گھر ڈکیتی ان کی سرپرستی میں ہوئی تھی‘ لہٰذا میں نے دوستوں سے مشورے کے بعد تھانے میں رپورٹ درج کرانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

بشیر ریان

اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ دو ہفتوں بعد علی الصباح اسی حلیے‘ قد کاٹھ کے آٹھ افغانی ڈاکو‘ ڈیفنس فیز V میں ایک بنگلے کی دیوار پھلانگ رہے تھے کہ علاقے کی پولیس آ پہنچی۔ مقابلے میں سے پانچ مارے گئے اور تین جان کر بھاگ گئے۔ سچ ہے برے کام کا برا نتیجہ۔ اس واقعہ کا کچھ عرصہ میرے ذہن پر اثر رہا۔ اب بھی اگر دروازہ زور سے بند ہو تو اس کی آواز سے میں چونک جاتا ہوں۔

امریکی صدر کا پاکستانی دوست

۱۵ دسمبر ۱۹۹۱ء کو سہ پہر تین بجے امریکی قونصل

خان واقع عبداللہ ہارون روڈ ویزا لگنے کے بعد پاسپورٹ لینے پہنچا۔ دیکھا کہ قونصل خانہ میں بڑی چہل پہل ہے۔ معلوم ہوا کہ سابق امریکی صدر لنڈن بی جانسن کے پاکستانی دوست آنے والے ہیں۔ سارا عملہ اِن کے لیے چشم براہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد موصوف سیاہ شیروانی اور چوڑی دار سفید پاجامے میں ملبوس سر پر جناح کیپ پہنے آ موجود ہوئے۔ پورے عملے سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ میں تیس سال قبل انھیں بڑی بڑی سیاہ مونچھوں اور کرتا و لنگی میں ملبوس امریکی نائب صدر لنڈن بی جانسن کے ساتھ ان کی تصویریں اخبارات میں دیکھ چکا تھا۔ ان پر قدرت چھپر پھاڑ کر مہربان ہوئی تھی۔ یہ بھائی بشیر ساربان تھے۔

۱۹۶۱ء میں اپنی اونٹ گاڑی لیے ملیر کے قریب کہیں کھڑے تھے تاکہ دورے پر آئے امریکی نائب صدر کی گاڑی گزر جائے تو اپنا راستہ ناپیں۔ نائب صدر کی کار جب اونٹ گاڑی کے قریب پہنچی تو انھیں یہ سواری کچھ عجیب سی لگی۔ انھوں نے اپنا قافلہ رکوایا' گاڑی سے اتر کر بھائی بشیر کے پاس چل کر آئے اور ان سے ہاتھ ملایا۔ سیکیورٹی کا عملہ سخت پریشان ہوا' لیکن لنڈن جانسن نے ترجمہ نگار کے ساتھ بھائی بشیر سے بات چیت شروع کر دی اور ان کو اپنا دوست کہا۔ بھائی بشیر سر ہلاتے رہے۔

انھوں نے دوست کو امریکا آنے کی دعوت دی جس کی بھائی بشیر نے گردن ہلا کر ہامی بھر لی۔ نائب صدر کا قافلہ منزل کی سمت روانہ ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بات یہیں ختم ہو جاتی' لیکن جب جان کینیڈی قتل ہو گئے اور جانسن صدر امریکا بنے' تو انھوں نے بشیر ساربان کو امریکا بلوا لیا۔ وہ صدر سے ملنے وہائٹ ہاؤس گئے۔ تب مختلف دوسرے تحائف کے علاوہ انھیں ایک چھوٹا ٹرک بھی دیا گیا۔

خیال یہ تھا کہ صدر کا دوست اونٹ گاڑی چلانے کی مشقت سے بچ جائے اور اس کی آمدنی کا ذریعہ بہتر ہو سکے۔ یہی بشیر بھائی آج میری نظروں کے سامنے تھے۔ اپنے کام کے سلسلے میں یا کسی کی سفارش لیے آئے تھے۔ قونصل خانہ والوں نے پوری عزت و تکریم اور خلوص دل سے امریکی صدر کے دوست کا استقبال کیا۔ بشیر بھائی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں آمد کا مقصد بتاتے رہے جس میں تھینک یو (Thank You) کے الفاظ زیادہ سننے کو ملے۔

(گوہر اعظمی تیس سال تک بہ حیثیت انجینئر بلدیہ کراچی اور حکومت سندھ سے وابستہ رہے۔ آپ کی دلچسپ یادداشتوں پہ مشتمل پہلا مضمون شمارہ اگست میں شائع ہو چکا۔)

◆◆◆

آپ کو کس نام سے پکارا جائے؟

ایک مرتبہ گاندھی جی نے آپ سے پوچھا: ''آپ کو کس نام سے خطاب کیا جائے؟''

قائداعظم نے جواب دیا: ''میرے نام کے سلسلے میں میری ذاتی پسند کا آپ کو جو لحاظ ہے' اُس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن نام میں کیا دھرا ہے؟ گلاب کو آپ کسی نام سے بھی پکاریں' اُس کی خوشبو میں فرق نہیں آئے گا۔''

(ہیکٹر بولائیتھو)

مائی ہیر کا تاریخی مسکن

جھنگ ایک شہری بہو کی نظر میں

محبت کی چاشنی اور فراوانی جذبات رکھنے والا انوکھا خراج عقیدت

جویریہ شریف

نیا شہر، نئے رنگ، رسم و رواج اور مزے مزے کے انداز..... کراچی، لاہور، فیصل آباد اور ایبٹ آباد کے بعد جھنگ میں ایک نیا رنگ دیکھنے کو ملا۔ جی ہاں وہی جھنگ جو مائی ہیر کا مسکن ہے۔

پرانا سونا ہوتا ہے (Old is Gold) کی مثل سنی تو بہت تھی مگر دیکھی جھنگ آ کر! دنیا چاہے کتنی بھی ترقی کر لے مگر جھنگ وہی رہے گا۔ اسی طرح اردو بولیے یا انگریزی، میرے گھر کا ماحول اور رہن سہن وہی سالہا سال پرانا ہے۔ جو دادی، نانی نے سکھایا، وہی پوتی، نواسی نے اپنایا۔ گرائنڈر.....! نہ بھئی نا، دورہ (کونڈی، ڈنڈا) استعمال ہونا چاہیے۔ گھر میں ہر لمحے "جھپ کر" (جلدی

کر) کی صدا بلند ہوتی ہے مگر سجا (تازہ) پکا کر کھانے کا اپنا ہی انداز ہے۔

ریفریجریٹر میں پڑے باسی کھانے...... انھیں تناول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کھانا بالکل تازہ ہونا چاہیے۔ آدھا کلو مرغی اور آدھا کلو سبزی ہی کافی ہے، لوگ چاہے چار ہوں یا بارہ مگر باسی کھانا، نہ بابا نہ......! کم پڑے جائے تو تھوڑا سا آلو انڈا وغیرہ بنا لیں گے کیونکہ جلدی جلدی (جھپ جھپ) کام کرنا، تو یہاں کا خاصا ہے۔

جھنگ کی زبان میٹھی گردانی مگر خاصی محنت سے بولی جاتی ہے۔ ہر لفظ خوب زور دے کر، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ مگر یہ بات تو ماننا پڑے گی کہ ''اپنی بات منوا کر دم لینا'' جھنگ والوں پر ختم ہے۔ اپنی بات سنانے کا فن جیسا جھنگ والوں کو آتا ہے، شاید ہی کوئی ان کے مقابلے پر ڈٹے حتیٰ کہ اہل علم و دانش بھی ان پڑھ لوگوں کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں۔

میں نے چاہا کہ دلیل اور زبان دانی کی کنجی تلاش کروں تو میں نے ''ان لوگوں'' کا ایک وصف پایا۔ پیارے نبی ﷺ نے ایک قبیلے کی خواتین کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا ''اس قبیلہ کی مائیں اپنے بچوں پر بہت نرم ہیں۔'' اہل جھنگ بھی انہی کی آل اولاد معلوم ہوتے ہیں۔ بچے چاہے چاند تاروں کی فرمائش کریں، مائیں التجا کرتی نظر آئیں گی: ''بیٹا! وہ بہت دور ہیں، میں لا نہیں سکتی ورنہ ضرور لا دیتی۔'' مگر مجال کیا ہے بچے کو ڈانٹا ڈپٹا جائے۔ صرف بچے کی ضد پر پزا (Pizza) فرائز (Fries)، جوتے اور کپڑے ہر چیز حاضر خدمت ہوتی ہے۔

جب بچے فرمائش کریں تو سجی (تازی) روٹی نہیں تو ہر وقت پراٹھا حاضر کرنا ماؤں کی اولین ترجیح ہے۔ شاید یہی وہ وصفِ خاص ہے جس کی بدولت جھنگ کئی شعرا اور ادیبوں کو جنم دے چکا۔ شاعری ماں کی گود سے شروع ہوتی اور زندگی میں لحہ بہ لحہ نمو پاتی ہے۔ شادی کے مواقع پر فی البدیہہ گانے گائے اور فوتیدگی پر فی البدیہہ اعلیٰ پائے کے بین کیے جاتے ہیں۔ وہ لکھ لیے جائیں تو ادب کے بہترین شاہ پارے کہلائیں اور انھیں سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ عملِ سکھلائی تو یہاں کی ہوا ہی میں شامل ہے۔

جذبات چونکہ بالکل مجروح نہیں کیے جاتے، اس لیے شاعر اور اعلیٰ زبان بولنے والی قوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ یہ سب اوصاف نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔ اس کا راز ہے وٹہ سٹہ یا کم از کم خاندان ہی میں شادی! یوں خاندانی رہن سہن، بول چال، عادات و اطوار کچھ تبدیل نہیں ہوتا۔ بس آسمان ہی رنگ بدلتا ہے، جھنگ نہیں بدلتا۔

جھنگ کی خوبیاں تو بے شمار ہیں مگر ایک خامی اسے لے ڈوبی...... وہ ہے مرعوب ہونے کی خاص صلاحیت! خوب صورتی ہو یا خوش شکلی، خوش گفتاری ہو یا خوش لباسی، خوش اطواری ہو یا اعلیٰ ظرفی، جھنگ والے دل کو اچھی لگنے والی کوئی بھی چیز دیکھیں تو فوراً مرعوب ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ بھی ماؤں کی تربیت ہی ہے جس میں روک ٹوک نام کو نہیں ہوتی۔ چناں چہ یہاں کے مرعوب زدہ لوگ نسل در نسل کسی پیر فقیر کے پیچھے چلتے اور انھیں اپنا نمائندہ بھی بنا لیتے ہیں، بنا یہ سوچے کہ وہ عوام کے لیے کچھ کرتے بھی ہیں یا نہیں؟ بچارا جھنگ ''ماٹھے'' ارکان اسمبلی کی وجہ سے ہی قدیم ترین علاقہ ہوتے ہوئے بھی پڑوسی علاقوں مثلاً فیصل آباد، چنیوٹ، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور گوجرہ سے پیچھے رہ گیا۔ حکومت کو چاہیے کہ اس قدیم علاقے کو ترقی دے، اسے ڈویژن بنائے

اور یہاں ترقیاتی کام کروائے۔

ساکنان جھنگ بہت دلچسپ ہیں۔ ہر مہنگی شے خریدنا ان کے لیے باعث فخر ہے اور گوشت کی ہر قسم سے انصاف برتنا امیری..... مگر کیا کیجیے طرز معاشرت میں کوئی تبدیلی آئی ہے اور نہ تنوع! ان کے گھروں میں پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کسی گاؤں میں آ گئے ہوں۔ بہترین کوٹھی، عمدہ لکڑی کا کام، سنگ مرمر سب کچھ ہو گا حتیٰ کہ صوفہ، بستر، شوکیس، الماریاں بھی ہوں گی مگر ترتیب و سلیقہ ناپید۔ ''امریکن کچن'' تو بن گئے مگر برتن ٹوکریوں میں رکھے نظر آتے ہیں کہ الماریوں میں گندے ہو جائیں گے۔ دیگر سامان بھی جستی پیٹیوں اور ٹرنکوں کی نظر رہتا ہے۔ وسیع و عریض صحن اب صرف جھنگ ہی میں ملتے ہیں کیونکہ لوگ سردیوں میں دھوپ نہ تاپ سکیں تو ان کے جذبات سرد پڑنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ کسی کام کے بغیر بستر سے اٹھنا ان کی فطرت کے عین خلاف ہے۔ سو لیٹے لیٹے کھانے کا مزہ تو کوئی ان سے پوچھے! جنت کا قریب قریب تصور شاید صرف اہل جھنگ ہی سوچ سکتے ہیں کیونکہ ان کی مائیں جو اتنی محبت کرنے والی، رحم دل اور دیالو ہیں۔

اب چلیے ذرا بازار ہو آئیں۔ منہ مانگی قیمت کیا ہوتی ہے، یہاں آ کر جانیے۔ اس لیے کہ جس چیز پر دل آیا، وہ تو ہے ہی بہت خاص اور اعلیٰ! اب اسے چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ دکاندار گاہک کا مزاج خوب جانتے ہیں۔ لہٰذا منہ مانگی قیمت سے قطعاً پیچھے نہیں ہٹتے۔ لینا ہے تو لو ورنہ جاؤ اور جا کون سکتا ہے..... یہ جھنگ جو ہے!

اور جی ہاں، یہاں کے مرد اپنی بیویوں کو جو مقام دیتے ہیں، وہ انھیں دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے۔ کسی خاتون کا معمولی لباس اور ظاہری حلیہ دیکھ کر اسے کم تر نہ جانیں

زندگی کے موتی

- شرافت محض عقل و ادب سے ہے نہ کہ مال اور اعلیٰ منصب سے!
- جب توجہ کا مرکز اپنی ہی ذات کی خوبیاں ہوں تو انسان اپنی اصلاح میں سست اور تنقید میں چست ہو جاتا ہے۔
- جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں، وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ (فاطمہ سعد، واہ کینٹ)

کیونکہ جھنگ کی خواتین ہر حلیے اور ہر حال میں شوہروں کی راج دھانی پر حکومت کرتی ہیں۔ لہٰذا کسی عورت کو غیر اہم نہ جانیے، خدا جانے کون کس کی گھر والی ہو.....؟

جھنگ میں سرفہ (بچت) کی جتنی روایات ہیں، ان کے متعلق ''انسائیکلوپیڈیا'' کے مقابلے کی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بس چند جھلکیاں پیش ہیں! وہ رات کو ریفریجریٹر بند کر دیتے ہیں تاکہ بجلی بچ سکے۔ صحن میں بتی نہیں لگاتے کہ ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ لباس پیوند زدہ پہنتے ہیں کہ سنت نبوی ﷺ ہے۔ آلو پیاز باریکی سے چھیلتے ہیں، وقت اور صحت چاہے جتنی بھی خرچ ہو! مقررہ وقت سے پہلے تیاری نہیں کرتے کہ پیسے نہیں ہوتے۔ اور وقت پڑنے پر بے دریغ تیاری کرتے ہیں کہ اب چارہ ہی نہ تھا۔

اب مجھے بس کرنا چاہیے کیونکہ بہوؤں کو اتنا بولنا زیب نہیں دیتا۔ مگر آپ کیا جانیں کہ ''شہر جذبات'' کی مٹی، پانی مجھ پر بھی اثر کر چکی۔ شاید کبھی میں اہل علم و فن میں شامل ہو جاؤں کہ جھنگ آنے کا یہ فائدہ بھی نہ اٹھاؤں تو تف ہے مجھ پر! آخر میں یہی کہوں گی: جھنگ زندہ باد۔ ♦♦♦

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

جابر حکمرانوں کے سامنے برملا جراتِ گفتار کرنے والے دلیر و جری عالم دین کی منفرد سرگزشت

عبدالمالک مجاہد

تاریخ اسلام میں امام ذہبیؒ بہت بڑی علمی شخصیت گزرے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ سے استفادہ کرنے والوں میں آپ بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کی صورت و سیرت کا نقشہ کچھ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''امام ابن تیمیہؒ نہایت خوبصورت جسم کے مالک تھے۔ رنگ گورا، سیاہ بال، کالی ڈاڑھی، موٹی آنکھیں، چوڑا چکلا بدن، مونڈھے کھلے اور فراخ، آواز بلند تھی اس میں فصاحت و بلاغت کا جوہر نمایاں تھا۔ سریع الکلام تھے۔ بہت کم غصہ آتا۔ اگر آ بھی جاتا تو اللہ کے فضل و کرم اور اپنے علم سے اسے دبا لیتے۔ نہایت عبادت گزار تھے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بہت گہرا تھا۔ خوب عجز و انکسار اور آہ و زاری کے ساتھ دعائیں مانگتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور اس سے مدد طلب کرنے میں ان جیسا آدمی کم ہی ملتا ہے۔''

قارئین کرام! تاریخ کے اوراق الٹائے جائیں تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ رحمہ اللہ کی شخصیت کے کتنے ہی روشن پہلو ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ وہ ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوتے' تو ہمیشہ کلمہ حق کہتے۔ ان کے دور میں دمشق کا گورنر ابن قطلو بک تھا۔ یہ بڑا

تاتاری بادشاہ قازان جو غازان بھی کہلاتا ہے

ظالم و جابر حکمران تھا۔ دین سے بے بہرہ یہ گورنر شیخ الاسلام کی شہرت سے بے حد خائف تھا۔ اسے بڑے تسلسل سے یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ ابن تیمیہؒ جس مقام پر جائیں، نوجوانوں کا ایک گروہ ان کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

حاسدین ابن قطلو بک کو ان کے بارے میں خوب بھڑکاتے۔ ان کے خلاف شکایات کے انبار لگا دیتے۔ ان کا کہنا تھا: ''تمھاری حکومت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ابن تیمیہؒ ہے۔'' علمائے سُو علمی میدان میں تو انھیں شکست نہ دے سکے، مگر آسان راستہ تھا کہ حکمرانوں کو ان کے خلاف بھڑکا دیا جائے۔

شاہی دربار میں

آخر ایک دن ابن قطلو بک نے امام ابن تیمیہؒ کو اپنے دربار میں بلا لیا۔ وہ ان کی صاف ستھری گفتگو اور سچائی کا معترف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ امام صاحب کا لوگوں کے دلوں میں کیا مقام و مرتبہ ہے۔ بلاشبہ امام ابن تیمیہؒ کی شخصیت بڑی زور دار تھی۔ علمی دنیا میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اس لیے جب امام صاحب دربار میں پہنچے تو ابن قطلو بک نے وہی حکمرانوں والے رسمی جملے ادا کیے۔ کہنے لگا: ابن تیمیہؒ! میری خواہش تو تھی کہ میں خود آپ سے ملنے آتا، مگر آپ کو معلوم ہے کہ میری حکومتی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں، میں بے حد مشغول ہوں۔ اس لیے آپ کو اپنے پاس بلوا لیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ بڑے عالم ربانی، اور زاہد و عابد ہیں۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے جواب دیا ''ابن قطلو بک! ان رسمی باتوں کو چھوڑو، کام کی بات کرو۔''

وہ کہنے لگا: ابن تیمیہؒ! وہ باتیں جو تمھارے بارے میں ہم تک پہنچیں کیا وہ درست ہیں؟

پوچھا: وہ کون سی باتیں ہیں؟

بادشاہ کہنے لگا: ''لوگوں کا خیال ہے کہ تم ہماری بادشاہت پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔''

ابن تیمیہؒ نے حقارت بھری نظروں سے ابن قطلو بک کی طرف دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے فرمایا: ''تمھاری بادشاہی؟''

بادشاہ کہنے لگا: ہاں، میری بادشاہی۔

جواب میں شیخ الاسلام نے جو کچھ فرمایا، اسے ذرا غور سے سننے اور پڑھنے کی ضرورت ہے:

''اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمھاری بادشاہی، اور تمھارے آباؤ اجداد کی بادشاہی میرے نزدیک ایک فرش کے برابر حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ میں تو اللہ کی اس جنت کا طلب گار ہوں جس کی چوڑائی زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے۔ اپنی ساری دنیا سنبھال رکھو اور میرے دل کو آزاد، غم دنیا سے فارغ اور لوگوں کے لیے اجنبی رہنے دو۔ میں تم لوگوں سے زیادہ دولت مند ہوں اگرچہ تم مجھے ایک تنہا اور کم عقل شخص خیال کرتے ہو۔''

> میں تو اللہ کی اس جنت کا طلب گار ہوں جس کی چوڑائی زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے۔ اپنی ساری دنیا سنبھال رکھو اور میرے دل کو آزاد، غم دنیا سے فارغ اور لوگوں کے لیے اجنبی رہنے دو۔

بادشاہ ان کے جواب سے مبہوت ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا تقرب

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ایک مرتبہ ان کے

شاگرد ابوالقاسم المغربی نے گزارش کی: "مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جس کے ذریعے مجھے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہو جائے اور قرآن کریم کے بعد ایسی کتاب کے بارے میں بتائیں جس پر میں علم حدیث کے بارے میں بھروسا کر سکوں اور یہ بھی بتایئے کہ رزق حاصل کرنے کا سب سے افضل طریقہ کون سا ہے؟"

امام ابن تیمیہؒ نے ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے۔ قرآن کریم کے بعد سب سے عمدہ کتاب امام محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب صحیح البخاری ہے۔ جہاں تک تمہارے تیسرے سوال کا تعلق ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رزق طلب کرنے کا سب سے افضل طریقہ یہ ہے کہ تم واحد، الاحد، ذات الٰہی پر بھروسا اور اعتماد کرو اور اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دو۔"

ابن تیمیہؒ صرف قلم و قرطاس کے دھنی نہیں تھے، بلکہ میدان جنگ میں بھی ان کی استقامت، شجاعت اور بہادری نے ثابت کیا کہ وہ تلوار چلانے والے شہسوار بھی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تاتاریوں کے خلاف جس جنگ میں امام ابن تیمیہؒ نے شرکت کی تھی، اس میں اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم سے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

شیخ الاسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ علم کے وسیع و عریض اور گہرے سمندر تھے۔ ان سے تفسیر کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ اس طرح جواب دیتے گویا امام المفسرین ہیں۔ اگر ان سے فقہ شافعی کے حوالے سے سوال ہوتا تو ایسا شافی جواب ملتا کہ سننے والے کو محسوس ہوتا، وہ شافعی مسلک کے سب سے بڑے عالم ہیں، حالانکہ ان کا اپنا رجحان حنبلی مسلک کی طرف تھا۔ اسی طرح ان کی کتب کا جائزہ لیا جائے تو وہ توحید، تفسیر، حدیث، لغت، منطق، فلسفہ، فقہ، تاریخ، مذاہب عالم اور عقائد سے متعلق تمام علوم میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ جس مسئلہ کو یاد کرتے یا اس کی تحقیق کرتے تو اسے کبھی نہ بھولتے۔

وہ نہایت حکمت و دانائی سے حکمرانوں کو تبلیغ کرتے۔ جہاد فی سبیل اللہ میں بھی بہت نمایاں مقام رکھتے۔ ان کے دور میں مغل حکمرانوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔ یہ بادشاہ تاتاریوں کی اولاد تھے۔ ان میں جاہلیت کی بہت ساری کمزوریاں پائی جاتی تھیں۔ جس طرح انھوں نے ہلاکو خان کے پوتے کو تبلیغ کی وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔

> رزق طلب کرنے کا سب سے افضل طریقہ یہ ہے کہ تم واحد، الاحد، ذات الٰہی پر بھروسا اور اعتماد کرو اور اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دو۔"

موت سے ڈر نہیں

شیخ الاسلام کو دشمنوں کی سازشوں کے نتیجے میں متعدد بار قاہرہ اور دمشق کی جیلوں میں ڈالا گیا۔ مخالفین کا خیال تھا کہ وہ اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے امام صاحب کو نیچا دکھا لیں گے۔ مگر وہ عالم ربانی تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد وحید عقیدہ توحید کی اشاعت اور سنت نبوی ﷺ کی ترویج تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جیل میں بھی اپنے مخالفین کو للکارتے۔ انھوں نے کئی مرتبہ اپنے مخالفین سے کہا تھا: "میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

"ارے میں تو وہ ہوں کہ میری جنت اور میرا باغ

میرے سینے میں ہے۔ میں جہاں بھی جس جگہ بھی جاؤں یہ سعادتیں، یہ خوشیاں، یہ اطمینان میرے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اگر حکمران مجھے قتل کر دیں گے تو یہ میرے لیے شہادت ہے۔ وَاِنَّ سِجْنِي خَلْوَةٌ اگر حکمران مجھے جیل میں ڈالیں گے تو یہ میرے لیے خلوت ہوگی۔ جیل میں اپنے رب کے ساتھ اپنے تعلق کو اور گہرا اور مضبوط بنالوں گا۔"

"اور اگر حکمران مجھے ملک بدر کر دیں گے تو یہ میرے لیے سیر و سیاحت ہو جائے گی۔ میں تو ہر جگہ ہر وقت خوش ہی خوش ہوں۔"

امام ابن تیمیہؒ کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نہایت سخی تھے' ان کا ہاتھ بڑا کھلا تھا۔ اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرتے۔ خصوصاً طلبہ کے لیے ان کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے۔ لوگوں کے ہاں یہ بات معروف تھی کہ اگر کسی کو تعاون کی ضرورت ہو تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے پاس چلا جائے۔

مالی اعتبار سے وہ کوئی امیر کبیر تھے نہ ہی ان کی جائیداد یا کاروبار اور زمینیں تھیں' مگر دل کے غنی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ہر حالت میں سعادت مند اور خوش رہتے ہیں۔

تاتاریوں کا حملہ

امام ابن تیمیہؒ کی جرأت گفتار' علمی رسوخ اور بالغ نظری کس اعلیٰ درجے کی تھی' یہ جاننے کے لیے تاریخ کے صفحات سے ایک خوبصورت واقعہ پیش ہے۔

تاتاریوں نے شام پر ۶۹۹ ہجری میں حملہ کیا۔ اس وقت شام پر مصر کے حاکم ناصر بن قلاوون کی حکومت تھی۔ شامی فوجیوں نے تاتاریوں کی معمولی سی مزاحمت کی اور شکست کھا کر بھاگ گئے۔ تاتاریوں کی دہشت ہی اتنی زیادہ تھی کہ ان کے سامنے کوئی کم ہی ٹھہرتا۔ اس شکست نے اہل شام کو ہلا کر رکھ دیا۔ پورے شام میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے مختلف مقامات کی سمت بھاگ اُٹھے۔

تاتاریوں کا رخ اب دمشق کی طرف ہوا۔ ہلاکو خان کے پوتے سلطان قازان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ۲۸ دسمبر ۱۲۹۹ء کی بات ہے کہ سلطان ستر کلو میٹر دور "النبک" کے مقام پر ڈیرے ڈالے دمشق میں داخل ہونے کی سوچ رہا تھا۔ اہل دمشق سخت سہمے ہوئے تھے۔ سبھی تاتاریوں کے مظالم سے خوف زدہ تھے۔ عامۃ الناس کا تو ذکر ہی کیا' خواص علما اور اکابر ملت اور عمائدین شہر بھی ہر چیز چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف بھاگ گئے۔

> مالی اعتبار سے وہ کوئی امیر کبیر تھے نہ ہی ان کی جائیداد یا کاروبار اور زمینیں تھیں' مگر دل کے غنی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ہر حالت میں سعادت مند اور خوش رہتے ہیں۔

ان حالات میں جبکہ شہر پر نحوست کے بادل چھائے ہوئے تھے' ایک شخص ایسا بھی تھا جو ہمالیہ سے بلند عزائم لیے شہر میں عامۃ الناس کے درمیان موجود رہا۔ ان کا نام احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہؒ تھا۔ وہ کسی خوف اور پریشانی میں مبتلا ہوئے بغیر دشمن کی پیش قدمی روکنے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ان کا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ لوگوں کو پریشان حال چھوڑ کر خود کسی محفوظ مقام کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اس وقت دمشق پر کوئی حاکم تھا نہ ہی کوئی نظام جو لوگوں کی مال و جان اور آبرو کی حفاظت کر سکتا۔

دوراندیش قائد

فتنہ پرور عناصر اور حالات سے فائدہ اٹھانے والے بدمعاش قسم کے لوگوں کے لیے ایسے حالات بہت سازگار ہوتے ہیں۔ لٹیروں اور بدمعاشوں کو جیسے ہی علم ہوا کہ شہر میں کوئی حاکم نہیں رہا تو انھوں نے شہر میں لوٹ مار شروع کر دی۔ دمشق کی جیل میں دو سو سے زائد خطرناک قیدی بند تھے۔ وہ جیل کا دروازہ توڑ باہر نکل آئے اور شہر میں لوٹ مار مچا دی۔ ابھی تاتاری شہر میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ پورا شہر ان لٹیروں کے رحم و کرم پر آ گیا۔ دکانیں' بازار اور املاک لوٹ لی گئیں۔ عورتوں کی بے حرمتی کے واقعات بھی ہوئے۔

یہ وہ وقت تھا جب امام ابن تیمیہؒ نے ایک دوراندیش قائد اور مصلح کا کردار ادا کیا۔ انھوں نے بچے کھچے اعیان دمشق کو جمع کیا۔ ان کی مدد اور تعاون سے شہر کے حالات قابو کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ شاگردوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ نتیجے میں شہر کے حالات قدرے بہتر ہو گئے۔

شہر پر تاتاریوں کا حملہ کسی وقت بھی ممکن تھا۔ امام ابن تیمیہؒ نے شہر کے بچے کھچے زعما سے مشورہ کیا کہ انھیں کیسے روکا جائے۔ طویل مشورے کے بعد طے ہوا کہ تاتاریوں کے بادشاہ قازان سے ملاقات کی جائے۔ چونکہ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مسلمان ہے لہٰذا اسے آمادہ کیا جائے کہ وہ دمشق میں داخل نہ ہو۔ مؤرخین کے مطابق امام ابن تیمیہؒ کی قیادت میں ان کے ہمراہ جو وفد قازان سے ملاقات کرنے گیا' اس کے شرکا کی تعداد دو سو سے زائد تھی۔

قازان اپنی فوج کے ساتھ النبک نامی جگہ پر مقیم تھا۔ یہ مقام دمشق سے جنوب مغرب کی طرف ستر کلومیٹر دور ہے۔ اس وقت یہ شہر شام کے اہم شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کا موسم گرمیوں میں بڑا معتدل اور عمدہ رہتا ہے۔ آبادی ۲۰۱۰ء کی مردم شماری کے مطابق اسی ہزار ہے۔ لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آتے ہیں۔ اگر ہم اس دور کے سفر کا حساب لگائیں تو دمشق سے النبک پہنچنے کے لیے دو دن درکار تھے۔

بادشاہ بے بس ہوا

جب یہ لوگ النبک پہنچے تو پہلے لشکر کے سرداروں سے ملاقات ہوئی اور انھیں اپنا موقف بتایا۔ یہ لوگ بالکل خالی ہاتھ تھے۔ امام ابن تیمیہؒ کے پاس بھی کوئی خنجر یا تلوار تو نہ تھی' مگر وہ ایمان اور تقویٰ کے اسلحے سے ضرور مسلح تھے۔ سبحان اللہ! اولیا کی صفت ہے کہ وہ حکمرانوں سے نہ تو ڈرتے ہیں نہ ان کے دل میں کوئی گھبراہٹ و پریشانی ہوتی ہے۔ امام صاحب جب دمشق سے روانہ ہوئے تو وفد میں شریک ایک شخص آنکھوں دیکھا حال کچھ یوں بیان کرتا ہے:

جب شاہ قازان سے ملاقات ہوئی' تو امام ابن تیمیہؒ نے بھرے دربار میں نہایت خوبصورت انداز میں قرآن پاک کی تلاوت کی اور احادیث بیان کیں۔ آیات اور احادیث عدل و انصاف اور ظلم کرنے سے روکنے کے احکامات پر مشتمل تھیں۔ امام صاحب کا لہجہ بلند ہوتا گیا۔ وہ شاہ قازان کے قریب ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ جا لگے۔ وہ قرآن و حدیث سے دلائل دے رہے تھے۔ ادھر شاہ قازان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ مبہوت ہو کر گفتگو سنتا اُن کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں امام صاحب کا رعب اور دہشت بیٹھ گئی۔

لیکن وہ بڑا سفاک' اپنی تند خوئی اور درشت مزاجی میں بڑا معروف تھا' آخر کب تک صبر کرتا۔ اس نے

قدرے پریشان ہوکر وائیں بائیں بیٹھے حاشیہ برداروں کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا: ''یہ شخص کون ہے؟ میں نے آج تک اتنا جرأت مند اور موثر شخص نہیں دیکھا۔ اس کی باتیں تو میرے دل و دماغ میں اترتی جا رہی ہیں۔ میں کبھی کسی کے سامنے اتنا بے بس نہیں ہوا۔ میرے پاس اس شخص کے دلائل کا جواب نہیں۔''

حاشیہ برداروں نے قازان کو بتایا کہ یہ شیخ احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہؒ ہیں اور ان کا بلند علمی مقام اور مرتبہ ہے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ شیخ الاسلام نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: قازان! تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو' تمہارے ساتھ قاضی' شیخ اور مؤذن بھی ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کو اللہ کے نام پر بلاتے ہیں۔ سنو تمہارے باپ دادا کافر تھے۔ وہ مسلمان نہ تھے مگر کردار اور سیرت میں تم سے کہیں اونچے اور بہتر تھے۔ جو کچھ تم نے مسلمان ہوکر انجام دیا' وہ تو انھوں نے کافر ہوکر بھی نہیں کیا تھا۔ تمہارے آباؤ اجداد نے لوگوں سے کچھ وعدے کیے تو ان کو پورا کیا' مگر تم نے تو عہد و پیمان توڑ ڈالے۔ وہ باتیں جو تمہارے منہ سے نکلیں' وہ پوری نہ ہوسکیں۔''

یوں امام ابن تیمیہؒ نے پوری جرأت اور بہادری کے ساتھ ظالم اور جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق بیان کیا۔ اسی کو افضل جہاد کہا جاتا ہے۔ موقف بیان کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس طرح عزت اور سربلندی کے ساتھ قازان کے پاس تشریف لائے تھے' اسی اجلال و اکرام کے ساتھ واپس ہوئے۔

(الکواکب الدریۃ)

دلیری کا زبردست مظاہرہ

قازان نے پھر حکم دیا کہ وفد کے اعزاز میں دسترخوان بچھاؤ نیز ان کی عمدہ کھانوں سے تواضع کی جائے۔ چناں چہ کھانا چنا جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ سمیت سب لوگ کھانے میں شریک ہوئے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ بادشاہ کے ہاں کھانا لگا ہوا ہے۔ وفد کے دیگر افراد کھانا کھا رہے ہیں' مگر امام صاحب نے ہاتھ روک لیا۔ قازان پوچھتا ہے کہ امام صاحب آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے جو جواب دیا' اسے ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''سلطان! میں آپ کا کھانا کیسے کھا سکتا ہوں؟ یہ تو وہی کھانا ہے جو لوگوں کو لوٹ کر تیار کیا گیا۔ جو کچھ دسترخوان کی زینت ہے' یہ انہی درختوں کی ٹہنیوں پر پکا جنہیں ظلم سے کاٹا گیا ہے۔''

یہ سن کر قازان نے سر جھکا لیا' کہنے لگا: ''امام صاحب! میرے لیے دعا تو فرمادیں۔''

امام صاحب نے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور یوں دعا فرمائی:

اے اللہ! اگر تیرے علم میں ہے کہ قازان نے تلوار اس لیے نکالی کہ تیرا کلمہ بلند ہو اور یہ تیرے راستے میں جہاد کرنا چاہے تو اس کی مدد فرما۔ اسے اپنی نصرت سے نواز۔ اگر اس نے یہ جنگ اپنی حکومت کو وسعت دینے اور مال و دولت کے حصول کے لیے شروع کی ہے تو پھر تو ہی اس سے نبجھ لے۔''

یہ منظر کتنا بھلا ہوگا کہ امام ابن تیمیہؒ دعا کر رہے ہیں اور قازان اس پر بے اختیار آمین کہہ رہا ہے۔

راوی واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: امام صاحب تو نہایت اطمینان سے دعا کر رہے تھے' ادھر ہماری یہ حالت تھی کہ خوف سے اپنا دامن سمیٹتے سوچ رہے تھے کہ ابھی امام ابن تیمیہؒ کی گردن اڑا دی جائے

گی مگر الحمدللہ! کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم لوگ سلطان کے دربار سے فارغ ہو کر اپنی قیام گاہ واپس آئے تو امام ابن تیمیہؒ سے کہا: شیخ صاحب! آج تو آپ نے ہماری جان ہی نکال دی۔ آپ نے جس دلیری سے بات کی اس سے سلطان قازان سخت ناراض ہوا ہے۔

امام صاحب نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ جب وفد دمشق واپس جانے لگا' تو لوگوں نے امام صاحب سے کہا' ہم آپ کے ساتھ دمشق نہیں جائیں گے۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ راستہ میں سلطان قازان کے گماشتے آپ کو قتل کرنے کے لیے آئیں گے۔ چونکہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، اس لیے ہمیں بھی اپنی جانوں کا ڈر ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے فرمایا: ''اگر تم لوگ میرے ساتھ سفر کرنے کے لیے تیار نہیں تو جاؤ' میں بھی تمہارے ساتھ جانا پسند نہیں کرتا۔''

اب ذرا دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی کس طرح حفاظت فرماتا اور اس کی عزت بناتا ہے۔ وفد کے ارکان امام ابن تیمیہؒ کے بغیر سفر کر رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ ان پر حملہ آور ہو گیا۔ یہ لوگ لڑائی کے لیے تیار ہو کر آئے تھے نہ ہی ان کے پاس ہتھیار تھے۔ ان ظالم ڈاکوؤں نے وفد کے ارکان کو نہ صرف لوٹا' ان کی ہر چیز ہتھیا لی' بلکہ ان کے تن کے کپڑے بھی اتروا لیے۔

دوسری طرف امام ابن تیمیہؒ کی قازان کے دربار میں کہی گئیں کلمہ حق کی باتیں دمشق پہنچ چکی تھیں۔ لوگ بڑی شدت سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ چناں چہ شہر کی عورتیں، مرد اور بچے شیخ الاسلام کی آمد کی خبر سن کر ان کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔ آپ سیکڑوں افراد کے جلو میں دمشق واپس تشریف لائے۔

امام ابن تیمیہؒ کی سلطان قازان سے ملاقات نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ قازان نے دمشق پر حملہ کا منصوبہ ملتوی کر دیا۔ اس دوران دمشق میں امن و امان قائم رہا۔

بدعات کے خلاف جہاد

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے ساری زندگی بدعات کی بیخ کنی میں گزاری۔ انھیں معلوم ہوا کہ دمشق کے قرب وجوار میں ایک چٹان ہے۔ مسلمان اس کی زیارت کو جاتے اور وہاں نذر و نیاز بھی چڑھاتے ہیں۔ آپ نے ساتھیوں کے ہمراہ اس چٹان کو توڑنے کا ارادہ کیا' چناں چہ سنگ تراشوں کی مدد سے اسے نیست و نابود کر دیا۔

بدقسمتی سے ہر دور میں اہل بدعت مختلف درختوں، پتھروں اور چٹانوں کے بارے میں طرح طرح کے غلط عقائد رکھتے ہیں۔ نام نہاد گدی نشین اپنے بارے میں جھوٹی کرامتیں گھڑ کر عوام میں پھیلا دیتے ہیں۔ جاہل عوام ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آتے اور ان مقامات کی تعظیم و عبادت شروع کر دیتے ہیں۔ عموماً اس قسم کی کرامات مشہور کی جاتی ہیں کہ یہ بابے کا درخت ہے۔ کوئی اس کی ٹہنی کاٹ کر دیکھے تو سہی' وہ اسے گھر پہنچنے نہیں دے گا۔ بھارت اور پاکستان میں ایسی کئی درگاہیں اور جھاڑیاں ہیں جنھیں جاہل عوام پوجتے اور انھیں حاجات پورا کرنے کا منبع خیال کرتے ہیں۔

عالم عرب میں صوفیوں کے معروف گروہوں میں ایک فرقہ الرفائی گروہ بھی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو احمد بن ابی الحسین الرفائی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ انھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ سید احمد الرفاعی کی برکت سے آگ پیروکاروں کے جسم پر اثر نہیں کرتی۔

واقعتاً یہ لوگ بھڑکتی آگ پر چلتے پھرتے۔ لوگ ان کو آگ پر چلتا پھرتا دیکھتے تو نہایت متاثر ہوتے اور بس پھر کیا تھا' شرک و بدعت کا ایک اور اڈا کھل جاتا۔

مگر یہ سید احمد الرفاعی کی برکت نہ تھی' بلکہ پیروکار اپنے جسم پر ایسا مادہ مل لیتے جس کے باعث آگ ان پر اثر نہ کرتی۔ ان لوگوں نے نائب گورنر کی موجودگی میں امام ابن تیمیہؒ کو اپنا یہ شعبدہ دکھانا چاہا تو امام صاحب نے فرمایا ''تم میں سے جو شخص آگ میں داخل ہونا چاہتا ہے' وہ پہلے اپنے جسم کو خوب پانی سے دھوئے۔ سرکہ کی مالش کر کے گھاس سے اپنا بدن رگڑے۔ پھر اگر واقعی وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو آگ میں کود جائے۔'' یہ سن کر رفاعیوں کے سردار کی زبان سے اتفاقاً کلمہ حق نکل گیا ''ہماری یہ کراماتیں تاتاریوں کے سامنے ہوتی ہیں نہ کہ اہل شرع کے مقابلے میں۔''

اتفاقاً نکلی ہوئی اس بات سے سارا بھید کھل گیا۔ نائب گورنر کو بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ درپردہ تاتاریوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ جب تحقیق کی گئی تو مزید جرائم بھی سامنے آئے۔ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ اپنے ہی وطن شام کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے ہیں' چناں چہ ان لوگوں کو حکومت کی طرف سے قرار واقعی سزا دی گئی۔

نیا عزم و حوصلہ

امام ابن تیمیہؒ کی عزت، شہرت ان کے علم کا تذکرہ عالم عرب کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکا تھا' مگر کیا مجال ہے کہ اس عالم ربانی کا تکبر اور نخوت سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہو۔ یہ ان علما میں سے تھے کہ جس قدر انھیں بلند مرتبہ ملا' اسی قدر انھوں نے تواضع اختیار کر لی۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ تاتاریوں کا زور مصریوں نے توڑا اور انھیں عین جالوت کے میدان میں شکست فاش دی۔ مگر تاتاریوں کو شکست دینے میں علمائے حق کا بھی بڑا کردار تھا۔ امام ابن تیمیہؒ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی روح پرور تقریروں کے ذریعہ مصری نوجوانوں کو نیا عزم و حوصلہ اور ایک ولولہ تازہ بخشا۔ عوام کے عزائم مضبوط کر دیے۔ انھوں نے لشکر اکٹھے کیے۔ فوجیں جمع کیں اور پھر تاریخ کا مسافر دیکھتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ بنفس نفیس میدان کارزار میں کود پڑتے ہیں۔

> امام ابن تیمیہؒ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی روح پرور تقریروں کے ذریعہ مصری نوجوانوں کو نیا عزم و حوصلہ اور ایک ولولہ تازہ بخشا۔ عوام کے عزائم مضبوط کر دیے۔

آپ کی جملہ خوبیوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ جب وہ بات کرتے تو سیدھی دل میں اترتی چلی جاتی۔ کوئی ان سے ملتا اور گفتگو کرتا تو ان کی شخصیت سے اس طرح متاثر ہوتا کہ ان کی بات پوری توجہ سے سنتا چلا جاتا اور مجبور ہو جاتا کہ اپنے قلب و احساس انھیں سونپ دے۔

ابن تیمیہؒ کی عمر محض تیس سال تھی کہ علما و طلاب دور دور سے ان کے دروس میں شرکت کے لیے پہنچتے۔ ان میں کتنے ہی صرف تنقید کی غرض سے آتے۔ ان کی نیت یہ ہوتی کہ امام صاحب پر نکتہ چینی کریں گے مگر جب درس سے فارغ ہوتے تو ان کے پاس امام صاحب کو خراج تحسین پیش کیے بغیر چارہ نہ رہتا۔ طلبہ اور علما کی ایک بڑی تعداد محض استفادے کے لیے آتی اور ہدایت پا کر واپس جاتی۔

ان کی شخصیت میں توازن تھا۔ وہ مسلمانوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے حقوق کا بھی دفاع کرتے رہے۔ ایک بار پھر امام ابن تیمیہؒ سلطان قازان کے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں۔ وہ اس سے کہہ رہے ہیں: اگر تم مسلمان ہو تو صحیح معنوں میں مسلمان ہو' لوگوں کو دھوکا نہ دو۔ اپنی فوج اور مسلمانوں کی تمام افواج کو ایک ہی جھنڈے تلے اکٹھا کر کے مل کر اسلام دشمن قوتوں کا مقابلہ کرو' آپس میں اختلاف نہ کرو۔

قازان بات تبدیل کرتے ہوئے کہنے لگا: چلو! ہم لبنان کے مسلمان قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

امام صاحب نے قازان سے کہا: نہیں' اللہ کی قسم! صرف مسلمان قیدی نہیں بلکہ عیسائی اور یہودی قیدیوں کو بھی رہا کرنے کا حکم جاری کریں' کیونکہ آپ نے ان کے ساتھ بھی وعدہ کیا تھا کہ جہاں مسلمانوں کو گرفتار نہیں کیا جائے گا' وہاں عیسائی اور یہودی بھی نہیں پکڑے جائیں گے' ہمیں ہر حال میں اپنے وعدے کو پورا کرنا ہے۔''

امر المعروف و نہی عن المنکر

ایک مرتبہ شاہ مصر نے جہاد سے پہلوتہی کی' تو امام ابن تیمیہؒ اس سے ملنے پہنچ گئے۔ اسے کہا: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو کبھی نہ بھولو: ''اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا جو پھر تمھارے جیسے نہ ہوں گے۔'' (سورۃ محمد۔ ۳۸)

امام ابن تیمیہؒ کی شخصیت بے حد قوی تھی۔ ان کے مخالفین دلائل کا جواب نہ دے پاتے تو وہ شور شرابے اور ہنگامے پر اتر آتے۔ امام صاحب ایسے لوگوں سے ایک ہی بات کہتے: شور شرابہ کیوں کرتے ہو؟ آؤ دلیل سے بات کرو۔ ''ہمارے تمھارے درمیان فیصلہ کن چیز اللہ کی کتاب قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ ہے۔''

امام احمد بن حنبلؒ کا ایک مشہور قول ہے جو انھوں نے ایک مرتبہ اپنے مخالفین سے فرمایا تھا: ''ہمارے تمھارے درمیان جنازے کا دن فیصلہ کرے گا۔ تم لوگ دیکھو گے کہ ہمارے جنازوں پر کتنے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔'' پھر امام احمد بن حنبل کی بات حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ امام احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہؒ کے جنازے پر جو خلقت جمع ہوئی' تاریخ میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں پیش پیش رہتے۔ ان کے دور میں ابن قطلوبک المصوری بالشبہ بڑا متکبر بادشاہ تھا۔ لوگوں کا ناحق مال کھانے والے قطلوبک کا اپنا انداز تھا۔ وہ تاجروں سے اشیا خریدتا پھر انھیں رقم دینے میں لیت و لعل سے کام لیتا۔ اگر کسی کو ادائی کرتا بھی' تو اس سے پوچھتا: بتاؤ! یہ چیز تم نے کس بھاؤ سے خریدی تھی۔ جب اسے قیمت خرید بتائی جاتی تو وہ کہتا: ٹھیک ہے! تمھیں قیمت خرید کے مطابق پیسے مل جائیں گے۔ ایک تاجر سے ابن قطلوبک نے کافی سارا سامان خریدا اور اس کا حق دینے میں روایتی بہانے استعمال کرنے شروع کیے۔ تاجر نے امام ابن تیمیہؒ سے شکایت کی اور ان سے مدد طلب کی کہ وہ اس کا حق لے کر دیں۔

امام ابن تیمیہؒ اس تاجر کو لے کر قطلوبک کے پاس تشریف لے گئے تاکہ اس کی سفارش کریں۔ قطلوبک نے جب امام ابن تیمیہؒ کو اپنے محل کے دروازے پر

دیکھا تو کہنے لگا: ''اگر تم امیر کو فقیر کے دروازے پر دیکھو تو ایسا امیر بھی بڑا اچھا ہے اور فقیر بھی بڑا اچھا ہے۔ اگر تم فقیر کو امیر کے دروازے پر دیکھو تو پھر ایسا امیر بھی برا ہے اور ایسا فقیر بھی برا ہے''۔ ابن قطلوبک کے کہنے سے مقصد یہ تھا کہ آپ ایک بلند پایہ عالم دین ہو کر ایک حکمران کے دروازے پر آئے ہیں، تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس کا بہت خوبصورت جواب دیا، فرمایا: ''فرعون تم سے زیادہ ناپاک تھا اور موسیٰ مجھ سے کہیں افضل اور بہتر تھے، مگر اس کے باوجود موسیٰ روزانہ فرعون کے دروازے پر تشریف لاتے اور اسے دعوت ایمان دیتے تھے۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اس شخص کا حق ادا کرو۔'' ابن قطلوبک کے پاس ان کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

امام ابن تیمیہؒ کا اپنا گھر بار کوئی نہ تھا۔ بھائی شرف الدین ان کی ضروریات پوری کرتے۔ امام ابن تیمیہؒ نے مسودات لکھنے کے لیے شیخ عبداللہ بن اشیق مغربی کو اپنے پاس ملازم رکھا ہوا تھا۔ وہ ان کی تحریریں لکھتا۔ شیخ اسے لکھواتے جاتے اور وہ لکھتا چلا جاتا۔

امام ابن تیمیہؒ کے بے شمار شاگرد تھے مگر ان میں سب سے اہم اور ممتاز شاگرد امام ابن القیم محمد بن ابی بکر گزرے ہیں۔ آپ ۶۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۷۵۱ء میں وفات پائی۔ انھوں نے ہی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتب کی تدوین کی اور ان کا علم لوگوں تک پہنچایا۔ وفات سے پہلے آخری مرتبہ شیخ الاسلام کو قید کیا گیا تو یہ بھی ان کے ساتھ قید ہوئے۔ انھیں جیل سے چھٹکارا امام ابن تیمیہؒ کی وفات کے ایک ماہ بعد ملا۔

دوسرے بڑے شاگرد امام حافظ شمس الدین ذہبی تھے۔ ان کی علمی خدمات کا بھی ایک زمانہ معترف ہے۔ تاریخ الاسلام اور سیر اعلام النبلاء جیسی بلند پایہ کتب امام ذہبی ہی کے قلم کا شاہکار ہیں۔

علامہ ابن کثیر بھی شیخ الاسلام کے نمایاں ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ ان کی نہایت قابل قدر تصانیف سے امت اسلامیہ نے بہت فائدہ اٹھایا۔ البدایۃ والنہایۃ، تفسیر القرآن الکریم جیسی عظیم کتب ان کی علمی جلالت کی شہادت دیتی ہیں۔

◆◆◆

شیکسپیئر نے کہا

☆۔ محبت سب سے کرو، اعتبار چند ہستیوں کا اور بدی کسی کے ساتھ بھی روا نہ رکھو۔
☆۔ پہلے اپنے ساتھ راستبازی کرو، پھر تم کسی کو دھوکہ نہ دے سکو گے۔
☆۔ جو لوگ حکمرانی کے انداز نہیں جانتے انھیں اطاعت کرنے کا ڈھنگ سیکھ لینا چاہیے۔
☆۔ بزدل موت سے پہلے کئی بار مرتا ہے اور بہادر کو صرف ایک بار موت آتی ہے۔
☆۔ جس چیز کو سنوار نہ سکو اسے مت بگاڑو۔
☆۔ نہ قرض خواہ بنو نہ قرضدار، کیوں کہ وہ اکثر خود ضائع ہو جاتا ہے اور دوستوں میں بھی جدائی ڈال دیتا ہے۔
☆۔ نام میں کچھ نہیں رکھا، گلاب کے پھول کو کسی بھی نام سے پکار لو، اس کی خوشبو اور رنگت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔
☆۔ سچائی کی بنیادوں پر قائم رہنے والا اعلیٰ ہتھیاروں سے آراستہ ہے اور جس کا ضمیر بے ایمانی کے باعث داغدار ہے، وہ سر سے پاؤں تک ہتھیاروں میں غرق ہو، تب بھی برہنہ ہے۔
☆۔ ہم چھوٹے چوروں کو تو پھانسی دیتے مگر بڑے چوروں کو سلام کرتے ہیں۔ (انتخاب: آمنہ رمضان، عارف والا)

ہندی کہانی

اندھا جب کانوں سے دیکھنے لگے

قدموں کی چاپ

ایک صابر باپ کا تحیّر خیز قصہ، بینائی سے محرومی نے اس کے دماغ کو غیر معمولی طور پر تیز بنا ڈالا

رما کانت

دعوت کے بعد گفتگو کا سلسلہ نجانے کیسے سراغ رسانی کی طرف منتقل ہو گیا۔ دعوت میں شریک ایک صاحب نے ایک ناول کا قصہ سنایا کہ کس طرح ایک سراغ رساں نے برج کے کھیل میں کاغذ پر لکھے جانے والے پوائنٹس سے ایک ہتھیار کا پتا لگا لیا۔ انھوں نے بات ختم کی تو بڑی بڑی مونچھوں اور سفید بالوں والے ایک معمر شخص نے کہا ''جناب سراغ رسانی صرف ناولوں میں نہیں ہوتی۔ میں آپ کو ایک سچا واقعہ سناتا ہوں کہ ایک نابینا آدمی نے ایسا کام کیا جسے بڑے بڑے پولیس افسر اور سراغ رساں بھی حل نہ کر سکے۔''

حاضرین دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ یہ معمر شخص ایک

ریٹائرڈ جج تھے اور جان پہچان کے لوگوں میں کافی تجربے کار سمجھے جاتے۔ انھوں نے بتانا شروع کیا: کافی عرصہ پہلے میں دہلی میں متعین تھا۔ ان دنوں دریبہ کلاں کے پاس ایک موچی رہتا تھا۔ وہ نابینا تھا لیکن اپنے کام میں اتنا ماہر کہ اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کیسا ہی گھسا اور ٹوٹا ہوا جوتا ہو، وہ اسے نئی زندگی بخش دیتا۔ شہر کے تقریباً سبھی رئیس اور افسر لوگ اپنے جوتوں کی مرمت اسی سے کراتے۔ نابینا ہونے سے اس کے کام میں ذرا بھی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ اس کا نام ہینگو تھا۔

وہ کام میں جتنا ماہر تھا، اتنا ہی خوش مزاج بھی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی چیز اس کی خوشی کم نہیں کر سکتی۔ دکان کے پیچھے ہی اس کا گھر تھا۔ روز صبح وہ اپنی دکان پر بیٹھتا تو کچھ گنگناتا رہتا۔ ہمیشہ خوش رہنے کے باعث وہ بڑا صحت مند تھا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس میں بڑھاپے کے آثار ہویدا نہیں تھے۔ اگرچہ بال سفید ہو چکے تھے، لیکن لمبے چوڑے جسم میں غضب کی طاقت تھی۔

اس کی دکان پر عموماً محلے کے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی، گویا وہ لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے اور گپ لڑانے کا اڈا ہو۔ اس سے ہینگو کے کام میں کوئی ہرج نہ ہوتا بلکہ وہ خود بھی ان کی باتوں میں دلچسپی لیتا۔ جو لوگ وہاں آتے، پانی و تمباکو سے ان کی خاطر بھی کرتا۔ اپنی دکان پر بیٹھا ہوا وہ ان کی طرح طرح کی باتیں سنتا اور کام کرتا رہتا۔

یہ بات نہیں کہ اس پر مصیبتیں نہیں پڑیں۔ پہلے تو بھری جوانی میں اس کی آنکھیں چیچک کی نذر ہو گئیں، پھر اس کی بیوی چل بسی۔ اس کے ہاں چار بچے پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی تین یکے بعد دیگرے بچپن ہی میں انتقال کر گئے لیکن اپنی ساری مصیبتوں کے باوجود اس نے جیسے کسی بات پر افسوس کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

ناامیدی گویا اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ جو لوگ ہینگو کی زندگی کے اس پہلو سے واقف تھے، وہ کبھی کبھی اس کی خوش مزاجی دیکھ کر تعجب بھی کرتے۔ لیکن ان سب باتوں سے بے خبر وہ کام میں مشغول رہتا۔ گویا ساری مصیبتیں بھول جانے کا گُر اس کے کام میں تھا۔

اپنی سخت محنت اور محبت کی بدولت اس نے کافی پیسا بھی کما لیا۔ اس کا کوئی خاص خرچ نہیں تھا۔ ارزانی کے زمانے میں بھی وہ روزانہ دس پانچ روپے کما لیا کرتا۔ اسے کوئی بری عادت بھی نہیں تھی۔ وہ نجانے کتنے برسوں سے اسی طرح کمائی کر رہا تھا۔ یہ ایک قدرتی امر تھا کہ اس کے پاس کافی دولت تھی۔

اپنی کمائی کے بل بوتے پر اس نے ایک پختہ ذاتی مکان بنوا لیا۔ دکان بھی اسی مکان کے نچلے حصے میں سڑک کی طرف تھی۔ مکان میں اپنے لڑکے کے ساتھ صرف وہی رہتا تھا، لہٰذا اس کا ایک حصہ کرائے پر دے دیا۔

اس کے چاروں لڑکوں میں سے ایک لڑکا بچا تھا۔ اس کا نام نندن تھا۔ وہ جوان ہو چکا تھا۔ اسے وہ کسی بھی چیز کی کمی نہ ہونے دیتا۔ نندن جو بھی فرمائش کرتا، باپ اُسے پوری کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا۔ وہ کچھ بھی کرتا رہے، ہینگو اسے کچھ نہ کہتا۔ اس سے وہ کام پر بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہتا تھا۔

نندن سے اس کا یہ طرزِ عمل لوگوں کو بڑا ناگوار گزرتا۔ حسد کے باعث نہیں بلکہ وجہ تھی کہ بہت زیادہ لاڈ پیار سے نندن اب آہستہ آہستہ بگڑنے لگا تھا۔ ابھی اسے کوئی خاص بری لت نہیں پڑی تھی لیکن لوگوں کا خیال تھا، اگر اس کا یہی حال رہا تو مستقبل قریب میں وہ بہت خراب ہو جائے گا۔ مگر ہینگو تھا کہ لوگ نندن کے متعلق کچھ بھی کہتے وہ تو جیسے کسی کا یقین ہی نہ کرتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ وہ نابینا تھا اور کچھ نہ دیکھتا لیکن یہ بات غلط ہو گی۔ نابینا ہونے کے باوجود وہ گویا سب کچھ دیکھتا تھا۔ وہ لوگوں کو ان کے قدموں کی آہٹ سے پہچان لیتا۔ اس کی جان پہچان کا کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جو ادھر سے گزرا اور وہ اسے پہچان نہ لے۔ قدموں کی آہٹ ہی سے اپنے لڑکے آنے جانے کا بھی خیال رکھتا۔ گھر میں اوپر جانے کی سیڑھی دکان کی بغل میں تھی۔ نندن جب بھی اس پر چڑھتا اترتا، ہینگو فوراً جان جاتا۔ اور بھی کئی باتوں میں وہ کافی ہوشیار تھا۔ لوگوں کی چال ڈھال کے متعلق بھی وہ بہت جلد سب کچھ سمجھ لیتا۔ اس لیے یہ کہنا کہ نابینا ہونے کے باعث وہ نندن کی حرکتیں دیکھ نہ پایا تھا، سراسر غلط ہو گا۔ اگر وہ سب کچھ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا تھا تو محض اپنی محبت کی وجہ سے۔

''ہینگو دادا! تم نندن کو اتنا زیادہ پیسا ویسا مت دیا کرو، کھلاؤ پلاؤ چاہے جو کچھ۔'' کبھی کبھی لوگ کہتے۔

ہینگو ہنس دیتا' کہتا ''ارے ابھی تو اس کی کھیلنے کھانے کی ہی عمر ہے بھائی! آگے چل کر اپنے آپ سمجھ دار ہو جائے گا۔''

کبھی لوگ کہتے ''اسے اپنے ساتھ کام پر بٹھایا کرو۔ نہیں تو بالکل خراب ہو جائے گا۔''

ہینگو کہتا ''کمانے کے لیے تو میں ہی کافی ہوں۔ اسے بے کار کیوں تکلیف دوں؟ دوسرے، ابھی وہ کمزور ہے۔ کام اس سے نہیں ہو گا۔''

لوگ کہتے ''اسے پڑھاؤ لکھاؤ۔''

تو ہینگو کہتا ''موچی کی ذات ہے۔ پڑھ لکھ کر کیا کرے گا؟''

یہ سب معمول کے جواب تھے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے یہ کہنا چھوڑ دیا کیونکہ ایک تو ہینگو کسی کی بات سنتا نہیں

جناح، گاندھی اور نہرو

ایک بار کسی اخباری رپورٹر نے گاندھی سے پوچھا: ''آپ کی پالیسی کیا ہے؟''

گاندھی نے اپنی پالیسی پانچ مختصر فقروں میں بیان کر دی۔ رپورٹر نے جب ان پر تنقیدی نظر ڈالی، تو معلوم ہوا ہر فقرہ دوسرے کی تردید کرتا ہے۔ اسی طرح پنڈت نہرو کے لکھنے اور بولنے کا ایک خاص انداز تھا۔ اس میں صداقت تو ضرور ہوتی لیکن وہ اس صداقت سے فرار کی کوئی نہ کوئی راہ رکھ لیتا۔

اس کے برعکس جناح کا جواب دوٹوک، واضح اور برمحل ہوتا اور سننے والا اس سے مطمئن ہو جاتا۔

(لیونارڈ موسلے)

تھا۔ دوسرے لوگ اب محسوس کرنے لگے تھے کہ نندن کے بارے میں کچھ کہنے سے ہینگو کو کوفت ہوتی ہے۔

نندن کے بارے میں اسی انداز کی شکایت ہینگو کے کرائے دار، گوپی بابو بھی کیا کرتے۔ انھیں گویا اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ ان کی شکایت کا ہینگو پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ ایک ہونہار نوجوان تھے اور دہلی کے سرکاری خزانے میں نوکری کرتے۔ گوپی بابو کبھی ہینگو کی دکان پر نہ بیٹھتے۔ ہینگو کی ان سے جو گفتگو بھی ہوتی، وہ آتے جاتے انجام پاتی۔ دفتر جاتے اور وہاں سے آتے ہوئے ہینگو ان کے قدموں کی آہٹ سے انھیں پہچان لیتا۔ قریب آتے ہی سلام بندگی کے بعد ان سے دو چار منٹ بات کر لیتا۔ نندن کے بارے میں گوپی بابو جو کچھ کہتے، وہ اسی مختصر سی گفتگو میں کہا جاتا۔

گوپی بابو کے متعلق ہینگو دو طرح کی رائے رکھتا تھا۔ ایک تو وہ سرکاری ملازمت میں تھے، اس لیے ان کی

کافی قدر کرتا۔ لیکن ان میں اُسے کچھ ایسی بات بھی محسوس ہوتی جو اسے اچھی نہ لگتی۔ خاص طور پر جب وہ نندن کی شکایت کرتے تو ان کی باتیں اسے بالکل پسند نہ آتیں۔

ایک دن گوپی بابو نے نندن کی شکایت خاص طور پر کی۔ وہ خزانے سے لوٹ کر آئے تھے۔ شام ہو گئی تھی اور دکان پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اوپر جانے کے بجائے وہ سیدھا ہینگو کی دکان میں آئے اور کہنے لگے ''آج اکیلے ہو، اس لیے تمھیں خاص طور پر ایک ضروری مشورہ دے رہا ہوں''۔

ہینگو سمجھ گیا کہ ان کا مشورہ کیا ہو گا لیکن وہ خاموش رہا۔ گوپی بابو نے کہا ''کیا تم نے بھی طے کر لیا ہے کہ نندن کو اپنا ہنر نہیں سکھاؤ گے؟''

ہینگو کو ان کے لہجے سے یوں محسوس ہوا جیسے آج اس بات کی تہ میں کوئی اور بات ہے۔ پھر بھی اس نے معمول کے مطابق جواب دیا۔ ''ابھی وہ چھوٹا ہے۔ اس سے کام نہیں ہو گا۔ پھر وہ کام کر کے کیا کرے گا؟ کمانے کے لیے تو میں ہی کافی ہوں''۔

''مگر جب تم نہیں رہو گے تو؟'' گوپی بابو نے کہا ''کوئی امیر بن کر تو آتا نہیں''۔

''جب کی بات جب دیکھی جائے گی۔ وہ خود کچھ سوچے گا۔ ویسے کچھ بھی نہ کرے تو میں کما کر کافی دولت چھوڑ جاؤں گا''۔ ہینگو نے کہا۔

''میں صرف کمانے کے لحاظ سے نہیں کہہ رہا''۔ گوپی بابو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بیکار بیٹھنے سے کچھ کرتے رہنا اچھا ہے۔ تم اگر نہ کماؤ تو تمھیں کوئی کمی ہو جائے گی؟ مگر تم کام کرتے ہو۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ نندن کو کام سکھاؤ۔ وہ بالکل نکما اور آوارہ ہو رہا ہے''۔

ہینگو سے اس بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ گویا وہ ہکا بکا رہ گیا۔ لوگوں نے نندن کو کام وام سکھانے کا مشورہ ضرور دیا تھا لیکن ابھی تک کسی نے اسے نکما اور آوارہ نہیں کہا تھا۔ کم از کم اس کے منہ پر تو کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لوگوں نے زیادہ سے زیادہ ڈرایا تھا کہ لڑکا بگڑ سکتا ہے۔ اندر ہی اندر اس کا خون کھول اٹھا لیکن اوپر سے وہ پہلے ہی کی طرح سنجیدہ تھا۔

اسی وقت اس کے حساس کانوں کو احساس ہوا کہ نندن دکان کے باہر آ کھڑا ہوا ہے۔ کہیں نندن نے اپنے متعلق گوپی بابو کی باتیں نہ سن لی ہوں؟ ہینگو کو اس خیال سے اور تکلیف ہوئی لیکن وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد، جیسے بہت سوچ کر اس نے کہا ''خیر آپ جو چاہے کہیں، نندن بہت اچھا لڑکا ہے۔'' یہ بات اس نے کافی زور سے کہی تا کہ نندن بھی اسے سن لے۔ وہ اپنی طرف سے بیٹے کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔

''خیر میرا جو فرض تھا، میں نے پورا کر دیا۔'' گوپی بابو نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت کوئی وزنی چیز جھنجھنا کے نیچے گری۔ ہینگو جھنجھناہٹ سے سمجھ گیا کہ وہ چاندی کے روپوں سے بھری تھیلی ہے۔ ان دنوں زیادہ نوٹ نہیں چلتے تھے بلکہ ملکہ وکٹوریا اور جارج پنجم والے سکے رائج تھے۔

اچانک خوف سے ہینگو کانپ اٹھا۔ اس کے ضمیر نے کہا کہ یہاں روپوں کی تھیلی گرنا اچھا نہیں۔ باہر نندن کھڑا تھا اور ہینگو جانتا تھا کہ وہ اچھا لڑکا ہے مگر تھوڑی دیر پہلے گوپی بابو کی باتوں سے جیسے بیٹے کی طرف سے اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا تھا۔ اپنے ہی بیٹے پر بے اعتمادی اس کے لیے اور بھی تکلیف دہ تھی۔ آج تک جس بیٹے کو وہ سب کے سامنے اچھا کہتا آیا تھا اور جسے وہ خود بھی اچھا

سمجھتا تھا، اس پر شک کرنے کی اسے خواہش ہی نہیں تھی لیکن نجانے کیسے ایک خوف سا تھا جس سے وہ سہم گیا۔

گوپی بابو نے تھیلی اٹھاتے ہوئے کہا ''سرکاری روپیہ ہے سب۔ آج خزانچی صاحب کو کچھ جلدی تھی اور وہ یہ رقم گن نہیں سکے۔ اس لیے خزانے میں جمع نہیں ہو سکی۔ میں نے سوچا کہ اسے اپنے ساتھ ہی لے چلتا ہوں، کل جمع کرادوں گا۔''

''مگر آپ نے یہاں روپیہ لا کر اچھا نہیں کیا گوپی بابو! جہاں کا روپیہ ہے، وہیں رہنا چاہیے۔'' ہینگو نے کچھ رکھائی اور شک کے لہجے میں کہا۔

''ہاں! مگر روپے پیسے کا معاملہ ہے نا' جب تک پوری طرح گن کر رجسٹر میں درج نہ کر لیا جائے، اس وقت تک اسے یوں ہی رکھ دینا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ اچھا ہی ہے کہ یہاں اور کوئی نہیں ہے اور تم سے کسی طرح کا خدشہ نہیں ہوسکتا، یہ میں جانتا ہوں۔''

''نہیں گوپی بابو! آدمی کی نیت کا کیا ٹھکانا؟'' جس خوف سے وہ سہما تھا، اسی سے متحرک ہو کر اس نے کہا۔

گوپی بابو ہنس کر کہنے لگے۔ ''ارے بھائی، ایک ایماندار دوسرے ایمان دار آدمی کو پہچانتا ہے۔ پھر یہ کوئی پہلا موقع تو ہے نہیں! آج تو اتفاق تھا کہ میں یہاں آیا اور روپوں کی تھیلی فرش پر گرنے سے تمھیں معلوم ہو گیا، ورنہ کئی بار ایسا ہو چکا۔'' اور وہ تھیلی لے کر چلے گئے۔

اس رات ہینگو کو کھانا اچھا نہیں لگا۔ اچانک وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ رہ رہ کر وہ گوپی بابو کے سرکاری روپے اور اپنے بیٹے نندن کے متعلق سوچ کر پریشان ہو اٹھتا۔ نندن اور وہ جب ساتھ ساتھ کھانا کھانے بیٹھے تو وہ بے نور آنکھوں سے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا، گویا اس کے کھانے کے انداز اور سانس لینے کی آواز ہی سے وہ اس کے دل کی بات جان لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب نندن کھانا کھا چکا تو اس نے کہا ''بیٹا نندن! مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے۔ تو بہت اچھا لڑکا ہے۔'' اس کا لہجہ یقین، امید اور پیار سے بھرا تھا۔

پھر اس نے سوچا کہ شاید نندن کو روپوں کی ضرورت ہو۔ اپنی جیب سے اس نے دس دس کے پانچ نوٹ نکالے اور کہا ''لو بیٹا یہ روپے لے لو اور جاؤ کہیں گھوم پھر آؤ۔''

نندن نے روپے لے لیے مگر کہیں گھومنے نہیں گیا۔ کھانا کھا کر اس نے بتایا کہ اسے نیند آ رہی ہے اور پھر اوپر اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔ ہینگو دکان ہی میں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی کیونکہ وہ بے چین سا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دکان کے ٹھیک اوپر والے کمرے میں، جو نندن کا کمرا تھا، اس نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ یہ نندن ہی کے قدموں کی آہٹ تھی' جیسے وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہو۔ اس کے قدم کبھی کمرے کے ایک کونے سے دوسرے تک جاتے کبھی کمرے کے چاروں طرف گھومتے، کبھی رک جاتے اور تھوڑی دیر بعد پھر چلنے لگتے۔

ہینگو نے سوچا کہ جا کر پوچھے کیا بات ہے؟ لیکن پھر وہ بے حواس سا ہو کر گویا وہ بڑا ضعیف ہو گیا ہو' دکان ہی میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ شاید یہ جاننے کی خواہش نے کہ دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے؟ اسے اُٹھنے نہیں دیا۔ اسی وقت مکان کے دوسرے حصے میں، جدھر گوپی بابو رہتے تھے' اس نے ان کے قدموں کی آہٹ سنی۔ گوپی بابو اپنے کمرے سے نکل کر دالان تک آئے اور وہیں سے انھوں نے پکارا ''ارے نندن! نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟ مجھے بھی نہیں آ رہی۔ تاش کھیلا جائے تو کیسا رہے؟''

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔" نندن نے کمرے کے اندر ہی سے کہا۔

"تو پھر آجاؤ۔" گوپی بابو نے کہا۔

"آتا ہوں۔" نندن نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد بینگو نے سنا کہ نندن کے قدم گوپی بابو کے کمرے کی طرف گئے۔ پھر ان کے کمرے کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز کانوں میں پڑی۔ نجانے دروازہ بند ہونے کی آواز میں کیا تھا کہ بینگو بے چین ہو اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ دروازہ زور زور سے کھٹکھٹائے مگر اس دفعہ بھی وہ اٹھ نہ سکا بلکہ پہلے ہی کی طرح بت بنا بیٹھا رہا۔ اس کی اندھی آنکھیں گویا اندھیرے میں کچھ دیکھتی رہیں۔

شہر کے کسی گھڑیال نے دس کا گھنٹا بجایا تو اسے پھر گوپی بابو کے کمرے میں عجیب طرح کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے بعد بہت آہستہ آہستہ کسی کے نامعلوم قدم بغل والی سیڑھی سے نیچے اترے پھر اسی طرح دکان کے کونے تک آئے۔ پھر دوسری طرف مڑ کر گویا بہت تیزی سے غائب ہوگئے۔

ہوا کچھ تیز ہوگئی تھی اس لیے یہ پہچاننے میں کچھ دقت ہوئی کہ وہ قدم کس کے تھے؟ لیکن اسے یقین تھا کہ جو آہٹ اس نے سنی تھی، اس کے متعلق اسے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ دکان سے اٹھ کے باہر آیا اور چاہا کہ جو جا رہا ہے، اسے آواز دے۔ لیکن ایک تو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا، دوسرے قدموں کی آہٹ بہت غور لگا کر بھی سننے میں نہیں آئی۔ اس لیے وہ پھر دکان میں آ کر بیٹھ گیا اور اوپر کی آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ چونکہ ہوا بہت تیز تھی اور دکان سے مخالف سمت میں چل رہی تھی، اس لیے کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ پھر بھی اتنا وہ

بیٹی سے علیحدگی

قائداعظم کو اولاد کا سکھ اس لیے دیکھنا نصیب نہ ہوا کہ ماں کے انتقال کے بعد صاحبزادی ہمیشہ نانی کے ساتھ رہیں۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے بعد اُن کا مذہب بھی اختیار کرلیا۔ باپ کی بڑی خواہش تھی کہ بیٹی عقد کسی مسلم نوجوان کے ساتھ ہو مگر جب بیٹی نے بمبئی کے ایک پارسی نوجوان نیول واڈیا سے شادی کر لی، تو انھیں سخت ذہنی کوفت ہوئی۔ اُن کے قانونی اور مذہبی دماغ نے فوراً اس کا حل تلاش کرلیا۔ شرع کے مطابق اپنی اکلوتی بیٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ جب قائد فوت ہوگئے، تب بیٹی کو اطلاع ملی۔

(نواب صدیق علی خان)

سمجھ گیا کہ کہ اوپر گہرا سناٹا چھا گیا ہے۔ اتنے میں کسی کے زور زور سے چلانے کی آواز آئی۔ "آگ! آگ!"

پھر اور بھی بہت سی آوازیں آنے لگیں۔ "آگ! آگ! آگ!"

کافی دیر بعد بینگو کی سمجھ میں آیا کہ آگ اسی کے مکان میں لگی ہے۔ تیز ہوا کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے آگ سارے گھر میں پھیل گئی اور اوپر کا سارا حصہ بھڑک کر جل اٹھا۔

صبح جب فائر بریگیڈ والوں نے آگ اچھی طرح بجھا دی تو پولیس کو ملبے میں سے ایک لاش ملی۔ لاش بری طرح جل چکی تھی۔ تاہم کپڑوں کے بچے کھچے حصوں سے لوگوں نے پہچان لیا کہ وہ لاش گوپی بابو کی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کپڑے پہن کر بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے مگر بھاگ نہیں سکے۔ پیچھے سے جیسے کسی نے ان کے سر پر کسی وزنی لوہے سے وار کیا جس سے

کھوپڑی چکنا چور ہو گئی۔ نندن کا کہیں پتا نہیں تھا۔ نہ تو اس کی لاش ملی، نہ وہ خود کہیں ملا۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ نندن ہی گوپی بابو کا خون کر کے بھاگ گیا۔ لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ شک پیدا ہوا مگر اس کے بعد جلد ہی جب خزانے کا روپیہ غائب ہونے کی خبر پھیلی تو ساری بات لوگوں کو سمجھ میں آ گئی۔

بینگو جیسے ایک دم بہت کمزور ہو گیا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم گویا ٹوٹ گیا۔ وہ نڈھال ہو کر دکان میں بیٹھا تھا جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ ''کیا تمھیں معلوم تھا کہ گوپی بابو خزانے کا روپیہ لائے ہیں؟'' لوگوں نے اس سے دریافت کیا۔ بینگو کچھ نہ بولا۔ صرف اقرار میں سر ہلا دیا۔

''کیا نندن کو بھی معلوم تھا؟''

بینگو ناواقف تھا کہ نندن کو معلوم تھا یا نہیں؟ مگر پہلے کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔ لوگ اس واقعے کا سارا الزام بینگو کو دینے لگے کہ اگر وہ لڑکے کے ساتھ نرمی سے پیش نہ آتا تو یہ نوبت نہیں آتی۔ اگر اس نے لوگوں کے مشورے پر توجہ دی ہوتی اور وہ بیٹے کی حرکتوں پر کڑی نظر رکھتا تو نندن ایسی بری حرکت نہ کرتا۔

بینگو چپ چاپ بیٹھا سب کچھ سنتا رہا۔ آخر عاجز آ گیا تو چلا کر بولا ''یہ سب نندن نہیں کیا۔ میں کسی دن یہ ثابت کر دوں گا کہ میرا بیٹا چور اور خونی نہیں تھا۔'' پھر جس طرح اس کے سامنے واقعہ پیش آیا تھا، اس نے من و عن بیان کر دیا...... کہ کس طرح گوپی بابو آئے اور اس کے بیٹے کو شکایت کرنے لگے، پھر کیسے ان کی روپوں والی تھیلی گر پڑی، کیسے نندن نے روپیہ گرنے کی آواز سن لی ہو گی۔ پھر کب گوپی بابو نے نندن کو تاش کھیلنے کی دعوت دی اور اس کے بعد کیسے آہستہ آہستہ کوئی سیڑھیاں اتر کر وہاں سے چلا گیا۔

''اس سے تو پوری طرح یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نندن کی حرکت ہے اور وہی روپیہ لے کر بھاگ گیا۔ کوئی تیسرا آدمی تو آیا ہی نہیں۔'' لوگوں نے کہا۔

''نہیں نہیں!'' بینگو پھر چلایا۔ ''نندن نے ایسا نہیں کیا، میں خوب جانتا ہوں۔''

''پھر کس نے کیا؟''

''یہ میں ابھی نہیں جانتا۔ ابھی کیسے کہہ دوں؟ لیکن دیکھ لینا' کبھی نہ کبھی مجرم یہاں آئے گا۔'' بینگو نے گویا بڑی خود اعتمادی سے کہا۔

پولیس سے بھی اس نے یہی کہا۔ ''میرا سب کچھ گیا، میرا مکان، میرا آخری بیٹا اور میری عزت! اب مجھ میں زندہ رہنے کی خواہش نہیں۔ لیکن میں زندہ رہوں گا اور کسی نہ کسی دن بتا دوں گا کہ یہ سب کس نے کیا؟''

لوگوں نے سوچا' بیٹے کی حرکت سے اسے جو صدمہ پہنچا ہے، اس سے وہ پاگل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ پولیس جب نندن کو گرفتار کر کے لائے گی تو اسے ساری بات کا پتا چلے گا۔

لیکن پولیس نندن کو گرفتار نہ کر سکی۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدل گئے لیکن قاتل گرفتار نہ کیا جا سکا۔ آخر پولیس نے تھک ہار کے معاملہ داخل دفتر کر دیا۔ لیکن بینگو کو چین نہیں پڑا۔ اس کا یہ یقین ابھی تک قائم تھا کہ جس نے یہ حرکت کی تھی، وہ کسی دن ضرور آئے گا۔ وہ ہمیشہ اپنی دکان پر بیٹھا گویا اس کا انتظار کرتا رہتا۔

اب وہ کافی بدل گیا تھا۔ مکان جلنے کے بعد لے دے کے یہی نیچے کا حصہ بچا تھا، جس میں دکان تھی۔ جو حصہ جل گیا، بینگو نے اس کی مرمت نہیں کرائی۔ اس کی آمدنی بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ دکان پر لوگوں کا اٹھنا

بیٹھنا بھی ختم ہو گیا۔ شروع میں کچھ لوگ آئے اور پہلے کی طرح گپ شپ کرنے کی کوشش کی لیکن ہینگو نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ گویا پتھر کا بت بن گیا تھا۔ نہ کہیں آتا جاتا، نہ کسی سے زیادہ بولتا۔ کچھ کام ہوتا تو اسے نمٹا دیتا، ورنہ چپ چاپ بیٹھا جیسے کسی کا انتظار کرتا رہتا۔ اس کے کان ہر وقت کسی آہٹ پر لگے رہتے۔ رات دن، جاڑا، گرمی، برسات، ہمیشہ وہ اسی طرح بیٹھا رہتا۔ سوتا بھی تو معمولی سی آہٹ پر چونک کر اٹھ بیٹھتا۔

رفتہ رفتہ تین سال گزر گئے مگر ہینگو کو جس کا انتظار تھا، وہ نہیں آیا۔ اب اسے بھی کبھی کبھی شک سا ہونے لگتا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں سمجھا؟ کبھی وہ سوچنے لگتا کہ اس کے کان ہی تو اسے دھوکا نہیں دے رہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ آ کر چلا گیا اور اسے خبر ہی نہ ہوئی؟ پھر کیا معلوم کہ جو آئے گا، وہ وہی ہو جس کا اسے انتظار ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے وہم نہیں؟ لیکن ان شبہات کے باوجود اس کا انتظار جاری رہا۔ وہ حسب معمول بت بنا ہر وقت اپنی دکان پر بیٹھا کان آنے جانے والوں کی آہٹ پر لگائے رکھتا۔

جاڑے کے دنوں کی ایک سرد شام تھی۔ سڑک پر بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ اپنی دکان کی ٹمٹماتی روشنی میں بوڑھا ہینگو ویسے ہی بیٹھا تھا۔ اچانک وہ چونک پڑا۔ سڑک پر کچھ لوگ گزر رہے تھے اور انہی میں اس نے کسی کے قدموں کی ایسی آہٹ سنی جو اس کی جانی پہچانی تھی۔ پھر وہ آہٹ دکان کے سامنے آ کر رک گئی۔ ہینگو کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس کا سارا جسم جیسے جھنجھنا اٹھا۔ اپنے آپ کو روکے رکھنا گویا ناممکن ہو گیا۔ بڑے ضبط سے اس نے دریافت کیا۔ ’’آپ کو کیا چاہیے؟‘‘

’’کوئی خاص بات نہیں۔‘‘ اس آدمی نے کہا۔

آواز شنا سا معلوم نہیں ہوئی‘ جیسے اس میں کچھ تھکاوٹ تھی۔ ہینگو چکر میں پڑ گیا لیکن اس نے دوبارہ گویا اس آدمی کو آزمانے کے لیے کہا ’’مجھے ٹھیک سے سنائی نہیں دیتا۔ آپ دکان کے اندر آ جائیں اور میرے پاس آ کر کچھ کہیں تو میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں۔‘‘

وہ آدمی دکان کے اندر آ گیا۔ لیکن اندر آ کے وہ گویا ہچکچانے لگا۔ اس کی آواز میں بدحواسی تھی۔ وہ کہنے لگا ’’میں یوں ہی دیکھ رہا تھا۔ اپنے ایک جوڑے کی مرمت کرانی ہے۔ تم جوتا ہی بناتے ہو نا؟‘‘

ہینگو نے اثبات میں سر ہلایا مگر اس آدمی کی بات پر نہیں‘ اسے تو اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ اس نے جو سنا وہ تھی اس کے قدموں کی آہٹ، جسے اس نے فوراً پہچان لیا۔ وہ آدمی پھر بولا ’’لیکن میں اس وقت جوتا نہیں لایا۔ جب کہو، لا کر تمھیں دے دوں۔‘‘ اس کی آواز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جلدی میں ہے اور وہاں سے ایک دم کھسک جانا چاہتا ہے۔

’’رکیے ذرا!‘‘ ہینگو نے کہا۔ اسی وقت اس نے ایک کیل کے سہارے لٹکتی رسی کھینچ دی۔ دکان کا پھاٹک زوردار جھٹکے سے بند ہو گیا۔ ہینگو نے یہ انتظام اسی موقع کے لیے کر رکھا تھا اور پہلے ہی اس کی خوب مشق بھی کر لی تھی۔ اس کے فوراً بعد بتی بھی بجھا دی۔ دکان میں گہری تاریکی چھا گئی۔ کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی گویا اس نے سانس روک لی تھی۔ اس وقت ہینگو کی حالت اس شیر جیسی تھی جو اپنا شکار سامنے پا کر جھپٹنا ہی چاہتا ہو۔ اس آدمی میں شاید ملنے جلنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ اچانک اس کے سانس لینے کی آواز سنائی دی، مگر وہ بہت بھاری تھی گویا وہ بڑی دشواری سے سانس لے رہا تھا۔ ہینگو ایک باز کی طرح اس پر جھپٹ پڑا اور ایک تیز چیخ دکان میں گونج گئی۔

چیخ سن کر باہر سڑک پر کچھ لوگ رک گئے۔ دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانے پر بھی نہ کھلا تو کئی آدمیوں نے مل کر

پوری طاقت سے اسے دھکیلا۔ اس کی اندرونی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ اندر ہینگو کھڑا ہانپ رہا تھا اور اس کے قدموں میں کسی کی لاش پڑی تھی۔ اس آدمی کی گردن جیسے کسی کی مضبوط گرفت سے ٹوٹ گئی تھی۔ ہینگو نے وہاں جمع ہونے والے لوگوں سے کہا "اسے دیکھ کر بتاؤ کہ یہ وہی کتا ہے نا جسے تم لوگ اتنے عرصے سے تلاش کر رہے تھے؟"

"کون، نندن؟" لوگوں نے پوچھا۔

"نہیں نہیں، نندن تو بہت اچھا لڑکا تھا۔ یہ وہ ظالم ہے جس نے میرے بیٹے کا خون کیا۔" ہینگو نے جوش کے عالم میں کہا۔ لوگ حیرت کے مارے بت بن گئے۔ ہینگو نے کہا "یہ گوپی بابو ہیں۔ لوگ غلط سمجھتے تھے! نندن گوپی بابو کا خون کر کے نہیں بھاگا بلکہ ساری جعل سازی انہی کی تھی۔ انھوں نے میرے بیٹے کا خون کر کے اسے اپنے کپڑے پہنائے اور پھر خزانے کا روپیہ لے کر بھاگ اُٹھے۔ اس طرح یہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ میری آنکھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ میرے کان تو سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ میں اسی دن سے سب کچھ جانتا تھا جب میرے مکان میں آگ لگی۔ سیڑھی سے جو قدم نیچے اتر کر دوسری طرف چلے گئے، وہ انھی کے قدم تھے۔ جس وقت یہ جانے لگے، میں دکان سے باہر آیا اور انھیں بلانا چاہا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے میرے بیٹے کا خون کر دیا ہے اور میرے گھر میں آگ لگا دی ہے ورنہ میں تم میں سے کسی کو دوڑا کر انھیں پکڑوا لیتا۔"

"لیکن تم نے بعد میں کیوں نہیں بتایا، یہ سب کچھ؟" وہاں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ اوّل تو کوئی میری بات کا یقین نہ کرتا۔ دوسرے گوپی کو پتا چل جاتا تو وہ پھر کبھی یہاں نہ آتا۔ پولیس میری بات درست نہ سمجھتے ہوئے اسے تلاش نہیں کرتی۔ یوں گوپی مطمئن ہو جاتا۔" ہینگو نے بتایا۔

"قانونی کارروائی کے لیے یہ معاملہ عدالت میں لایا گیا۔" معمر شخص نے اپنی کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔ "مگر عدالت نے ہینگو کو سزا نہیں دی۔ اسے چھوڑ دیا گیا۔"

لوگوں نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا تو انھوں نے بتایا "دراصل یہ مقدمہ میری ہی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ میں نے ہینگو کو اس لیے بری کر دیا کہ کہیں لوگ قانون کو بھی اندھا نہ کہنے لگیں۔"

◆●●

یونینسٹ پارٹی کا چراغ گُل

دوسری بار میں نے حضرت قائداعظم کو ۱۹۳۷ء میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر دیکھا۔ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کے لیے تشریف لائے کیونکہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ملک میں نئے انتخابات ہونے والے تھے۔ مادرِ ملت مس فاطمہ جناح اُن کے ہمراہ تھیں۔ قائداعظم بمبئی سے تشریف لائے۔ بمبئی میل رات کے ساڑھے آٹھ بجے لاہور پہنچتی تھی۔ قائداعظم کا استقبال کرنے آئے ہوئے لیڈر بمبئی میل کے اُس ڈبے کی طرف بڑھے جس میں قائداعظم سفر کر رہے تھے۔ میرے والد مرحوم (ملک برکت علی ایڈووکیٹ) نے آگے بڑھ کر ڈبے کا دروازہ کھولا۔ پہلے مادرِ ملت فاطمہ جناح برآمد ہوئیں اور ان کے بعد بابائے قوم ڈبے سے اترے۔ عین اس وقت جب انھوں نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا ریلوے اسٹیشن کی بتی چلی گئی۔ نجانے محض اتفاقیہ گل ہوئی یا کسی نے شرارت کی تھی۔ اسٹیشن پر اندھیرا چھا گیا۔ ہم سب گھبرا گئے۔ لیکن قائداعظم کی شیر کی گرج جیسی آواز میں یہ الفاظ ہمارے کانوں میں پڑے: "دیکھا! لاہور میں میرے قدم رکھتے ہی یونینسٹ پارٹی کا چراغ گل ہو گیا۔" (ملک افتخار علی)

جب جج سائیکل چلاتے تھے

اس سنہرے دور کا ذکر خیر جب سرکاری افسر خود اعتماد تھے، دھڑلے سے جائز کام کرتے اور ناجائز پرے مار دیتے

راؤ منظر حیات

اگر ہم اپنے ملک کو ایک بحری جہاز سمجھیں، اس کے بعد پچھلی چھ سے سات دہائیوں پر نظر دوڑائیں تو لگتا ہے کہ بحری جہاز کسی بھی سمت سفر نہیں کر رہا۔ وجہ یہی کہ اس بیڑے کا کوئی بے لوث کپتان ہی نہیں، ہم صرف دائروں میں مسلسل چکر کاٹ رہے ہیں۔

آپ ملک بننے سے پہلے کے قائدین کی تقاریر سنیں تو آپ کو دکھ ہوگا، ہم اب تک ایک بھی مقصد پورا نہیں کر پائے۔ آپ قائداعظمؒ کے افکار پڑھیے اور آج کا پاکستان دیکھیے۔ آپ کو لگے گا کہ ہمارے عظیم قائد شاید کسی اور پاکستان کی بات کر رہے تھے! اس ملک نے سوائے سرکاری دفتروں میں ان کی تصویر لگانے کے کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔

ہم نے بتدریج اپنے ہر ادارے کو بے توقیر اور بے عزت کر ڈالا۔ یہ ناممکن کام ہم نے آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طریقے سے انجام دیا۔ لگتا ہے کہ انتہائی مہارت رکھنے والے لوگوں نے خاص منصوبہ بندی کے تحت ہمیں اس حال تک پہنچا دیا۔ آپ کسی ادارے کی مثال لیجیے۔ اس کو پچاس سال پہلے کے تناظر سے دیکھیے اور اب اسے دوبارہ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو زمین آسمان نہیں بلکہ قیامت کا فرق نظر آئے گا۔

کچھ چیزیں تو میرے سامنے برباد ہوئی ہیں۔ مجھے

دو ہفتے پہلے ایک سیشن جج ملے۔ وہ لاہور کے نزدیک کسی ضلع میں کام کر رہے ہیں۔ مجھے بتانے لگے کہ چالیس برس پہلے جو عزت ایک سول جج کی ہوتی تھی، آج وہ ہائیکورٹ کے جج کو بھی میسر نہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ میں نے عدلیہ کا بگاڑ اپنی نظروں کے سامنے دیکھا ہے۔

۱۹۷۴ء میں وحدت کالونی، ملتان سے اکثر جج سائیکل پر دفتر جایا کرتے۔ مجھے یاد ہے، وہاں آٹھ یا نو سول جج اور ایڈیشنل سیشن جج صاحبان سرکاری رہائش گاہوں میں قیام پذیر تھے۔ ان میں سے صرف ایک جج صاحب کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ ایک جج کے پاس انتہائی پرانا نیلے رنگ کا اسکوٹر تھا۔ وہ سارے مل جل کر دفتر جاتے۔ میں نے سیشن جج ملتان کو کئی بار سائیکل پر دفتر آتے ہوئے دیکھا۔ مگر ان کی عزت اس قدر تھی کہ لوگ احترام میں نگاہیں نیچی کر لیتے یا ساکت کھڑے ہو جاتے۔ ہائیکورٹ کے جج کا تو خیر شکل اور نام تک سے بھی کوئی واقف نہیں ہوتا۔ ان میں سے اکثریت انتہائی سادگی سے زندگی گزارتے تھے۔

مجھے جسٹس سردار محمد ڈوگر کا سرکاری گھر اچھی طرح یاد ہے۔ وہ دیسی موڑھوں پر شام کو بیٹھ جاتے۔ اول تو کوئی مہمان آتا نہیں تھا۔ اگر آئے تو بے انتہا سادہ چائے سے تواضع کی جاتی۔ ان کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع مجھے صرف اس لیے ملا کہ وہ میرے والد کے دوست تھے۔ ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ میں نے ان کی بچیوں کی شادی میں شائستگی اور سادگی پائی۔ دراصل ان لوگوں کے لیے پیسا بالکل اہم نہیں تھا۔ ان کے نزدیک زندگی میں ایک چیز انمول تھی...... شخصی عزت! اب کیا حالات ہیں، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں!

آپ انتظامیہ کی جانب نظر دوڑائیے۔ یقین نہیں آتا کہ واقعی ان میں سے اکثریت حقیقت میں افسر ہیں؟ میں جونیئر لیول کے افسروں کی تو بات ہی نہیں کر رہا۔ آپ سینئر لوگوں پر غور فرمائیے! بگاڑ اس حد تک نظر آئے گا کہ آپ خوف زدہ ہو جائیں گے۔ کیا آج کا ڈپٹی کمشنر، کمشنر، سیکرٹری کسی بھی طریقے سے چالیس پچاس برس پہلے کے افسروں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اس زمانے میں خود اعتمادی، جائز کام کو دھڑلے سے کرنے کی ہمت اور ناجائز کام کو مضبوطی سے انکار کرنے کی استطاعت بیشتر سرکاری افسروں کا طرہ امتیاز تھا۔

صاحب اب کیا ہے! ایک دربار لگا ہے اور مصاحبین کی لمبی قطار! اور خوشامد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دوڑ! شاید آپ کو یقین نہ آئے، میں نے صوبے کے ایک انتہائی سینئر افسر کو وزیراعلیٰ کے دربار میں اتنی عاجزی سے باتیں کرتا دیکھا کہ حیران رہ گیا۔ وہ وزیراعلیٰ کو ''سر'' نہیں بلکہ ''جناب قائد'' اور ''قائد محترم'' کے لقب سے مخاطب کر رہا تھا۔ باہر آ کر وہی افسر اپنے جونیئر افسروں کے لیے عذاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ بیوروکریسی کا ادارہ اب صرف ایک کام کر سکتا ہے اور وہ ہے حاکم وقت کی ''مسلسل خوشامد۔'' یہ بگاڑ کیسے آیا اور کیوں آیا! اس کی وجوہ تلاش کرنے کے لیے طویل مدت درکار ہے۔

آپ سینئر افسروں کو چھوڑ دیجیے۔ میں نے ایسے مضبوط انتظامی ضلع افسر دیکھے ہیں کہ خواب لگتا ہے۔ مجال نہیں تھی کہ عوام کو اس نرخ پر چیزیں فروخت نہ کی جائیں جو ضلع انتظامیہ نے مقرر کیے ہوں۔ میں نے ایسے مجسٹریٹ بھی دیکھے ہیں کہ جن کے بازار میں قدم رکھنے سے پہلے تجاوزات خود بخود ختم ہو جاتی تھیں۔ مگر اب یہ

صرف کہانیاں بلکہ الف لیلیٰ کی داستان معلوم ہوتی ہیں۔

آپ سیاستدانوں کو دیکھیے ۔ تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود آج سے چار یا پانچ دہائیوں قبل کے ایم پی اے اور ایم این اے اپنی جائیداد فروخت کر کے الیکشن لڑا کرتے تھے۔ ایک نواب زادہ ظفر اللہ خان کیا، ہر ضلع ہی میں اکثر ایسے لوگ تھے جو الیکشن سے پہلے یا تو ذاتی حیثیت میں قرضہ لیتے یا اپنی زمین جائیداد فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ آپ چودھری محمد علی، غلام محمد، سکندر مرزا، ذوالفقار علی بھٹو سے لاکھ اختلاف کریں۔ ان کے سیاسی فیصلوں پر بھرپور تنقید کریں۔ مگر آپ غور کیجیے کہ ان میں سے کوئی بھی معاشی طور پر کرپٹ نہیں تھا! مجھے شیخ منظور الٰہی صاحب نے بتایا کہ چودھری محمد علی وزیراعظم ہاؤس کی بتیاں خود اپنے ہاتھ سے بند کر کے سوتے تھے۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ سب کچھ دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد بھی میں بالکل مایوس نہیں۔ بلکہ اب آہستہ آہستہ پرامید ہوتا جا رہا ہوں کہ ہمارے ملک کے حالات بہتری کی طرف جائیں گے۔ مجھے عام آدمی کے انفرادی شعور میں مثبت تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہم ابھی زندہ ہیں۔ ہمارے پاس اچھے افسر ہر سطح پر موجود ہیں۔ ایماندار اور اہلیت والے جج بھی ہیں۔ حتیٰ کہ سیاست کے میدان کارزار میں بھی سنجیدہ اور اچھی شہرت والے لوگ موجود ہیں۔

یہ درست ہے کہ ان کا تناسب اپنے اپنے شعبے میں انتہائی کم ہے مگر یہ کسی بھی ملک کا (Critical Human Mass) کہلانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ میرے پاس یہ موقف ثابت کرنے کے لیے بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مگر میں مناسب نہیں سمجھتا کہ نام لے کر کسی کے متعلق بات کروں۔ ایک چھوٹی سی سچائی عرض کروں۔ میرا ایک قریبی عزیز گزشتہ سات سال سے سرکاری جماعت کا ایم پی اے ہے۔ اپنے حلقے میں سات مرلے کے آبائی گھر میں رہتا ہے۔ اس کے بچے اسکول ویگن پر جاتے ہیں۔ اہلیہ بھی آنے جانے کے لیے رکشہ استعمال کرتی ہیں۔ اپنے حلقے میں اس نے کمیشن کا مکمل خاتمہ کر ڈالا ہے۔ مگر یوں زندہ رہنے کے لیے بہت مضبوط قوت ارادی چاہیے۔

اب میں ایک اور نکتے کی طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ آپ کسی دانشور یا علم یا اہل قلم سے بات کریں، وہ جھٹ آپ کو ہمسائے ملک ہندوستان کی مثال دینا شروع کر دے گا۔ آپ جمہوریت کا نام لیجیے، وہ آپ کو بھارتی پارلیمنٹ، اس کے ارکان کی سادگی اور وطن سے محبت کے ایسے ایسے قصے بیان کرے گا کہ آپ کو یقین آجائے گا، وہاں کے رکن اسمبلی دراصل فرشتہ ہیں۔ اور ہمارے ہاں سیاست میں محض شیطان ہی شیطان ہیں۔ میں اس مفروضے کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔

> ہمارے پاس اچھے افسر ہر سطح پر موجود ہیں۔ ایماندار اور اہلیت والے جج بھی ہیں۔ حتیٰ کہ سیاست کے میدان کارزار میں بھی سنجیدہ اور اچھی شہرت والے لوگ موجود ہیں۔

پروفیسر جگدیپ چھبر، پروفیسر ترائی لوچن ستری اور ریٹائرڈ میجر جنرل انیل ورما نے دہلی میں ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کا نام نیشنل الیکشن واچ اور ایسوسی ایشن برائے جمہوریت (Association for democratic Reforms) ہے۔ اس ادارہ کا کام صرف یہ ہے کہ بھارتی پارلیمنٹ کے منتخب نمائندوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے اور ان کی جائیداد، کردار، عائد قائم شدہ مقدمات، تعلیم وغیرہ پر تحقیق کرنے کے بعد آزادانہ رپورٹ مرتب کرے۔ اس ادارے نے حالیہ الیکشن کے

متعلق پانچ رپورٹیں مرتب کی ہیں۔ یہ انٹرنیٹ پر موجود ہیں اور آپ انھیں پڑھ سکتے ہیں۔ اگر میں یہ عرض کردوں کہ آپ انھیں دیکھ کر چونک جائیں گے تو بے جا نہ ہوگا۔

لوک سبھا کے اکتیس فیصد ارکان جرائم پیشہ افراد پہ مشتمل ہیں۔ ان تمام کے خلاف لاتعداد فوجداری مقدمات درج ہیں۔ ان میں سے ۱۴ سے ۱۵ فیصد تک منتخب نمائندے ایسے ہیں، جن کے جرائم انتہائی سنگین نوعیت کے ہیں۔

بی جے پی کے منتخب نمائندوں میں ۳۰ فیصد جرائم پیشہ افراد موجود ہیں۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ صوبہ جھارکنڈ کی اسمبلی میں ۸۲ فیصد ارکان پر فوجداری کیسز درج ہیں۔ دلچسپ امر یہ کہ جھارکنڈ صوبے کی حکومت یعنی "جھارکنڈ مکتی مورچہ" پارٹی میں ان مجرموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ کانگریس بھی اس لحاظ سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ اس کے صوبائی اور وفاقی منتخب نمائندوں کی تعداد ۱۴۳۳ ہے۔ ان میں سے ۳۰۵ افراد مہیب جرائم میں ملوث ہیں۔ پورے ہندوستان میں صرف ایک ریاست "منی پور" ہے جہاں کسی رکن کے خلاف کوئی فوجداری کیس درج نہیں۔

اب آپ ہندوستان کے وفاقی وزراء کے ریکارڈ کو پرکھیے۔ وفاقی وزراء کی تعداد ۴۵ ہے۔ ان میں سے ۱۳ پر فوجداری جرائم کے کیس درج ہیں۔ ان میں سے ۸ وزیر تو خوفناک جرائم میں ملوث ہیں۔ اس کے باوجود تمام وزیر دھڑلے سے کام کر رہے ہیں۔ بھارتی سپریم کورٹ نے حکم دیا ہے کہ وہ تمام سیاستدان جو کسی طرح بھی جرائم میں ملوث ہیں، حکومت میں شامل نہ ہوں۔ مگر وزیراعظم نریندر مودی سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ نتیجہ میں ان کی کابینہ کے اکثر وزراء کو مستعفی ہونا پڑے گا۔

صاحبان! بات یہاں ختم نہیں ہوتی!

رپورٹ میں سے صرف ایک یا دو وزراء کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اوما بھارتی کا تعلق بی جے پی سے ہے۔ وہ "جھانسی" کے حلقے سے منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں آئی۔ ان کے خلاف تیرہ مقدمات درج ہیں۔ سات مقدمات انڈین پینل کوڈ کی ان دفعات کے تحت درج کیے گئے جو انتہائی سنگین ہیں۔

آپ آگے نظر دوڑائیے۔ منڈے گوپیناتھ پانڈورنگ کا تعلق مہاراشٹرا سے ہے۔ یہ بھی بی جے پی کے وزیر ہیں۔ ان پر اغوا، لوگوں کو زخمی کرنا، حبس بے جا میں رکھنا اور قتل کی دھمکیاں دینے کے متعدد کیس درج ہیں۔ مگر ان کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ آٹھ وفاقی وزراء بارہ جماعتوں سے بھی کم تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک وفاقی وزیر محض پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کر سکے۔ پانچ وفاقی وزراء محض میٹرک ہیں۔

یہ رپورٹیں بہت ضخیم ہیں۔ میں آپ کے سامنے محض چند صفحات پر بیان شدہ حقائق لایا ہوں۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ حقیقت میں وہ "چمکتا ہوا بھارت" کہاں ہے؟

یہ رپورٹیں پڑھنے کے بعد اب میں پاکستان کے سیاست دانوں اور نظام سے کافی مطمئن ہوں! ہم میں خرابیاں ہیں مگر ہم محض اپنی خرابیوں کو بیان کرتے ہیں...... اچھائیوں کو بتانے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ہم نے ہر ایک کو بے توقیر کرنے کی قسم کھائی رکھی ہے۔ جس دن ہم نے ایک دوسرے کی عزت کرنا سیکھ لیا، اس دن ہمارا ملک! "دمکتا ہوا پاکستان" بن جائے گا۔

(بشکریہ روزنامہ ایکسپریس، لاہور)

کھٹی میٹھی یادیں

بھارتی فلموں کا دبنگ اداکار

سلمان خان

اپنے جہاں دیدہ والد کی نظر میں

شاہینہ انجم

"سلو بھائی" کے نام سے مداحوں میں مقبول بالی وڈ کا چہیتا اداکار، سلمان خان اپنی اداکاری کی وجہ سے کم اور دیگر وجوہ سے زیادہ موضوع بحث رہتا ہے۔ کیریئر کے عروج و زوال سے لے کر ذاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ نے اس کی زندگی کو معمّہ بنا دیا ہے۔ شاہ رخ، عامر اور سلمان کی تگڑی نے جہاں بھارتی فلمی صنعت کو مالا مال کیا، وہیں یہ بھی ثابت کر دیا کہ کلاکاری کے شعبے میں تعصب کی کوئی جگہ نہیں۔ جہاں صلاحیتوں کا دبدبہ ہو وہاں ہندو اور مسلمان میں تفریق نہیں برتی جاتی۔

لگاتار تین دہائیوں سے سلور اسکرین پر حکومت کرنے والے تینوں خانوں کے مداح اندرون ملک ہی نہیں بیرونی ممالک میں بھی بکھرے پڑے ہیں۔

لیکن ان تینوں میں سلمان خان کا انداز منفرد ہے۔ وہ سپر اسٹار کے زمرے میں آتے اور ناظرین کے محبوب اداکار بھی کہلاتے ہیں۔ دراصل انھیں میڈیا نہیں ناظرین نے ستارا بنایا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے راجیش کھنہ کے مقابلے امیتابھ بچن ناظرین کے سپر اسٹار بن گئے۔

ویسے ہی سلمان خان، عامر اور شاہ رخ کے ہوتے ہوئے اپنے مداحوں میں مقبول ہوئے۔ حالانکہ چنکارا کیس اور "ہٹ درن" حادثے میں وہ عدالت کو مطلوب ہیں۔ زیر زمین رہنے والے "ڈانوں" سے ان کے تعلق پر بھی بات ہوتی ہے۔ لیکن سلمان خان کو نزدیک سے جاننے والے خوب واقف ہیں کہ دبنگ

اسٹار کے دل میں ہمدردی اور خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ قریب ترین شناسا، ان کے والد سلیم خان نے بیٹے کی زندگی کی پرت در پرت سچائی سے پردہ اٹھایا ہے۔ آئیے جانتے ہیں، کروڑوں مداحوں کے چہیتے کی بابت سلیم خان کیا کہتے ہیں۔

وہ میرے جیسا ہے

اس تہذیب میں جہاں سے میں آیا ہوں، یہ تصور کرنا غلط ہے کہ اپنے بیٹے کے لیے ہمیشہ میرے منہ سے تعریفی کلمات نکلیں گے۔ میں ایسا باپ بالکل نہیں جو یہ کہے کہ میرا بیٹا سب سے اچھا اور ذہین ہے۔ اگر اداکاری کی بات کریں، تو میں گووندا کو بہترین اداکار مانتا ہوں۔ اس لڑکے کے اندر ٹیلنٹ ہے۔ وہ ہر قسم کے کردار بآسانی نبھانا جانتا ہے۔

درحقیقت میں سلمان کا سب سے بڑا ناقد ہوں۔ جب بھی مجھے پتا چلے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے، تو میں اسے سزا ضرور دیتا ہوں۔ اسے خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی، سلمان خان کے لیے میں رول ماڈل ہوں۔ ایک بیٹے کے لیے اس کا باپ پہلا ہیرو ہوتا ہے۔ اسی لیے سلمان مجھے ہیرو تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا سلمان کے انداز میرے طرز زندگی سے ملتے جلتے ہیں۔

میں جوانی کے دور میں جیسی حرکتیں کیا کرتا تھا، اسی طرح کی حرکتوں سے سلمان بھی گزرا۔ مثلاً موٹر سائیکل تیز چلانا، بے پروائی سے کپڑے تبدیل کرنا، چہل قدمی کرتے ہوئے گفت وشنید کرنا۔ میرے کنبے میں پسند کی شادی کا رواج ہے۔ میں نے دو شادیاں کیں۔ ارباز نے بھی لو میرج کی۔ سہیل اپنی پسند کی دلھن لے آیا۔ الویرا اور ارپنا نے بھی پسند کی شادیاں کیں۔ اسی لیے میں سلمان کی دلھن پسند نہیں کروں گا۔ یہ کام اسے خود کرنا ہے کیونکہ اس کو ہی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔

دوستی کا رشتہ

میں ان بدقسمت لوگوں میں سے ایک ہوں، جن کی پرورش نوکروں کے ہاتھوں میں ہوئی۔ میری ماں کا انتقال اس وقت ہوا جب میں محض ۹ سال کا تھا۔ ۱۴ سال کی عمر میں میرے والد مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور اپنے والد سے بہت زیادہ ڈرتا۔ چناں چہ میں نے تہیہ کر لیا کہ جب میرے بچے ہوئے، تو وہ مجھ سے نہیں ڈریں گے بلکہ میرے دوست ہوں گے۔

وہ اپنی پریشانیوں میں مجھے شامل کریں گے۔ میں ان سے کھل کر باتیں کروں گا لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ جب بچے ہوئے، تو میں فلم انڈسٹری میں مصروف تھا۔ میرے پاس بچوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ اسی لیے سلمان سمیت تمام بچے سلمٰی کے قریب رہے۔ انھوں نے اپنے تمام مسائل یہاں تک کہ لڑکیوں سے دوستی کی کہانیاں ماں کو سنائیں۔ مجھ سے سبھی بچے کچھ دور ہو گئے۔ لیکن جب میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بچوں کے ساتھ رہنا ہے، تب وہ مجھ سے قریب ہوئے۔

وہ میرا بڑا احترام کرتے ہیں۔ سلمان نے کبھی میرے سامنے سگریٹ نہیں جلائی۔ یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ جسے احترام ملے، اس پہ کچھ ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتے جس سے بچے بھی اسی روش پر چل پڑیں۔ مثلاً اگر آپ نے شراب پی اور ڈگمگاتے، شور مچاتے، چلاتے گھر میں داخل ہوئے تو اس سے بچے متاثر ہوں گے۔ جب یہ کام آپ نے نہیں کیا، تو بچے بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔

میں نے ہیلن سے دوسری شادی کی، لیکن سلمٰی کی اجازت سے! یہ ایک رومانوی حادثہ تھا۔ اگر کوئی یہ کہے

کہ اسے خوبصورت لڑکی اچھی نہیں لگتی تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ فطری طور پر میری شادی سے گھر میں الجھن ہوئی، لیکن مسئلے کو سب نے رفتہ رفتہ حل کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا اثر میرے بچوں پر پڑے۔ سلمیٰ اور ہیلن نے بھی اس بات کا خیال رکھا۔

بڑا کنبہ، بڑی ذمہ داریاں

۸۷ بہاریں دیکھنے اور بیوی بچوں کو سمیٹ کر رکھنے کے بعد اب آگے کیا ہوگا، اس پر تبصرہ فضول ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں، میرے جانے کے بعد سلمان ہی پورے کنبے کا باس بنے گا۔ وہی یہ ذمہ داری سنبھال سکتا ہے۔ اس کے اندر ذمہ داری نبھانے کی قوت ہے اور مشکل لمحات میں اس نے یہ ثابت کیا ہے۔ وہ حساس ہے اور بڑا متوازن بھی! سکھ دکھ جھیلتے ہوئے وہ مضبوط ہوا ہے۔ کم گو اور صابر ہے۔ بہت اچھا گاتا ہے، لیکن کسی پر اس کا اظہار نہیں کرتا۔ اس نے اپنی فلم ”کک“ کے لیے گانا ریکارڈ کرایا۔ میں نہیں کہتا کہ وہ محمد رفیع جیسا ہے، لیکن اس نے محنت کی، تو وہ کامیاب گلوکار ثابت ہوگا۔

ایک شخص اسی وقت تیراک بنتا ہے جب سمندر میں چھلانگ لگا دے۔ آپ اپنی خواب گاہ میں تیرنا نہیں سیکھ سکتے۔ مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک ایسا باپ ہوں، جس نے اپنے بیٹے کو پانی میں پھینک دیا تاکہ وہ خود بخود ہاتھ پیر چلانا سیکھ سکے۔ خاص طور پر بڑا ہونے کے ناتے آج سلمان اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ میں نے اپنے دور میں ایسے کئی باپ دیکھے ہیں جو اپنے بچوں کے کیریئر کی خاطر ہمہ وقت پریشان رہتے۔ لیکن میں نے کبھی بچوں کے لیے کوئی سفارش نہیں کی۔ سلمان نے شروع سے اپنے فیصلے خود کیے۔ غلطیاں کیں اور ان سے سبق بھی سیکھا۔ بعدازاں اپنے عروج کے زمانے میں لوگوں کی مدد کرنے لگا۔ کئی فلمیں اس نے صرف اسی لیے لیں کہ دوسرے کا بھلا ہو سکے۔

سلمان خان اپنے والد سلیم خان کے ساتھ

سلمان خان کی برتری

عامر خان اور شاہ رخ خان کے برعکس سلمان خان یکایک اداکاری کے عروج پر نہیں پہنچا۔ ۱۹۸۸ء میں اس کی پہلی فلم ”بیوی ہو تو ایسی“ جب آئی تو کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں ”میں نے پیار کیا“ ریلیز ہوئی۔ اس کے ذریعے سلمان نے اپنے مداح بنائے۔ پھر کئی فلمیں ناکام بھی ثابت ہوئیں۔ وہ یکایک اسٹار نہیں بنا، اس نے آہستہ آہستہ اپنا سفر آگے بڑھایا۔ شاہ رخ خان اور عامر خان اچانک آئے اور چھا گئے، پھر

انھوں نے اپنی دنیائے فلم میں جگہ بنائی۔ دونوں کے اندر اداکاری کے جوہر ہیں اور لوگ ان کے مداح ہیں۔

لیکن سلمان سے لوگ پیار کرتے اور انھیں ''بھائی'' کہتے ہیں۔ کیونکہ اس نے مسائل میں گرفتار کئی لوگوں کو اپنی فلموں میں کام کرنے کا موقع دیا اور ان کی زندگی سنوار دی۔ اسے اپنے مشہور و دولت مند ہونے کا غرور نہیں۔ وہ آج بھی اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہے، چھوٹے سے بنگلے میں جہاں سبھی لوگ رہتے ہیں، کیونکہ اسے سب سے پیار ہے۔ کچھ سال قبل ہم نے اسے کارٹر روڈ پر ایک نیا بنگلہ خرید کر دیا اور کہا کہ وہ اس میں منتقل ہو جائے۔ اس نے کہا''میرے ساتھ آپ اور ماں میں سے کون رہے گا؟''

جب ہم نے جانے سے انکار کیا، کہنے لگا''میں یہیں پر ٹھیک ہوں، جہاں آپ ہیں، وہیں ہم بھی رہیں گے۔''

اداکاری

سلمان خان فطری اداکار ہے۔ وہ کسی کی نقل نہیں کرتا، دلیپ کمار ہو یا امیتابھ بچن! اس نے اداکاری کے لیے اپنا راستہ بنایا، ورنہ فلم انڈسٹری کے بیشتر اداکار دلیپ یا امیتابھ بچن کی نقل کرتے ہیں۔ سلمان نے اپنی علیحدہ راہ نکالی۔ اس کے کیریئر میں اگر دبنگ ہٹ ثابت ہوئی، تو جے ہو امید پہ کھری نہیں اتری۔ لیکن ناکامی سے سلمان پہ کوئی منفی اثر نہیں پڑتا۔

تنازع سے گھبراہٹ

خدمت خلق کرنے والے ایک اداکار کو ہم مجرم کیسے مان سکتے ہیں؟ اپنی کمائی کا ۵۰ فیصد سے زیادہ خدمت خلق میں صرف کرنے والا اداکار مجرم نہیں ہو سکتا۔ خواہ ہٹ ورن کیس ہو یا کالے چنکارے کے شکار کا معاملہ ہو...... یہ غلطی ہو سکتی ہے جرم نہیں۔ لیکن یہ کیس دو دھاری تلوار ہے۔ مشہور شخصیت ہونے کے ناتے کیس کا فیصلہ جو بھی ہو، لیکن یہ سلمان کے لیے امتحان کی گھڑی ہوگی۔

اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو لوگ کہیں گے، بڑے لوگوں کو سزا نہیں ہوتی۔ اگر گرفتار کر لیا جاتا ہے، تو لوگ کہیں گے، عدالت نے ایک نظیر پیش کر دی۔ لیکن سب جانتے ہیں، اگر سلمان کو کچھ ہوا، تو ہم سب کی بری حالت ہوگی۔ ہم نے ہمیشہ فلم میں خوش آئند اختتام چھوڑا ہے۔ لیکن یہ ڈر ہمیشہ چھایا رہتا ہے کہ سلمان کی تقدیر میں نہ جانے کیا لکھا ہے۔

◆●●

ایک منٹ

اس جدید دور میں انٹرنیٹ ایک بہترین ساتھی کے روپ میں سامنے آیا ہے جس کے ذریعے دنیا بھر میں اربوں لوگ اپنے روزمرہ معمولات زندگی میں مختلف امور انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں فقط ایک منٹ کتنے معنی رکھتا ہے اور جس میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ امریکی کمپنی کی تحقیق کے مطابق صرف ایک منٹ میں دنیا بھر میں ۲۰ کروڑ ۴۰ لاکھ ای میلز کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں انٹرنیٹ کی دنیا میں ایک منٹ لوگوں کی زندگی میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ صرف فیس بک پر ۶۰ لاکھ پیجز دیکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک منٹ میں یوٹیوب سے کم و بیش ۱۳ لاکھ ویڈیوز ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ۲ کروڑ تصاویر دیکھی جاتی ہیں۔ مطالعہ سے سامنے آنے والے اعداد و شمار کے مطابق جہاں اس ایک منٹ میں کم از کم ۱۲۰ افراد کی آئی ڈیز چوری ہو جاتی ہیں وہیں ۴۷ ہزار نئی ایپلی کیشنز ڈاؤن لوڈ کر لی جاتی ہیں۔ جب کہ اسی ایک منٹ میں دنیا بھر میں سنے جانے والے گانوں کا دورانیہ ۶۰ ہزار گھنٹوں تک جا پہنچتا ہے۔

(مرسلہ: اطیب جان، راولپنڈی)

رہو پھول کے مانند، بکھرو خوشبو کی طرح

ایک عام آدمی کی خاص کہانی

ایک سعید روح کا قصہ جانفزا جو تمام عمر دکھی انسانوں میں محبت کی سوغات تقسیم کرتی رہی

شاہ محی الحق فاروقی

ہم اپنی زندگی میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں سے ملتے ہیں۔ کسی سے محض ایک آدھ بار اور کسی سے سالہا سال روز و شب ملاقات رہتی ہے۔

کچھ لوگ ایسے سپاٹ ہوتے ہیں کہ چند ہی دنوں میں وہ "گلِ دستۂ طاقِ نسیاں" بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں میں کوئی نہ کوئی ایسی چونکا دینے والی بات ہوتی ہے کہ وہ زندگی بھر اپنے ملنے والوں کے نہاں خانۂ دماغ پر دستک دیتے ہیں۔

انھیں ہم کسی حد تک ایک غیر معمولی انسان کہہ سکتے ہیں۔ غیر معمولی ہونے کے لیے کوئی شرط نہیں! ہر عمر، علم یا عہدے اور مثبت یا منفی کسی خاص قسم کے کردار کے حامل افراد میں آپ کو غیر معمولی انسان مل جائیں گے۔

اکبر علی معمولی پڑھا لکھا ہونے کے باوجود ایک غیر معمولی انسان تھا۔ کام چلانے بھر اردو اور ہندسوں اور حروفِ تہجی کی شناخت کی حد تک انگریزی سے واقف تھا۔ عشرہ ۱۹۵۰ء میں سرکاری ملازمین کی درجہ بندی والی اصطلاح میں وہ سب سے نچلے درجے یعنی درجہ چہارم (اب گریڈ ایک) میں سیکریٹریٹ کی حد تک سب سے اعلیٰ عہدے یعنی "ریکارڈ سارٹر" کے طور پر ملازم تھا۔

سرکاری دفتروں میں فائلوں کی دیکھ بھال کے ذمے دار اہل کار دفتری کہلاتے ہیں۔ دفتری کا عہدہ چپراسی (اب نائب قاصد) کے عہدے سے ذرا بڑا ہوتا۔ ان دنوں دفتر میں پانچ دفتریوں میں سے ایک "ریکارڈ سارٹر" کہلاتا۔ فرائض کے اعتبار سے وہ بھی دفتری ہی ہوتا۔ بلکہ یہ دفتریوں ہی کا ایک سلیکشن گریڈ (منتخب درجہ) تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی تنخواہ زائد ہوتی۔ اب غالباً ریکارڈ سارٹر کا عہدہ "دفتری سب برابر" کے اصول پر ختم کر دیا گیا ہے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں مرکزی سیکریٹریٹ کی تمام وزارتوں میں پچاس ساٹھ ریکارڈ سارٹر ہوں گے۔ ان دنوں سارے الاؤنس وغیرہ ملا کر ایک ریکارڈ سارٹر کو تقریباً نوے روپے تنخواہ، گریڈ ایک کے دوسرے ملازمین کی طرح ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان اور معمولی خاکی رنگ کی وردی ملتی تھی۔ ان ریکارڈ سارٹروں میں بھی جدا جدا طبیعتوں کے مالک تھے کہ یہی نظامِ قدرت ہے:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ریکارڈ سارٹروں کی اکثریت بھی سیدھی اور سپاٹ شخصیت کی مالک تھی۔ چونکا دینے والی بات کم ہی لوگوں میں ہوتی۔ مثلاً ریکارڈ سارٹروں ہی میں ایک دفتر میں اجمل نامی بھی تھا۔ وہ اپنی تنخواہ کے نوے روپوں میں سے بمشکل پچیس روپے اپنی ذات پر خرچ کرتا۔ دفتر ہی سے ملی ہوئی وردی کثیف حالت میں ہمیشہ زیب تن ہوتی۔ شاید وہ رات کو بھی وہی وردی پہن کر سو جاتا۔ سر سے پیر تک اس کا حلیہ اجاڑ رہتا۔ کھانا موقع ملا تو کسی کے ساتھ یا دوسرے کا پس خوردہ کھا لیا۔ ورنہ بہ درجۂ مجبوری پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے چار چھے آنے اپنی جیب سے خرچ کر لیے۔

اجمل بلا مبالغہ بقیہ تنخواہ "جوابی تاروں" پر خرچ کرتا۔ یہ سلسلہ بھی بڑا عجیب اور دلچسپ تھا۔ شاید اس نے غالب کا وہ شعر پڑھ یا سن رکھا تھا کیوں کہ عمل ہمیشہ اسی پر رہا:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

وہ لاہور کی ایک مشہور مغنیہ بلکہ اس کے نام کا عاشق تھا۔ نام کا عاشق اس لیے کہ اجمل نے مغنیہ کی زیارت شاید کبھی نہ کی تھی۔ کبھی اسے دیکھا بھی تو بہت دور سے!

اجمل کو مغنّیہ سے محبت تھی لیکن یک طرفہ اور افلاطونی۔ اس کا اظہار وہ بس ان جوابی تاروں سے کرتا جو ہر دوسرے تیسرے دن مغنّیہ کے نجی سیکرٹری کے نام بھیجتا۔

لاہور سے متعلق کسی قسم کی کوئی خطرناک یا غیر معمولی خبر اخبار میں اجمل کی نظر سے گزری یا کہیں سے کانوں میں پڑ گئی تو وہ تڑپ اٹھتا۔ باغ جناح میں کوئی درخت گر گیا، مال روڈ پر کوئی شخص کسی گاڑی کے نیچے آ کر ہلاک ہو گیا، بھاٹی گیٹ میں کسی نے دوسرے کو قتل یا زخمی کر دیا یا کسی ناکامِ محبت نے شاہ درہ کے نزدیک ریل کی پٹڑی پر سر رکھ کر خودکشی کر لی۔ غرض ہر ایسے نازک موقع پر "پرستار" اجمل کو مغنّیہ کی فکر پڑ جاتی۔ وہ تیر کی طرح تار گھر پہنچتا اور مغنّیہ کے نجی سیکریٹری کو فوراً جوابی تار بھیجتا:

Wire Welfare of Madam

(میڈم کی خیریت سے مطلع کیجیے)

ظاہر ہے تار جوابی ہوتا، لہٰذا جواب دینے میں میڈم کی جیب سے ایک پیسا نہ نکلتا۔ چناں چہ دوسرے دن اور کبھی کبھار اسی دن نجی سیکرٹری کی طرف سے جواب آ جاتا:

Madam is Ok (میڈم بہ خیریت ہیں)

جواب ملتے ہی اجمل کے سینے سے پتھر کی سل ہٹ جاتی۔ وہ جوابی تار بھیجنے کے لیے کسی دوسرے "اندوہ ناک" حادثے کا انتظار کرنے لگتا جس کا "میڈم" سے تعلق ہونا ضروری نہیں تھا۔ بس حادثہ اور لاہور میں ہونا کافی ہوتا۔ چناں چہ تار ملتے ہی وہ دو چار دن میں کوئی نہ کوئی دوسرا حادثہ تلاش کر لیتا۔ اجمل کی بغل میں ایک موٹی سی فائل رہتی۔ وہ اس کے بھیجے ہوئے تاروں کی رسیدوں اور نجی سیکرٹری کی جانب سے آئے جوابات سے بھری رہتی۔ وہ ان قیمتی دستاویزات کی حفاظت اپنی جان برابر کرتا اور مستقل مطالعے کی لذت بھی حاصل کرتا رہتا۔

اگر لاہور سے کوئی غیر معمولی خبر نہ آتی تو بھی ہفتے میں کم از کم دو تار اجمل کی طرف سے ضرور جاتے۔ وہ جاننے والوں سے گاہے گاہے اپنی کوئی "اشد" ضرورت بتا کر دو چار روپے ادھار مانگتا رہتا۔ بعض لوگ اس کی افلاس زدہ صورت پر ترس کھا کر یہ جانتے بوجھتے اسے کچھ پیسے دے دیتے کہ اس کی "اشد ضرورت" تار گھر پہنچ کر ختم ہو جائے گی۔ اور یہ کہ یہ ادھار کبھی واپس نہیں ملے گا۔ بہرحال اب یہی دعا ہے کہ اگر اجمل زندہ ہو تو اللہ اس کے حال پر رحم کرے۔ اگر وہ انتقال کر چکا تو بھی:

خدا رحمت کرے ان عاشقانِ فلم تھیٹر پر!

میرا موضوع اکبر علی ہے۔ اجمل کا واقعہ محض تفنّنِ طبع کے طور پر بیان کر دیا۔ وہ بھی صرف یہ بتانے کے لیے کہ اجمل جیسا ہی ایک ریکارڈ سارٹر اکبر علی بھی تھا۔ وہ تقریباً پینتیس سال کی عمر میں بیوہ، کم سن بچی اور اپنے جاننے والوں کے ذہنوں میں کردار کے اَن مِٹ نقوش چھوڑ کر دنیا سے یوں رخصت ہوا کہ سبھی کو یقین تھا، اس کے توشہ آخرت میں اپنے اعمال صالحہ کے علاوہ درجنوں خاندانوں کی دعائیں بھی شامل ہوں گی۔

اکبر علی آگرے کا رہنے والا اور اجمیر کے کسی دفتر میں ملازم تھا۔ پاکستان بنا تو ہجرت کر کے کراچی آیا اور یہاں ایک مرکزی وزارت میں بطور دفتری ملازم ہو گیا۔ کچھ دن بعد ریکارڈ سارٹر کے عہدے پر اس کی ترقی ہو گئی۔ اکبر علی کے ہم نام، شہنشاہ اکبر کے بسائے ہوئے شہر، اکبر آباد (آگرہ) کو اس حیثیت سے کون نہیں جانتا کہ وہ اپنی آغوش میں مثالی محبت کی لافانی یادگار لیے ہوئے ہے۔ غالباً اسی شہر کا فیضان تھا کہ اکبر علی کے دل میں بھی محبت کا عظیم الشان تاج محل صاحبانِ بصیرت کو ضو پاشیاں کرتا نظر آتا۔ اس فرق کے ساتھ کہ محبت کا مرکز کوئی

ممتاز محل یا نور جہاں نہیں تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اسے محبت کسی ایک نہیں بلکہ جاننے والے ہر شخص سے تھی۔ وہ شاہجہانی نہیں عالم گیر محبت کے اصول پر کاربند تھا۔ اسے دیکھ کر بے ساختہ علامہ اقبالؒ کا شعر یاد آتا ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

اکبر علی کو بھی خدا کے بندوں سے پیار تھا، بلا امتیاز اور بلا ترجیح۔ اسے اپنے افسروں سے محبت تھی، اسے دفتر کے کلرکوں سے پیار تھا۔ اسے اپنے ساتھی ریکارڈ سارٹروں کا سکھ سکھی اور دکھ دکھی بناتا۔ وہ اپنے سے کم عہدہ لوگوں یعنی دفتریوں، چپراسیوں، فراشوں اور خاک روبوں کے مسائل حل کرانے میں ہمیشہ کوشاں رہتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر پڑھے ہوئے، لاشعوری طور پر، اقبال کا یہ شعر اس کی زبان دل پر ہمہ دم جاری رہتا جس کے دوسرے مصرع کو اس نے بطور اپنی زندگی راہنما اصول اپنا رکھا تھا:

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

اکبر علی کی زندگی سیدھے سادھے دفتری کی تھی۔ انفرادیت یہ تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا، اپنے عمل، قول اور فعل سے یہی گنگناتا سنائی دیتا:

میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

اکبر علی کو اللہ تعالیٰ نے اچھی قوتِ کارکردگی کے علاوہ بہت اچھے حافظے سے بھی نوازا تھا۔ چند منٹوں میں گرد و غبار سے اٹی الماری سے مطلوبہ فائل نکال پیش کر دینے کے علاوہ پھٹی پرانی فائلوں کی مرمت بھی وہ قابل تعریف انداز میں کرتا۔ یہ ساری کارگزاری ذاتی فرائض منصبی تک

ڈپریشن اور ذہنی دباؤ سے چھٹکارے کے لیے دہی کھائیے

دہی کے بے شمار فوائد ہیں۔ حال ہی میں ایک تحقیق سے دہی کی ایک اور اہم افادیت کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہ یہ کہ دہی کھانے سے ڈپریشن اور ذہنی دباؤ سے بھی چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ امریکی یونیورسٹی میں ہونے والی تحقیق کے نتائج کے مطابق دہی میں موجود اجزا دماغ کے ان حصوں پر اثر انداز ہوتے ہیں جو تکلیف اور پریشانی محسوس کرتے ہیں۔ ان اجزا کی بدولت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے۔ دہی کھانے سے نہ صرف ڈپریشن کم ہوتا ہے بلکہ قوت فیصلہ بھی مضبوط ہوتی ہے۔

(مرسلہ: اویس احمد، دیپالپور)

محدود نہ رہی بلکہ تمام ساتھیوں اور اہلکاروں کے لیے صلائے عام تھی۔ جس کسی کو ضرورت ہوتی، اکبر علی کی خدمت بلا معاوضہ اور بلا مطالبہ حاضر۔ کام اکبر علی نے کر دیا واہ واہ متعلقہ اہلکار یا دفتری کی ہو گئی۔ وہ امکانی کوشش کرتا کہ کسی کو بھی اندازہ نہ ہو، پھٹی پرانی فائل کی مرمت اس نے کی ہے۔

لیکن یہ تمام باتیں تو ہر دفتری کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ اکبر علی جیسے لاتعداد کارکن ہر دفتر میں موجود ہوتے ہیں، یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اکبر علی کا انوکھا پن کچھ اور قسم کا تھا۔ وہ غم خوار کارکن ہی نہیں درد مند انسان بھی تھا۔ کون نہیں جانتا کہ درد مندی اور غم خواری کے تقاضوں کی تسکین کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ چشم و گوش وا ہوں تو قدم قدم پر کوئی نہ کوئی مبتلائے

درد و مصیبت زبانِ قال سے کیا تو زبانِ حال سے طالب امداد دکھائی دے گا۔

اکبر علی نے جاننے والوں کی مدد کرنے کے علاوہ اپنا ایک انوکھا طریقہ وضع کر رکھا تھا۔ وہ ہر مہینے ضرورت مندوں کے لیے ہزار بارہ سو سے لے کر تقریباً ڈھائی تین ہزار روپے تک کے قرض کا بندوبست کرتا۔ اس جملے میں زور "بندوبست" کے لفظ پر ہے۔ دفتر کے کارکنوں کی اکثریت کو آج کی طرح اپنی خانگی ضروریات کے لیے وقتاً فوقتاً کچھ روپے درکار ہوتے۔ رقم بھی ان دنوں کی آمدنی اور اخراجاتِ زندگی کے پیشِ نظر حسب حیثیت دس، بیس، یا حد سے حد سو روپے ہوتی۔ ضرورت مندوں میں ادنیٰ کارکنوں کے علاوہ درمیانی درجوں کے اہل کار بلکہ بعض اوقات چھوٹے موٹے افسر بھی شامل ہوتے۔

خودداری اور حجاب کی بنا پر ہر شخص دوسرے سے قرض نہیں مانگ سکتا۔ لہٰذا ایسے مواقع پر تمام ضرورت مندوں کی نظریں اکبر علی کی طرف اٹھتیں۔ بعض لوگ تو اپنی ضرورت کی نوعیت اکبر علی کو بھی نہ بتاتے۔ چپراسی اور دفتری وغیرہ بلا جھجک اس سے کہہ دیتے "آج رات روٹی پکنے کے لیے تو گھر میں آٹا بھی نہیں۔" کوئی خود بتا دے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ اکبر علی کو کسی کی ضرورت معلوم کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آخر کوئی اپنا کم زور پہلو کسی دوسرے کے سامنے کیوں نمایاں کرے؟ اس کا اپنا تجربہ ہی اس امر میں اس کی راہنمائی کرتا تھا کہ کسی کے لب وا ہوئے اور اس نے مدعا پا لیا۔

روپے پیسوں کے معاملے میں اکبر علی کی اپنی حالت بھی چیل کے گھونسلے میں ماس والی رہتی۔ دس بیس روپے تو اسے خود اپنے لیے ہر مہینے لوگوں سے دست گرداں لینے پڑتے تھے۔ لہٰذا ان حالات میں یہ توقع بڑی مضحکہ انگیز بھی جاتی کہ اکبر علی اپنے پاس سے کسی کے لیے قرض کا انتظام کر دے گا۔

دراصل بات وہی مختلف لوگوں کے معاملات میں پرخلوص دلچسپی لینے کی تھی۔ اس وجہ سے اکبر علی ان لوگوں کو بخوبی جانتا تھا جو اپنی جزرسی یا اپنی آمدنی کے مقابلے میں نسبتاً کم اخراجات کی وجہ سے تھوڑے بہت پیسے پس انداز کرنے کی حیثیت میں ہوتے۔ کچھ لوگ خود بھی ضرورت مندوں کے زمرے میں آتے لیکن بعض اوقات دفتر سے کوئی پیشگی رقم یا کسی قسم کا بقایا مل جانے سے دو چار مہینے کشادگی کی زندگی گزار لیتے۔ یوں گاہے گاہے تھوڑے دنوں کے لیے ہی بعض لینے والے بھی دینے والے ہاتھ بن جاتے۔ اکبر علی ان دونوں قسم کے لوگوں کے پاس بلا جھجک پہنچتا اور اپنے نام سے ان کی استطاعت کے مطابق قرض مانگتا۔

قرض مانگنے میں اکبر علی کی ادائیں نرالی ہوتیں۔ کسی سے وہ خاموشی کے ساتھ تنہائی میں مانگتا۔ یہ وہ لوگ ہوتے جو بلا حیل و حجت، یہ جانتے بوجھتے کہ یہ قرض وہ اپنے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے مانگ رہا ہے، اسے مطلوبہ رقم دے دیتے۔ دراصل ایسے لوگوں کی خود اپنی خواہش بھی یہی ہوتی کہ اگر تھوڑے سے پیسے اپنی کسی ضرورت کو نظر انداز کیے بغیر، اس طمانیت کے ساتھ کہ حسب وعدہ واپس مل جائیں گے، دے دیے جائیں تو ان کے کسی ضرورت مند ساتھی کی کوئی وقتی ضرورت پوری ہو جائے گی۔

کچھ لوگ اپنی معمولی سی رقم بھی کم سے کم مدت کے لیے سہی، اپنے قبضے سے الگ کرنا پسند نہ کرتے۔ ایسے لوگوں سے اکبر علی عموماً سب کے سامنے قرض مانگتا کہ آخر اتنے آدمیوں کے سامنے کوئی کب تک بدلحاظ بنا رہ سکتا

ہے؟ وہ منظر بھی بڑا دیدنی ہوتا۔ اُدھر سے انکار، ادھر سے اصرار اور اصرار بھی کیسا کچھ، اکبر علی خاص شوخی کے ساتھ کبھی صاحب رقم کا سر دبا رہا ہے، کبھی پیر، کبھی خوشامدیں کر رہا ہے، دہائیاں دے رہا ہے۔ صاحب رقم اٹھ کے بھاگنا چاہتے ہیں، اکبر علی ان کے پیر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اکبر علی کے دستِ ناتواں سے اپنا دامن جتنا جھٹکتے ہیں، اس کی گرفت اتنی ہی مضبوط ہو جاتی ہے۔

ان کا اصرار ہے کہ بتایا جائے، آخر ضرورت ہے کس کو؟ لیکن اکبر علی نے یہ سبق تو پڑھا ہی نہ تھا۔ وہ بھلا کسی ضرورت مند کے نام کا اعلان کیسے کرتا؟ یہ تو اس کے نزدیک گناہِ عظیم تھا۔ وہ تو سارے قرض اپنے نام سے مانگتا لہٰذا خاص شوخی اور اپنائیت کے ساتھ صاحب رقم کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ روپوں کی ضرورت خود اسی کو ہے۔ دفتر کے تمام لوگ طلب و انکار کا یہ ڈراما پوری دلچسپی کے ساتھ دیکھتے بلکہ خود وہ شخص بھی اس ڈرامے کا عینی شاہد ہوتا جس کی خاطر اکبر علی یہ سارے پاپڑ بیلتا۔ کچھ لوگ تو زیرِ لب مسکراتے رہتے بعض لوگ دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر خود بھی زوردار الفاظ میں سفارش کر کے اکبر علی کی ہمت افزائی کرتے۔

اکبر علی کو کبھی شکست کھاتے نہیں دیکھا گیا۔ وہ آخر مطلوبہ رقم لے کر ہی ٹلتا۔ تھوڑی دیر بعد بغیر کسی کے علم میں آئے چپکے سے وہ روپے ضرورت مند کے پاس پہنچ جاتے اور اکبر علی کے چہرے پر سکون و طمانیت کی لہر دوڑ جاتی۔

ایک عجیب بات یہ دیکھی گئی کہ اس لین دین اور ہیر پھیر میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے کوئی بڑی چھوٹی رقم لی اور واپس نہ کی۔ اس جرم کی زد اکبر علی پر ہی پڑتی۔ مرنے سے پہلے کئی مہینے وہ گھر پر صاحب فراش رہا۔ اس اثنا میں اس نے تمام حسابات صاف کروا دیے اور کسی کو شاکی نہ پایا گیا۔

لین دین کی اتنی بڑی تعداد میں ایک آدھ گھپلا تو پڑنا چاہیے تھا لیکن نیت بہ خیر ہو تو ان شاء اللہ کوئی ناقابل حل مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس موقع پر مجھے ضیاء الدین برنی مرحوم کا، جو ایک اچھے ادیب اور بہت اچھے انسان تھے، بیان کردہ ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ دہلی کے رہنے والے اور بمبئی میں سرکاری دارالترجمہ میں بحیثیت مترجم ملازم تھے۔ اپنے عہدے کے بڑے ادیبوں، سیاست دانوں، تاجروں، استادوں اور سرکاری ملازموں سے بلالحاظ مذہب ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ آزادی کے بعد کراچی آ گئے جہاں ۱۹۶۰ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ تقریباً ایک سو بڑے چھوٹے افراد کے واقعات انھوں نے ''عظمت رفتہ'' کے نام سے دلچسپ انداز میں لکھے۔ ''دادا بھائی واچ میکر'' ان کے سینئر اہل کار تھے اور بڑی خوبیوں کے آدمی۔ ضیاء الدین برنی نے ان کے ذیل میں لکھا:

واچ میکر دفتر میں روزانہ پانچ چھے سو روپے لے کر آتے تھے تاکہ اگر کسی کو امداد کی ضرورت ہو تو وہ اسے قرضِ حسنہ دے دیں۔ چھٹی پر جانے والے اشخاص تنخواہ کا پیشگی روپیہ ان سے لے لیا کرتے۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان مترجم نے ان سے کچھ روپے قرض لیے۔ لیکن جب انھوں نے روپیہ واپس مانگا تو اس نے کہہ دیا ''میں روپیہ ادا کر چکا۔'' اس کے بعد انھوں نے طے کر لیا کہ آئندہ کسی مسلمان کو قرض نہ دیں گے۔ اتفاقاً کچھ عرصے بعد مجھے روپے کی ضرورت پڑ گئی اور میں ان کے پاس گیا۔ انھوں نے وہی واقعہ بیان کیا اور کہا ''اب میں کسی مسلمان کو قرض نہیں دوں گا۔''

میں نے کہا ''کیا سب مسلمان یکساں ہوتے ہیں؟ کیا ایک مسلمان کے خراب طرزِ عمل کی وجہ سے آپ

ساری قوم کو بدنام کرنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ نے ایسا کیا تو انتہائی ظلم ہوگا۔"

میرے دلائل سے متاثر ہوکر انھوں نے کہا "اچھا تم اس کلیے کی استثنا ہو۔" یہ کہا اور مطلوبہ رقم دے دی۔

میری ناچیز رائے میں برنی صاحب اس استثنا سے اسی وقت فائدہ اٹھاتے جب واچ میکر کلیے کو ترک کر دینے کا اعلان کر دیتے۔ کلیہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان بہ حیثیت قوم بدعہد اور نادہندہ ہیں اور بس برنی صاحب اس سے استثنا۔ بلکہ واچ میکر سے انھیں کلیہ یہ منوانا چاہیے تھا کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی بہ حیثیت مجموعی ایماندار ہیں، بس فلاں مترجم اس کلیے کی استثنا ہے۔ اس فیصلے سے نہ صرف وہ مسلمان مترجم بلکہ دفتر کے تمام مسلم ملازمین ہمیشہ ایک اخلاقی بوجھ تلے دبے رہتے۔

بات ہو رہی تھی کہ اکبر علی کی اس ادا کی کہ اسے اپنی مہم جوئی میں ناکام ہوتے کبھی نہ دیکھا گیا۔ عرصۂ ملازمت میں اکبر علی نے خدا جانے کتنے لوگوں کی سفید پوشی کا بھرم رکھا۔ کئی لوگوں کے گھروں میں وہ چولھا گرم رکھنے کا سبب بنا۔ نہ جانے کتنے مریضوں کی دوائیں اس کی وجہ سے بروقت خریدی گئیں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا لیکن اکبر علی نے اپنے رویے سے بھی کسی کو یہ اندازہ نہ ہونے دیا کہ اسے اپنے کارنامے پر کوئی فخر یا غرور ہے۔ ممکن ہے کسی کو یہ عمل کارنامہ نظر نہ آئے۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں، یہ تو ہر شخص کر سکتا ہے۔ ٹھیک ہے صاحب! ہر شخص یہ کر سکتا ہے لیکن کبھی کبھی، برسوں میں ایک دو بار۔ ذرا کوئی سالہا سال ہر مہینے پچیس تیس بار یہ بے غرض عمل دہرا کر تو دیکھے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ کارنامہ ہے یا نہیں؟"

فخر یا غرور بڑی بات ہے، اکبر علی کو تو جب بھی پایا، اس کے چہرے پر مسکینی اور عجز و انکسار ہی دیکھا۔ غصے اور چڑچڑے پن سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں کے چہرے بے ساختہ کھل اٹھتے۔ ان لوگوں کے چہرے بھی جنھیں یہ معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد اکبر علی بڑی لجاجت کے ساتھ ان سے کہے گا "آج تو بیس روپے دے ہی دیجیے، قسم خدا کی، مجھے بڑی سخت ضرورت ہے۔"

> فخر یا غرور بڑی بات ہے، اکبر علی کو تو جب بھی پایا، اس کے چہرے پر مسکینی اور عجز و انکسار ہی دیکھا۔ غصے اور چڑچڑے پن سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔

بظاہر ہمیشہ خوش رہنے والا یہ انسان اکبر علی جب تپ دق میں مرا تو بعض لوگوں کا خیال تھا، اس کا چہرہ دھوکا دیتا تھا۔ ورنہ خود اپنی اور دوسروں کی پریشانیاں دیکھ کر اندرونی طور پر وہ ہمیشہ اداس اور دل گرفتہ ہی رہتا۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ اس کے اپنے اور دوسرے دفتریوں کے ڈبے فائلوں کی الماریوں میں سڑے ہُوئے کاغذ کے کیڑے اور گرد و غبار کے ڈھیر اسے کھا گئے۔

بہرحال اکبر علی کی موت کا سبب ٹی بی تھی۔ اب ٹی بی کا سبب کچھ بھی رہا ہو، دیکھنے والوں نے تو بس یہ دیکھا کہ وہ شخص مر گیا جو لوگوں کی عزت و آبرو اور بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنی خودداری، انا اور محبّت کی قربان گاہ پر چڑھا ہاتھ میں کاسہ لیے اس کرسی سے اُس کرسی مارا مارا پھرتا تھا۔

اے ستار العیوب! تیرا ایک ناچیز بندہ جو زندگی بھر دوسروں کی کمزوریوں کو چھپا کر ان کی خدمت کرتا رہا، اپنا فردِ عمل لے کر تیرے حضور میں حاضر ہے۔ تو اس کی کوتاہیوں پر پردہ ڈال دے اور اسے ہر قسم کی رسوائی اور شرمساری سے بچا لے۔ رحم، یا ارحم الراحمین۔

◆◆◆

معلوم نہیں پہلے کون کھائے گا

لال چاول

موت کا مضحکہ اڑانے والے ایک بڑبولے کا الم ناک ماجرا

محمد بوٹا مجاہد

چودھری محمد اسلم متوسط درجے کے صنعت کار تھے۔ زرعی انڈسٹری اور ٹیوب ویلوں کے بوروں میں استعمال ہونے والے پائپوں کی ایک فیکٹری ان کی ملکیت تھی۔ یہ پانی، ریت، سیمنٹ، بجری وغیرہ کے ملاپ سے بنائے جاتے ہیں۔ چودھری صاحب محنتی تھے۔ اسی لیے ان کا کاروبار دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

تاہم وہ قدرے سیاسی ذہن رکھتے تھے۔ ایک مشہور سیاسی جماعت کے کارکن ہی نہیں عہدیدار بھی تھے۔ اپنے آپ کو اس سیاسی جماعت کا کارکن کہلانے پر فخر محسوس کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ اس جماعت کا مقامی لیڈران کی بڑی عزت کرتا۔ لیڈر کی کوشش ہوتی کہ لوگ لڑائی جھگڑوں کی صورت تھانے کچہری جانے کے بجائے اس کے ڈیرے پر آجائیں۔

وہ پنچایت بلاتے اور کچھ لو اور کچھ دو کے تحت اس طرح فیصلے کرتے کہ دونوں پارٹیاں مطمئن ہو جاتیں۔ بیشتر جھگڑوں میں ان کی کوشش ہوتی کہ فریقین کے درمیان صلح ہو جائے۔ پنچایت میں وہ چودھری محمد اسلم کو اپنا معاون بناتے۔ چودھری صاحب اپنی باتوں سے فریقین کو بہت متاثر کرتے۔

چودھری محمد اسلم جہاں بے شمار خوبیوں کے مالک

تھے، ان میں چند خامیاں بھی تھیں۔ ایک تو وہ پرلے درجے کے جگت باز تھے۔ دوسرے اپنے ساتھیوں اور لوگوں کے ساتھ مذاق کرنا ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ بعض لوگ جن میں شہر کے ایک معزز و متشرح ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی شامل تھے، انھیں اس امر سے روکتے مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ وہ ان کی باتوں کو ہنسی مذاق میں ٹال دیتے۔

ان کی گلی کے سامنے سڑک پار دوسرے محلے ایک بزرگ خاتون رہتی تھی۔ یہ خاتون تقریباً ۸۰ سالہ بوڑھی تھی۔ لاٹھی کے سہارے چل پھر لیتی۔ اگر بہوؤں کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو انھیں بازار سے لا دیتی تاہم زیادہ تر وہ گھر کے باہر چارپائی پر بیٹھی تسبیح پہ کلمہ طیبہ، درود شریف اور سورۂ اخلاص کا ورد کرتی رہتی۔ نماز کی پابند تھی۔ اٹھتی، تو وضو کرتی۔ اگر کسی نے چوکی بچھا دی تو فبہا ورنہ جائے نماز چارپائی پر رکھی اور نماز پڑھ لی۔

چودھری صاحب کا گزر اکثر اس گلی سے ہوتا۔ یہ بزرگ خاتون ان کے مذاق کا نشانہ بنتی۔ خاتون کا نام مائی نیک بختاں تھا۔ چودھری صاحب جب بھی گلی سے گزرتے تو آواز لگاتے "مائی کب تک جیو گی؟ ہمیں اپنے لال کب کھلاؤ گی؟" بظاہر یہ جملہ بے ضرر معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں گہری طنز پوشیدہ تھی۔ مطلب یہ تھا کہ تم کب مرو گی تاکہ ہم تمھاری قل خوانی یا چہلم کے چاول (لال سے مراد بریانی) کھا سکیں۔ مائی نیک بختاں بعض اوقات خاموش رہتی کبھی کہہ دیتی "چودھری صاحب! موت کا ایک دن مقرر ہے، پتا نہیں کس نے پہلے چلے جانا ہے۔"

ایک دن چودھری صاحب ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ سیاسی لیڈر کا فون آ گیا۔ "ہیلو چودھری صاحب! السلام علیکم! اس وقت آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"جناب ناشتا کر رہا ہوں۔" انھوں نے بتایا۔

"چودھری صاحب! ناشتے کے بعد فوراً ڈیرے پر آ جاؤ۔ گاؤں شاہ دی کھوئی کی دو پارٹیاں آپس میں لڑ بیٹھی ہیں۔ ہیں بھی دونوں ایک ہی برادری کی۔ ہماری جماعت کی حمایتی بھی ہیں۔ میں نے دونوں کو تھانے جانے سے روک کر ڈیرے بلا لیا ہے۔ آپ جلد آ جائیے۔

چودھری صاحب نے کہا "میں ناشتا کر کے ابھی آتا ہوں۔"

انھوں نے پھر ٹیلی فون پر فیکٹری میں منیجر کو کچھ ہدایات دیں، گاڑی نکالی اور چل پڑے۔ سامنے والی گلی میں پہنچے، تو دیکھا، وہ بزرگ خاتون حسب معمول چارپائی پر بیٹھی تسبیح پر کلمہ طیبہ کا ورد کر رہی ہے۔ گاڑی روکی اور بولے "مائی سچ سچ بتا، ہمیں اپنے لال چاول کب کھلاؤ گی؟"

وہ بزرگ خاتون بولی "یہ تو خدا کو پتا ہے کہ کس نے کس کے چاول پہلے اور کب کھانے ہیں۔"

قبل ازیں کہ وہ کار چلاتے، وہی ایم بی بی ایس ڈاکٹر آ گئے۔ ان کا کلینک گلی سے آگے بازار میں تھا۔ وہ کہنے لگے "چودھری صاحب! خدا کا خوف کریں۔ بزرگوں کو ایسا نہیں کہتے۔"

چودھری صاحب نے حسب دستور ان کی نصیحت کو ہنسی میں ٹال دیا۔ پھر گاڑی دوڑائی اور لیڈر کے ڈیرے پر پہنچے جہاں کافی لوگ ان کے منتظر تھے۔ ان کا استقبال ہوا۔ کرسی پیش کی گئی جہاں وہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھے دونوں پارٹیوں کی گفتگو سننے لگے۔

اتنے میں ملازم بوتل لے آیا۔ جونہی انھوں نے بوتل کو منہ لگایا فرشتہ اجل آ پہنچا۔ ان کی روح قفس عنصری

سے پرواز کر گئی۔ بوتل ہاتھ سے چھوٹ فرش پر جا گری۔ خود وہ کرسی پر ڈھلک گئے۔

"یہ کیا ہوگیا؟ یہ کیا ہوگیا؟" شور مچ اٹھا۔ لیڈر جو ابھی تک نہیں آئے تھے شور سن کر فوراً آ گئے۔ سارا ماجرا سنا، تو اپنی کار نکالی۔ چودھری صاحب کو دو آدمیوں نے پکڑا، ایک دائیں طرف دوسرا بائیں بیٹھا۔ لیڈر نے خود کار چلائی۔ سول اسپتال قریب ہی تھا۔ ڈاکٹر کو فوراً بلایا گیا۔ اس نے موت کی تصدیق کر دی۔

اب چارپائی منگوائی گئی۔ ان کے بے جان لاشے کو اس پر لٹا کپڑا چہرے پر ڈال دیا گیا۔ چودھری صاحب کے گھر فون پر اطلاع دی گئی۔ فون سنتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ دونوں بیٹے اور گلی کے کچھ افراد اسپتال پہنچے۔ اُن کے گھر اندر و باہر دریاں بچھا دی گئیں۔ وفات کی خبر سنتے ہی بیوی بے ہوش ہوگئی۔ اسپتال کی انتظامیہ نے لیڈر کی درخواست پر جلد از جلد قانونی کارروائی کی اور میت ان کے سپرد کر دی۔ وہ اسے ایمبولینس میں ڈال ان کے گھر لے آئے۔ مساجد میں اعلانات شروع ہوگئے "حضرات! ایک ضروری اعلان سماعت فرمائیے۔ شہر کے معروف صنعت کار اور سیاسی راہنما، چودھری محمد اسلم رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ نماز جنازہ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

جونہی مائی بختاں نے یہ اعلان سنا، وہ بھی لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے فوراً ان کے گھر پہنچ گئی۔ چارپائی کے پاس بیٹھی اور زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگی: "ہائے میرے پیارے بیٹے! اپنی ماں کے "لال" کھانے سے پہلے چل بسا۔ ماں کے "لال" کھا کر تو جاتا۔"

اس موت پر ہر کوئی اُداس تھا۔ لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ اب اس گھر کا کیا بنے گا؟ مرحوم کے صرف دو بچے

ضرورت سے بڑھ کر دستور کی پابندی

جناح مسلمانوں کے متفقہ لیڈر تھے اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے انھیں وسیع اختیارات حاصل تھے، پھر بھی وہ اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کرتے۔ جب بھی دستوری طور پر ضروری ہوتا پہلے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ یا کونسل کو منظوری لینے پر اصرار کرتے۔ مونٹ بیٹن اور دوسرے لوگ اس پر بے حد جھلاتے اور پیچ و تاب کھاتے۔ اُن کے خیال میں یہ ضرورت سے بڑھ کر دستور کی پابندی تھی۔ انھیں شبہ تھا کہ اس طرح جناح مہلت حاصل کرنے یا پابندی قبول نہ کرنے کی گہری چال چلتے تھے۔ درحقیقت یہ عمل اخلاص پر مبنی تھا۔ جناح کا اعتقاد تھا کہ انسان دستوری طور پر عطا کردہ اختیارات کی حد میں رہ کر ہی اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآں ہو سکتا ہے۔ (چودھری محمد علی)

بڑے تھے۔ ایک فرسٹ ایئر دوسرا جماعت دہم میں پڑھ رہا تھا۔ باقی بچے چھوٹے تھے۔ لیکن خدا سب کا مالک، خالق اور رازق ہے، اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔

یاد رکھیے، موت برحق ہے۔ موت کے ساتھ مذاق مت کیجیے اور نہ ہی کسی کو حقیر جانیے۔ ہو سکتا ہے جسے حقیر جانا یا سمجھا گیا خدا کے نزدیک وہی مرتبے والا ہو۔ ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کا عاجز بندہ سمجھیے۔ غرور و تکبر خدا کو پسند نہیں، اس سے پرہیز کیجیے۔ ہمارے دین کی بھی یہی تعلیم ہے۔

نہ جا اس کے تحمل پہ کہ بے ڈھب ہے گرفت اُس کی
ڈر اس کی ڈھیل سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

معاشرتی کہانی

بھیڑ بکریاں نہیں جیتے جاگتے انسانوں کا

ریاستی ظلم کا نشانہ بنے ایک مظلوم کی دردناک
بپتا، وہ آسمانی اشارے کے انتظار میں ہے

اُمِ ایمان

"سر......!" شبیر کی آواز پر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ میلے سے حلیے میں ایک آدمی کو لیے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے، یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ ساتھ ہی اس آدمی کو غور سے دیکھا۔ پینتیس چالیس کے درمیان عمر ہوگی۔ چہرے پر عجیب بے نیازی تھی۔ کپڑے بوسیدہ اور پاؤں میں پرانی پشاوری چپل......

"سر یہ آدمی کبھی ہمارے دفتر کے سامنے بیٹھا ہوتا ہے۔ کبھی سڑک پار اور کبھی کالونی کے مین گیٹ کے پاس۔ پچھلے ہفتے دس دن سے اس کا یہ ہی معمول ہے۔ مشکوک بندہ لگتا ہے۔"

"ہاں بھئی، کیا نام ہے تمھارا؟"

"آپ کو میرے نام سے کیا لینا دینا؟" جواب آیا۔

"ہوں! اچھا تم یہاں وہاں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میں تو بس انتظار کرتا ہوں......"

"کس کا انتظار؟ یہ کہہ کر میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی جاسوس یا ایجنٹ تھا تو بڑا کمال کا...... چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا...... بے نیازی کی سی کیفیت، نہ خوف نہ تردد، نہ صفائی پیش کرنے کا جذبہ...... بس چہرے پر یہ پیغام طاری تھا کہ "مجھے تمھاری نہ کوئی پروا ہے نہ کوئی خوف۔"

"واہ بھئی، بڑا جری ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ ہیڈ کوارٹر کے پاس ایسی دیدہ دلیری کے ساتھ ریکی کرنا اور ذرا خوف نہ کھانا! لیکن ابھی میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس پر غور کرتا...... شبیر کو اشارہ کیا کہ مہمان بنالو اور وہ بھی خاص لیکن میں آ کر اسے دیکھوں گا...... اچھی طرح تلاشی لے لینا...... رپورٹ مظہر کو دینا۔ باقی واپس آ کر بتاؤں گا......

میں پھر سوچنے لگا "ہونہہ! ہم چھٹیاں بھی اپنی مرضی سے نہیں گزار سکتے۔ اب کل کی پرواز سے لندن جانا ہے۔ سیاست دان اگر ملک کے اندر ہی اپنی جوڑ توڑ کی میٹنگ رکھ لیا کریں تو کتنا بھلا ہو...... ملک کا!! ویسے بھی وہ کون سا ٹکا اپنی جیب سے خرچ کرتے ہیں۔ بوجھ تو ملکی خزانے پر ہی پڑتا ہے...... پھر بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ ہم ان کے ساتھ ساتھ ٹھہرتے رہیں؟ لیکن نہیں بھئی، ہم کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے...... حکم تو حکم ہے بجا آوری لازم......

"میں بھی چلوں گی۔" جب میں نے بیگم کو اپنے دورے کا بتایا تو فرح سنتے ہی بولی۔

میں نے حیرت سے کہا "ارے، ایک فوجی کی بیوی ہو تم! ایسے دوروں میں اہل خانہ کو لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"اوہ ہو! بھئی کیا فوجی کی بیوی روبوٹ ہوتی ہے؟"

"جانتی تو ہو پھر بھی......" میں نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

بیکار ہے، کوئی بات بھی کرنا...... یہ وہ بھی جانتی ہے اور میں بھی۔ میں نے الماری سے دو قمیصیں اور دو پتلونیں نکال کر مسہری پر ڈال دیں۔ سامان باندھ دینا۔ کل صبح کی پرواز ہے۔ میں ذرا اپنی فائلیں دیکھ لوں" ...... میں نے فرح سے کہا۔

"بابا...... آپ پھر اکیلے جا رہے ہیں؟ آپ نے دبئی کی سیر کرانے کا وعدہ کیا تھا؟" دروازے پر روشنا، عدیلہ اور فاران کھڑے تھے۔

"ہوں تم لوگ...... کیسے؟...... سوئے نہیں؟"

"بابا ہم شب بخیر کہنے آئے تھے۔"

"میں تمھارے پاس آ ہی رہا تھا" میں نے فاران کو گود میں اٹھایا۔ روشنا اور عدیلہ کو پیار کیا۔ "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے...... ان شاء اللہ جلد چلیں گے۔" میں نے انھیں بہلا کر سونے بھیج دیا۔

لندن میں یہ تیسرا دن تھا جب مجھے کچھ گھنٹوں کی فرصت ملی۔ جب کہ ان کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہی خاص جن کے لیے انھیں کچھ تنہائی درکار تھی۔ پاکستان میں دفتر رپورٹ کر کے میں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ انھوں نے میری ڈیوٹی کچھ اور طرح کی نہیں لگائی۔

موسم سرد نہ تھا اور ہوا خوشگوار تھی، لہٰذا لندن کی ڈبل ڈیکر سے پورے شہر کے نظارے کا سوچا۔ ایسی بس کا انتخاب کیا جس کی چھت کھلی تھی۔ لندن کی سڑکیں تنگ ہیں لیکن ان پہ ہجوم نہیں ہوتا۔ ایک جگہ فٹ پاتھوں پر جگہ جگہ لمبی قطاریں لگی تھی۔ سیل والی دکانوں میں داخلے کے لیے لوگ صبر سے اپنی باری کے منتظر تھے۔ مادام تساؤ کا

عجائب گھر میں پہلے کئی دفعہ دیکھ چکا تھا۔ اس کے باہر بھی فٹ پاتھ پر غیر ملکی سیاح قطار لگائے اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔

مجھے یاد آیا، انگریزوں کا ہالووین (Halloween) تہوار آنے والا ہے۔ اس موقع پر مرد، عورت، بچہ بوڑھا ہر کوئی بھیس بدل کر دوسروں کو شرارتوں اور عملی مذاق کا نشانہ بناتا ہے۔ ہمارے ہاں سیاست دان اور حکومتیں ہی ہالووین تہوار مناتی ہیں۔ آخر انھیں اپنے عوام کو ڈرا دھمکا اور ڈرامے دکھا کر قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔ شوق عوام کو بھی ہے لیکن ڈرنے اور بیوقوف بننے کا...... سو بنتے رہتے ہیں۔ کوئی بننے کو تیار اور کوئی بنانے کو تو پھر بھلا جھگڑا کاہے کا ہے؟ میں نے اپنے اونگھتے ہوئے ضمیر کو تھپکیاں دیتے ہوئے سوچا۔

پچھلے چھ سات سال یہ معمول رہا کہ بیوقوف بنتے عوام میں سے جنھیں افسر شاہی مشکوک سمجھتی یا دوسرے الفاظ میں جو عقل مند بننے کی کوششیں کرتے، انھیں غائب کر دیا جاتا۔ بارہ سنگھوں، ہرنوں اور بھینسوں کے پیچھے لگے لگڑ بھگے موقع پاتے ہی کسی بچے کو غائب کر دیتے۔ باقی غول خوف کے باعث افراتفری کا شکار ہو کر تتر بتر ہو جاتا۔ پکڑے جانے والے بچے کی ماں امید اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت میں کچھ دیر شکاری کے پیچھے بھاگتی اور پھر تھک ہار کر دوبارہ تماشا دیکھتے ہوئے ریوڑ میں شامل ہو جاتی۔

بس اب ٹاور آف لندن کے پاس سے گزر رہی تھی۔ یہ انگریز بادشاہوں کی قلعہ نما رہائش گاہ ہے۔ انگریزوں کے پہلے بادشاہ کا دور ۱۰۶۶ء تا ۱۰۸۷ء تک رہا۔ یہ بات مجھے یوں یاد رہ گئی کہ پچھلی بار ٹاور آف لندن کی سیر کرتے کرتے مجھے لال قلعہ اور شاہی قلعہ بہت یاد آئے...... ہندوستان کے بادشاہوں کی قلعہ نما رہائش گاہیں۔ آج بھی وہاں جائیں تو ہیبت سی محسوس ہوتی ہے، بلند اور وسیع، کاریگری میں بے مثال! لیکن ٹاور آف لندن ساری سجاوٹ اور دیکھ بھال کے باوجود ایک مختلف تاثر چھوڑتا ہے۔

دماغ میں بار بار خیال آتا ہے کہ ہم بلند پایہ تاریخ رکھنے والی مضبوط اور بہادر قوم کے امین ہیں...... اس کے باوجود بار بار غلامی کی طرف لپکتے ہیں؟ آزاد ہونے کے بعد پھر غلام بننا اور بنے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ دراصل ہمارے ذہن غلام بن چکے۔ ذہنوں کو غلامی سے نجات اس صورت میں مل سکتی ہے کہ ہم اپنی اصل اور بنیاد کی طرف پلٹ جائیں۔ اس پر شرمانے اور جھجکنے کے بجائے فخر محسوس کریں۔ معمولی سی مثال ہے۔ میرا بیٹا میری انگریزی کے تلفظ میں غلطیاں نکالے تو میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں کہ کیا زبردست انگریزی بولتا ہے۔ جب کہ اردو کے الفاظ غلط بولے تو میں کبھی اسے نہیں ٹوکتا بلکہ اس کی ماں اپنی سہیلیوں سے فخریہ کہتی ہے ”میرے بیٹے کو اردو بولنا نہیں آتی۔“

آخر ہم کس قوم کے فرد اور کس ملک کے نمائندے ہیں؟

لندن میں تین کے بجائے چار دن لگ گئے۔ شاید جوڑ توڑ میں کچھ کسر رہ گئی تھی۔ صاحب سے الوداعی ملاقات اور اجازت کے بعد واپسی کا ارادہ کیا۔ واپسی کے بعد دفتر کا پہلا دن ہمیشہ انتہائی مصروف ہوتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب شام ہوئی۔ آخر فرح کا فون آیا ”کہاں ہیں؟“

”آ رہا ہوں بھئی...... آ رہا ہوں!“ میں نے فون رکھا۔ شبیر سر پر کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے شبیر؟“

”سر! آپ کے مہمان کا کیا کرنا ہے؟“

”مہمان؟“ پھر مجھے وہ یاد آ گیا۔ پوچھا ”کچھ بتایا

"اس نے؟"

"نہیں سر! بڑا پکا ہے۔ کچھ نہیں پھوٹتا، کہتا ہے عتیق کا ساتھی ہوں۔ وہ تم ہی لوگوں کے پاس ہے۔"

"بلاؤ اس کو، میں بھی دیکھوں کتنا بڑا جاسوس ہے اور کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ کوئی ایک دو تو ہیں نہیں...... دشمنوں کی پوری فوج ہے"...... میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

کچھ دیر میں دو سپاہی اسے پکڑ لائے۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ اچھی خاصی خاطر داری کی گئی تھی۔ لیکن چہرے پر وہی عجیب سی بے نیازی طاری تھی۔ لگتا تھا، اسے کسی چیز کی پروا ہی نہیں۔

"ہوں کیا بات ہے...... بولتے کیوں نہیں ہو؟" میں نے درشت لہجے میں مخاطب کیا۔

"کیا بتاؤں؟ بتاتا تو ہوں عتیق الرحمٰن کا ساتھی ہوں۔ اس کی ماں اور باپ، دونوں بیٹے کی گمشدگی کے بعد ذہنی مریض بن چکے۔ بتاؤ، کہاں ہے وہ؟"

میں نہیں وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا۔ "عتیق پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ اس کا باپ بوڑھا ہے۔"

"اچھا...... لیکن تم کس لیے بیٹھے رہتے ہو...... کس کی جاسوسی کر رہے تھے؟"

"ہونہہ...... میں...... میرے تو دونوں بھائی مار دیے گئے...... ماں باپ دونوں ختم ہو چکے۔ اب تو مجھے بس انتظار ہے" وہ مکمل سکون سے بولا

"انتظار؟ کس چیز کا؟"

"خدا کی پکڑ کا...... مظلوم کی دادرسی کا...... دیکھو کب ہوتی ہے؟"

اس نے اپنی سرخ آنکھوں کے ساتھ مجھے غور سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں نہ خوف تھا نہ تردد، نہ صفائی پیش کرنے کا جذبہ...... اور لہجہ برفیلا تھا۔ ایک کپکپاہٹ میرے دل سے نکل کر گویا جسم کے ایک ایک حصے پر طاری ہو گئی۔ قدموں نے بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ میں کرسی پر گر سا گیا۔ تبھی دل نے دعا مانگی "الٰہی! مجھے رب کی پکڑ اور مظلوم کی بددعا سے بچا لے۔

(قید اور لاپتا ہونے والے تمام افراد کے نام اصلی ہیں)

◆◆◆

"ہم کس لیے دنیا میں بھیجے گئے؟"

ایک دل گرفتہ شخص اشکبار تھا۔ کسی نے اس سے گریہ و زاری کا سبب پوچھا تو گویا ہوا کہ میری ہر خواہش ہی حسرت بن جاتی ہے۔ نہایت عسرت سے زندگی بسر ہو رہی ہے، خودکشی کرنے کا ارادہ باندھتا ہوں لیکن خوف زدہ ہو کر یہ ارادہ بھی ترک کر دیتا ہوں بزدل جو ہوں۔

"تم بزدل نہیں ناشکرے ہو اور خودترسی کے مرض میں مبتلا ہو" دوسرے شخص نے یہ بات سن کر حقیقت کے آئینے میں اسے اس کی اصلی صورت دکھائی جس سے وہ آج تک خود ناآشنا تھا۔

ذرا سوچیے ہم دنیا کو جنت بنانے آئے ہیں یا یہاں جنت خریدنے؟ اگر زندگی حسب خواہش نہ گزر رہی ہو، تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ سے ناشکرے پن کا اظہار کیا جائے اور اس خالق کائنات سے شکوہ کیا جائے؟ ہم اس دنیا میں کیوں بھیجے گئے ہیں؟ کیا اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے؟ یا کوئی اور سبب ہے؟

اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ہمیں دے دیا یہ کہ: "ہم نے جن و انس کو اپنی عبادت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔" اس لیے انسان اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق بسر کرے تاکہ دنیاوی لالچ و خواہشات اور ہوس و آرزو میں اتنا مبتلا نہ ہو کہ اللہ سے ہی بے نیاز ہو جائے۔ اس طرح دنیا میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ (صباحت افضل، منصورہ)

مظفرآباد

میں رحم دل کی واحد دکان تھی جہاں کھوٹے سکے بھی بآسانی چل جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ جس کے پاس کھوٹا سکہ ہوتا وہ، بلا جھجک رحم دل کی دکان پر آتا اور اپنی مطلوبہ شے حاصل کر لیتا۔ رحم دل بھی بلا دیکھے کھوٹا سکہ لیتا اور اپنے غلے میں ڈال دیتا۔ یہ اس کا برسوں سے معمول چلا آرہا تھا۔ اسے کھرے کھوٹے کی اچھی طرح تمیز تھی تاہم ایک مقصد تھا جو رحم دل کو شہر بھر کے کھوٹے سکے لے کر اصلی سودا دینے پر آمادہ رکھتا۔ کئی بار اپنوں اور خودگاہکوں نے اُس کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ مگر رحم دل یہ نقصان کی دکانداری کرتا رہا۔ آخر لوگوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا۔

دراصل رحم دل سوچا کرتا، میں گناہ گار انسان ہوں۔

جہاں کشمیر

لیکن یہ نیکی ضرور کر سکتا ہوں کہ اللہ کے بندے میری دکان سے مایوس نہ لوٹیں۔ جس طرح میں کھوٹے سکے لے لیتا ہوں، روزِ محشر شاید اللہ تعالیٰ مجھ کھوٹے سکے کو بھی قبول کر لے اور جنت میں داخل کر دے۔ اللہ بڑا غفور اور رحیم و کریم ہے، وہ مجھے ضرور بخش دے گا۔

رحم دل کی تو سوچ یہ تھی مگر اس کا بیٹا، خوشحال خان بھی کھوٹا سکہ ہی ثابت ہوا۔ اولاد ماں باپ کے لیے باعث راحت ہوتی ہے۔ خوابوں کی تعبیر بن کر ان کے لیے خوشیوں کا سبب بنتی ہے۔ لیکن خوشحال خان تو اس کے لیے باعث ندامت بن گیا۔ بیٹے کی شکایتوں کا دفتر ہر شام اس کے گھر لگتا۔ آئے دن جھگڑوں کا سن سن کر رحم دل کے کان

کھوٹا سکہ

ایک اچھی قسمت والے شخص کا اچھوتا ماجرا' وہ جسے کوئلہ سمجھتا تھا' حقیقت میں ہیرا نکل آیا

شیخ فرید
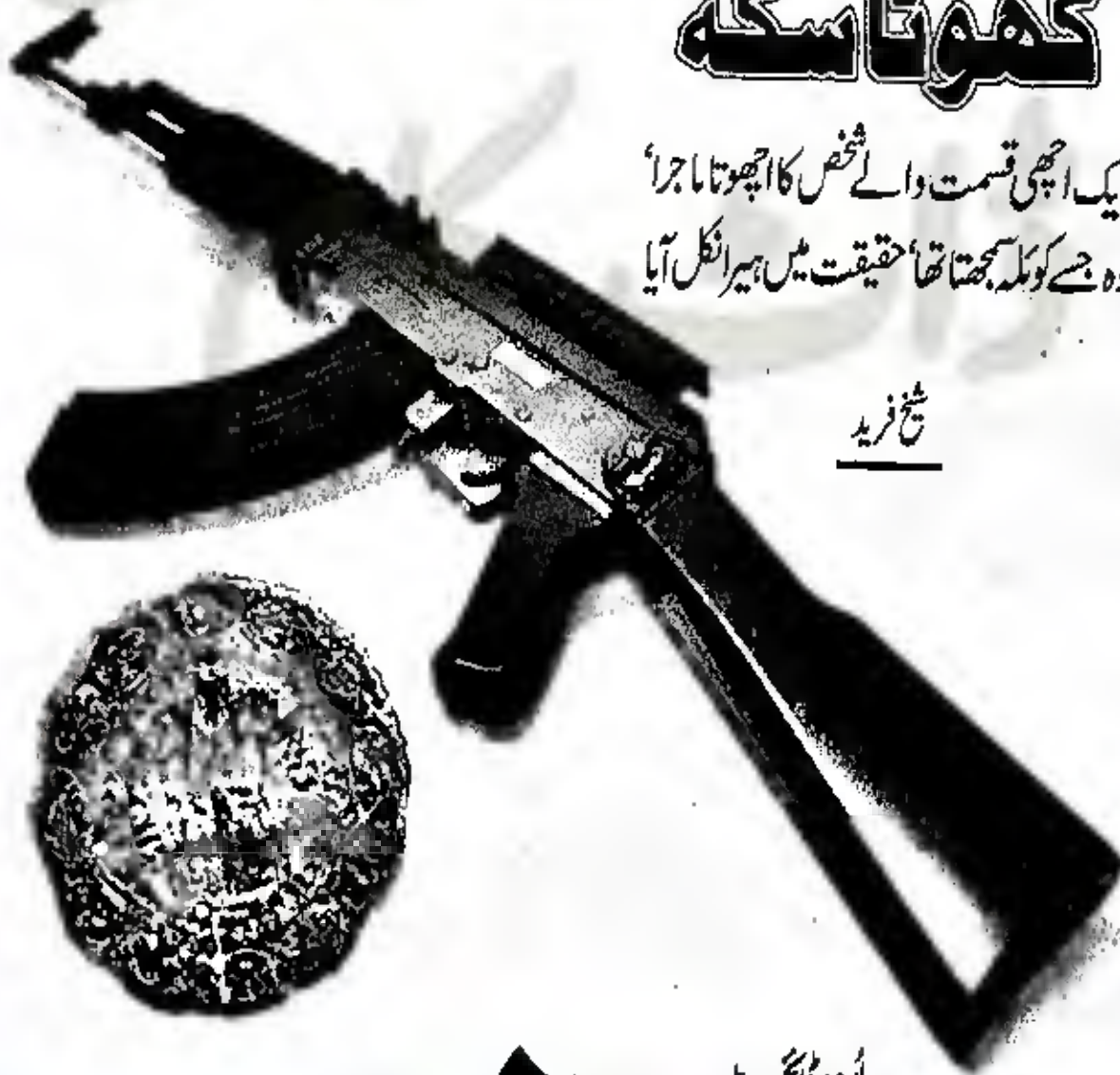
پک گئے تھے۔ وہ جب دن بھر کا تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو وہاں خوشحال خان کے ہاتھوں ستائے لوگ جمع ہوتے۔

کوئی کہتا، لڑکے نے اس کے کھیتوں میں گھس کر فصلیں خراب کر دیں۔ دوسرا بولتا، خوشحال نے اس کے چھوٹے بچوں کو خواہ مخواہ مارا پیٹا۔ کوئی اپنی مرغیوں اور بکریوں کا رونا روتا جنھیں اس نے اپنی غلیل سے زخمی کر دیا۔ الغرض رحم دل کا بیٹا وبال جان بنا ہوا تھا۔ نہ ماں باپ کا کہنا مانتا، نہ بڑوں کا ادب کرتا اور نہ ہی پڑھتا لکھتا۔ اس کا سارا دن نت نئی شرارتوں میں گزرتا۔

رحم دل بیٹے کی کارستانیاں سن کر اپنا سر پکڑ لیتا اور کہتا ''اے اللہ! دکان پر تو میں کھوٹے سکے بنا کچھ کہے چپ چاپ لے لیتا ہوں۔ مگر تو نے بھی مجھے جو بیٹا دیا، وہ کھوٹا ہی نکلا۔ آخر...... آخر کیوں؟ کیا میرے ہی نصیب میں سارے کھوٹے سکے لکھے تھے؟ تیرے لکھے کو کون پڑھ پایا ہے؟ آہ...... میرا نصیب!''

وہ پھر بے چارگی اور التجائیہ انداز میں گردن آسمان کی طرف اٹھاتا جیسے اپنے مقدر کا گلہ کر رہا ہو! دوسرے ہی لمحے صبر کا گھونٹ بھر کر رہ جاتا کہ شاید اسی میں کوئی بہتری ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ اس دوران بھارتی فوج نے مقبوضہ کشمیر کے باسیوں پر ظلم کی انتہا کر دی۔ تب آزاد کشمیر کے ہر گھر سے کوئی نہ کوئی جوان محاذ جنگ کی سمت جانے لگا۔

بھائی رحیم نے تو اپنے دونوں بیٹے جہاد کشمیر کے لیے روانہ کر دیے۔ وہ فخریہ انداز میں کہتے ''اللہ نے مجھے دو بیٹے دیے تھے، دونوں ہی کو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے بھیج دیا۔ فتح پائی تو غازی ورنہ شہادت کا رتبہ تو ملے گا۔'' یہ کہتے ہی بھائی رحیم کا سینہ تن جاتا اور آنکھوں میں چمک سی آجاتی۔

مگر رحم دل یہ سنتا شرمندہ سا ہو جاتا کیونکہ اس کا بیٹا تو دین کا تھا نہ دنیا کا! ایک روز خوشحال خان باپ سے کہنے لگا ''ابا! میں بھی جہاد پر جاؤں گا۔ مجاہد بنوں گا۔''

''ہونہہ! کبھی کھوٹے سکے بھی چلے ہیں بے وقوفا!'' رحم دل نے بے پروائی سے کہا۔

ایک روز پتا چلا کہ وہ مجاہدین کے قافلے میں شامل ہو کر چلا گیا ہے۔ ان کے ساتھ فوجی تربیت حاصل کر کے جہاد میں شریک ہوگا۔

یہ جان کر رحم دل کو یقین نہ آیا۔ وہ سوچنے لگا ''کبھی کھوٹے سکے بھی کام آئے ہیں مگر شاید......''

مسرت اور ایمان افروز خوشی کی ایک ننھی سی لہر اس کے دل میں امنڈ آئی۔ پھر جوان بیٹے کی جدائی کا ہلکا سا درد بدن میں ہچکولے لینے لگا۔ لیکن بیٹے سے دوری پہ جذبہ ایمان حاوی تھا۔ غمگین ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھا کہ چلو خوشحال خان کسی کے کام تو آیا۔ میرے نہ سہی قوم کے لیے تو کچھ کر جائے گا۔

وقت دھیرے دھیرے اپنی چال چلتا رہا۔ ایک رات پچھلے پہر دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ رحم دل گھبرا کر جلدی سے اٹھا۔ دروازہ کھولا تو چند مردوں کو سامنے کھڑے پایا۔ ''کیا بات ہے بھائی؟'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''اللہ قبول فرمائے۔'' آدمیوں میں سے ایک آہستہ آواز میں بولا۔

''کیا کہا؟'' رحم دل نے پوچھا۔

''تمھارے بیٹے کو شہادت نصیب ہوئی۔'' دوسرے شخص نے بتایا۔

''کیا کہا...... میرا...... میرا خوشحال خان، شہید ہو گیا۔''

◆◆◆

وقت سے پہلے بڑھاپا طاری ہونے کا خوف اکثر لوگوں کے لیے تشویش کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ہمارے چہرے مہرے اور جسمانی خدوخال میں نمایاں تبدیلیاں آتی ہیں بلکہ مجموعی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ گزشتہ عشروں کے دوران طب کی دنیا میں انقلابی ترقی ہوئی ہے۔ نتیجے میں قبل از وقت بڑھاپے کی آمد نہ صرف سست کرنا بلکہ بعض معاملات میں جسمانی علامتوں کو ٹالنا بھی ممکن ہوگیا۔ بڑھاپا ایک حقیقت ہے اور اسے ہم چاہیں بھی تو دیر تک روک نہیں سکتے۔ البتہ ہمیں چاہیے کہ زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں کچھ مثبت تبدیلیاں لے آئیں تاکہ وقت سے پہلے بڑھاپے کی منزل میں داخل نہ ہوں۔ ذیل میں ان غیر صحت مند عادات کا تذکرہ پیش ہے جو بے خبری میں آپ کو بہ سرعت بڑھاپے کی طرف لے جاسکتی ہیں۔

حد سے زیادہ فکرمندی

ذہنی دباؤ حقیقی معنوں میں انسان کی دماغی، جذباتی

ابھی تو میں جوان ہوں......

بڑھاپا روکنے کے سات راز

ان غیر صحت مند عادات کا طبی تذکرہ جو قبل از وقت آپ کو بڑھاپے میں مبتلا کردیتی ہیں

رضیہ جمیل

ابھی تو میں جوان ہوں......

بڑھاپا روکنے کے سات راز

ان غیر صحت مند عادات کا طبی تذکرہ جو قبل از وقت آپ کو بڑھاپے میں مبتلا کر دیتی ہیں

رضیہ جمیل

وقت سے پہلے بڑھاپا طاری ہونے کا خوف اکثر لوگوں کے لیے تشویش کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ہمارے چہرے مہرے اور جسمانی خدوخال میں نمایاں تبدیلیاں آتی ہیں بلکہ مجموعی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ گزشتہ عشروں کے دوران طب کی دنیا میں انقلابی ترقی ہوئی ہے۔ نتیجے میں قبل از وقت بڑھاپے کی آمد نہ صرف سست کرنا بلکہ بعض معاملات میں جسمانی علامتوں کو ٹالنا بھی ممکن ہو گیا۔

بڑھاپا ایک حقیقت ہے اور اسے ہم چاہیں بھی تو دیر تک روک نہیں سکتے۔ البتہ ہمیں چاہیے کہ زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں کچھ مثبت تبدیلیاں لے آئیں تاکہ وقت سے پہلے بڑھاپے کی منزل میں داخل نہ ہوں۔ ذیل میں ان غیر صحت مند عادات کا تذکرہ پیش ہے جو بے خبری میں آپ کو بہ سرعت بڑھاپے کی طرف لے جا سکتی ہیں۔

حد سے زیادہ فکر مندی

ذہنی دباؤ حقیقی معنوں میں انسان کی دماغی، جذباتی

اور جسمانی صحت پر تباہ کن اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس لیے ہر ممکن کوشش کیجیے کہ ذہنی دباؤ آپ کی زندگی میں مداخلت نہ کرے۔ کیا آپ ان لوگوں میں شامل ہیں، جو ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں؟ کیا آپ ہر پیش آمدہ معاملے پر ذہن کو دباؤ میں لے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان معاملات میں بھی، جن کا آپ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا؟

اگر ایسا ہے، تو آپ زندگی کے نشیب و فراز کو بہت زیادہ سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ یہ عادت بلاشبہ بڑھاپا طاری ہونے کی رفتار تیز کر دے گی۔ ذہنی دباؤ بڑھاپے کو ہوا کیوں دیتا ہے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ جب عمر میں اضافہ ہونے لگے، تو دو "منفی" ہارمونوں نوراپائن فیرین (Norepinephrine) اور کورٹیسول (Cortisol) کا اخراج بڑھ جاتا ہے۔ ان کے باعث جسم کا مدافعتی نظام متاثر ہوتا ہے اور فشار خون بڑھنے لگتا ہے۔ نتیجتاً سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زوال پذیر ہوتی اور امراض قلب کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ایسی صورت میں آپ ہفتے میں کم از کم دو بار خود کو پرسکون کرنے کی کوئی تکنیک آزمائیے، جس میں خوشبو سے علاج (Aromatherapy) سے لے کر یوگا کی مشقیں تک شامل ہیں۔ کوئی ایسا کام بھی کیجیے جس سے آپ کے ذہن کو سکون ملے اور دماغی بوجھ دور ہو سکے۔

جلد کی حفاظت

ہمارے جسم میں جلد ایک اہم اور حساس عضو ہے۔ اس کی جانب سے غفلت بھی بڑھاپے کو قبل از وقت لانے میں مددگار بنتی ہے۔ جلد کی حفاظت کا مطلب یہی نہیں کہ آپ چہرے پہ اور آنکھوں کے حلقوں کے گرد روزانہ کی بنیاد پر کریمیں لگائیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ہمارے جسم کو ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہے۔ آپ روزانہ ۸ گلاس پانی پینا معمول بنا لیں۔ نیز آنکھوں اور چہرے پر کوئی اچھی کریم اس مقصد کے لیے لگائیں کہ جھریاں نہ پڑیں، تو یقیناً بڑھاپے کا عمل سست پڑ سکتا ہے۔

جلد کی قسم سے مطابقت رکھنے والے موئسچرائزرز کے استعمال سے بھی جلد کم عمر نظر آتی ہے۔ جلد کی اچھی طرح دیکھ بھال اگر آپ اپنا معمول بنا لیں، تو اس سے کولاجن اور ایلاسٹن کی قدرتی پیداوار کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ قدرتی پروٹین جلد کو شگفتہ اور شاداب رکھتے ہیں۔ ان کی کمی سے جلد پر جھریاں اور شکنیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔

غیر صحت بخش غذائیں

بچپن میں والدین اگر ہمیں سبزیاں کھانے کی تلقین کیا کرتے، تو اس میں بڑی حکمت تھی۔ اگر آپ کی غذا میں وافر پھل اور سبزیاں شامل نہیں جو غیر تکسیدی مادوں (اینٹی آکسیڈنٹس) سے بھری ہوتی ہیں، تو لازم ہے اس مسئلے پر توجہ دیں۔ غیر تکسیدی مادے زہریلے آزاد اصلیوں (فری ریڈیکلز) کے خاتمے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آسان الفاظ میں یوں سمجھیے کہ جسم میں آزاد اصلیے جلد کے بالائی خلیات کو ہدف بناتے اور انھیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ نتیجے میں جھریاں بنتی ہیں اور مختلف اقسام سرطان چمٹنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ آپ یہ خطرہ روزانہ پھل اور سبزیاں کھانے سے ٹال سکتے ہیں۔

ورزش سے گریز

غیر متحرک طرز زندگی سے جو طبی خطرات لاحق ہو سکتے ہیں، وہ اب راز نہیں رہے۔ ورزش کے بغیر زندگی گزاری جائے، تو نہ صرف موٹاپے کی شکایت پیدا ہوتی ہے جس کے ضمنی مضر اثرات بھی بہت واضح ہیں، بلکہ قلب، شریانوں اور گردے کے امراض بھی بڑھ جاتے

ہیں۔ آپ کو جوان، صحت مند اور تازہ دم نظر آنے کے لیے صرف یہ کرنا ہے کہ روزانہ کی بنیاد پر کم از کم ۳۰ منٹ ایسی ورزش کریں، جس سے دل معمول سے زیادہ دھڑکنے لگے۔ ورزش سے نہ صرف بڑھاپے کی آمد کو کسی حد تک مؤخر کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس میں باقاعدگی اختیار کر کے زندگی کے دورانیے میں کم از کم ''ایک عشرے'' کا اضافہ کرنا بھی ممکن ہے۔

نیند کو نظر انداز کرنا

جب ہم چھوٹے تھے، تو والدین کہتے کہ جلد سو جاؤ۔ ہم اکثر ان کی تاکید نظر انداز کر دیا کرتے۔ اب جب کہ ہم بالغ ہو چکے، ہمیں نیند بہت زیادہ آ بھی رہی ہو، تو مصروفیت کی وجہ سے سو نہیں پاتے۔ تاہم یہ انتہائی ضروری ہے کہ رات کے وقت آپ اپنی نیند اچھی پوری کیجیے۔ نیند کی کمی سے متعلق عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس سے صرف آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ نیند پوری نہ ہو، تو آپ خود کو تھکا ہارا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن نیند سے محرومی پہ صرف جمالیاتی نقصان نہیں ہوتا۔ اوسطاً ایک صحت مند بالغ شخص کو ہر رات لگ بھگ سات گھنٹے کی نیند لینی چاہیے، تاکہ وہ دوسرے دن کام کے لیے ذہنی طور پر چوکس ہو۔ اگر آپ نے نیند مکمل نہ کی، تو ممکن ہے آپ دن بھر تھکاوٹ اور سستی کا شکار رہیں۔ نیند کی کمی سے یہ بھی ممکن ہے کہ آپ معمول سے زیادہ کھانے لگیں۔

سن اسکرین استعمال نہ کیجیے

اکثر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ تیز دھوپ میں نکلتے ہوئے اپنا چہرہ اور بازو نہیں ڈھکتے اور نہ ان پہ سن اسکرین لوشن لگاتے ہیں۔ یہ کریم یا لوشن ہمیں دھوپ کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ بہت سی خواتین دھوپ سے حفاظت کے لیے اپنی میک اپ مصنوعات پر بھروسا کرتی ہیں۔ زیادہ تر فاؤنڈیشن کریموں میں ''سن پروٹیکشن'' کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے، لیکن اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے چلچلاتی دھوپ میں گھر سے باہر جاتے ہوئے جسم ڈھک کر رکھیے۔ یا پھر سن اسکرین لگانا نہ بھولیں تاکہ جلد پر بھورے دھبے اور شکنیں نمودار نہیں ہوں۔

سگریٹ نوشی

یہ انتہائی مضر صحت عادت ہے۔ سگریٹ نوشی بلاشبہ بڑھاپے کی آمد میں تیزی لاتی ہے۔ طویل عرصے تک سگریٹ پینے والے افراد کے دانت پیلے ہو جاتے ہیں۔ سگریٹ کا دھواں نکلنے سے جلد پر اس کے بھیانک اثرات پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر نہ صرف جھریاں پڑتی ہیں بلکہ سرطان کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ خاص طور پر منہ اور پھیپھڑے کے سرطان میں سگریٹ نوشوں کے مبتلا ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی بہت معروف ہے کہ سگریٹ نوشی امراض قلب کا خطرہ بڑھا دیتی ہے۔

ازدواجی نا آسودگی

خوشگوار ازدواجی تعلقات سے جسم و ذہن، دونوں پرسکون رہتے ہیں۔ صنفی سرگرمیاں دراصل افسردگی دور کرنے والے قدرتی وسیلہ (Natural Antideprissant) ہیں، جن سے مزاج فوری طور پر بہتر ہو جاتا ہے۔ بے شمار جائزے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ متوازن صنفی زندگی گزارنے والے افراد صحت مند رہتے ہیں۔ ان سرگرمیوں سے جسم میں ''انڈورفین'' اور دیگر ضروری کیمیائی مادے خارج ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت مدافعتی نظام کی کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے۔ ذہنی دباؤ گھٹتا اور بعض مخصوص امراض بشمول سرطان کا خطرہ بھی ٹل جاتا ہے۔ ◆◆◆

ہمارے عوام سے زیادہ خوش قسمت

شیخو کی بھینس!

اس کو تو بھرپور توجہ میسر آ گئی مگر افسوس پاکستانیوں کا کوئی پرسان حال نہیں

تنویر آرائیں

وہ اپنی بیمار بھینس کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ اس نے طرح طرح کے ٹوٹکے آزمائے مگر بھینس نے ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لیا۔ آخر کار جب سب ٹوٹکے بیکار ہو گئے، تو شیخو نے شہر کا رخ کیا۔ طویل سفر طے کر کے وہاں مقیم ڈنگر ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ اُسے ساتھ لیا اور گاؤں واپس آیا۔

ڈاکٹر نے بھینس کا معائنہ کر کے شیخو کو ادویہ دیں اور تلقین کی کہ وہ صحیح وقت پر دی جائیں۔ ورنہ ذرا سی بھی غفلت جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ سننا تھا کہ شیخو مزید پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنا آرام اور دیگر مصروفیات ترک کر کے پوری توجہ بھینس پر مرکوز کر دی۔ آخر کار بھینس آہستہ آہستہ
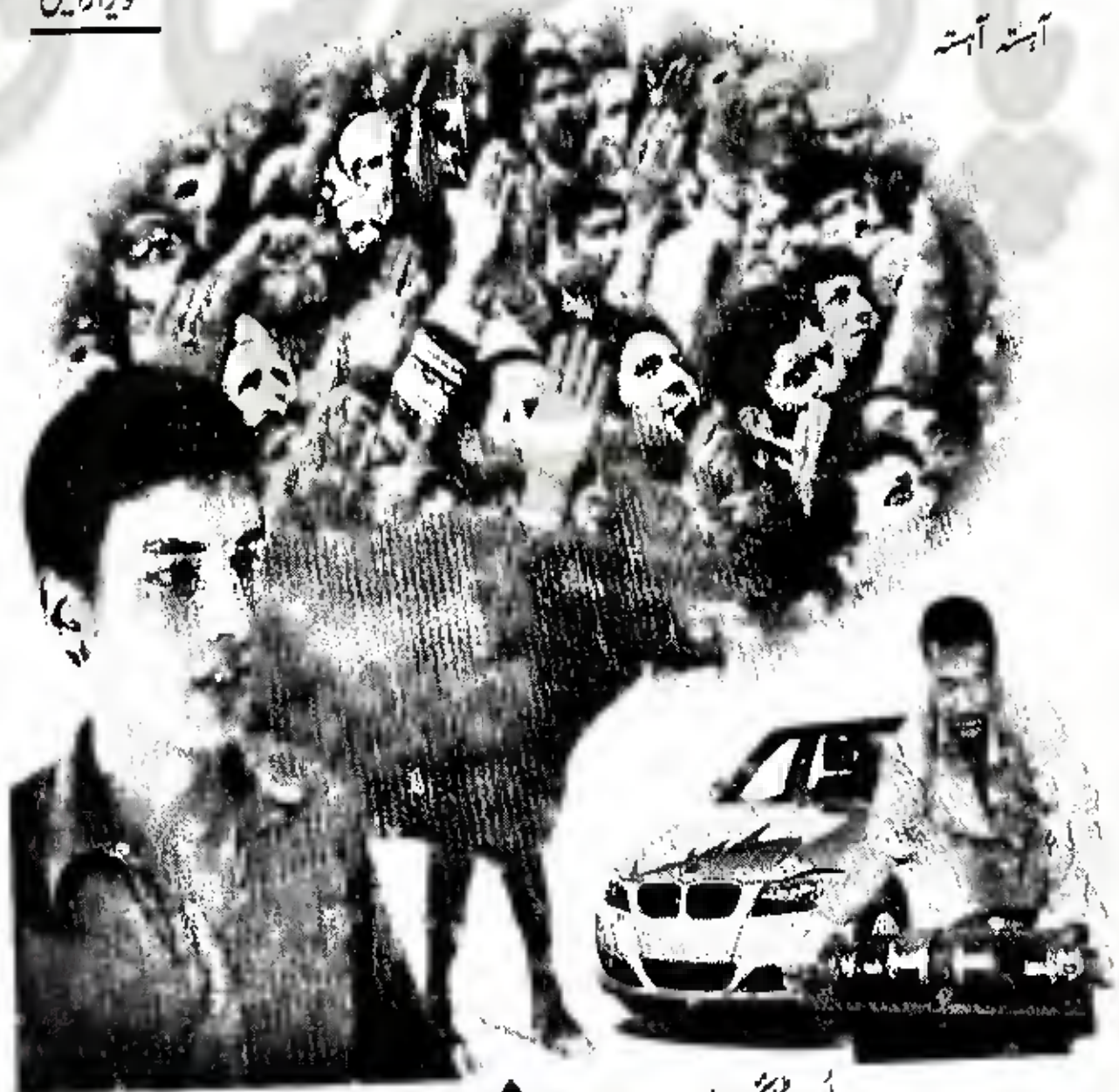
تندرست ہونے لگی۔ اب شینخو بھی مطمئن ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری طرح صحت مند ہوگئی۔

مگر یہ کیا! شینخو یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ بھینس پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند دکھائی دینے لگی اور دودھ میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اس تبدیلی کی بابت وہ کئی دن سوچتا رہا۔ پھر اس پر یہ راز افشاں ہوا کہ ٹھیک طریقے، محنت، لگن اور سچائی سے دیکھ بھال کرنے کے باعث ہی یہ سب کچھ ممکن ہوا۔

اب شینخو کا یہ معمول بن گیا کہ وہ صبح سویرے اٹھتا، مویشیوں کو چارہ ڈالتا، انھیں نہلاتا، پانی پلاتا اور اُن کی صفائی ستھرائی کا باقاعدگی سے خیال رکھتا۔ اگر مچھر ہوتے تو سوکھا گوبر جلا کر دھونی دیتا۔ اب شینخو ہر وقت اپنے ذہن میں یہ بات رکھتا کہ اگر وہ اپنے مویشیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے گا تو وہ بھی عمدہ پیداوار دیں گے۔

ایک دن شینخو اپنے کسی دوست سے ملنے شہر گیا۔ دیکھا کہ اس کا دوست بہت پریشان ہے۔ وجہ دریافت کی تو پتا چلا کہ جس گاڑی میں اُس کا دوست روزانہ دفتر جاتا تھا، وہ خراب رہنے لگی ہے۔ اس وجہ سے وہ پریشانی میں مبتلا ہے۔ شینخو نے بھی اسے اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا کہ کیسے وہ اپنی بھینس کے لیے پریشان تھا، کس طرح وہ ٹھیک ہوئی اور اب حیرت انگیز طور پر دودھ بھی زیادہ دے رہی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بیماری کی حالت میں اپنی بھینس کی کیونکر سیوا کی تھی۔

''پڑھا لکھا'' دوست شینخو کی باتوں کا مذاق اڑانے اور دل ہی دل میں سوچنے لگا ''میں اپنی گاڑی کی خرابی کی وجہ سے ہونے والی پریشانی کا تذکرہ کر رہا ہوں اور یہ ان پڑھ گنوار بیچ میں بھینس کو گھسا بیٹھا...... بھلا گاڑی کا بھینس سے کیا تعلق؟

خیر شینخو اس سے مل کر واپس گاؤں چلا گیا۔ دوسرے دن شینخو کا دوست گاڑی لینے مستری کے پاس گیا۔ معائنے کے بعد مستری نے اسے مشورہ دیا کہ گاڑی کے تیل پانی کا خیال رکھو۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ ہی سے گاڑی خراب ہوتی ہے۔ وہ گاڑی لے کر واپس آ گیا۔

رات کو جب وہ بستر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا اسے پھر شینخو کی باتیں یاد آئیں۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ قریب بیٹھی بیوی نے پوچھا کہ آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟ اس نے اپنے ان پڑھ گنوار دیہاتی دوست کا قصہ سنایا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

بیوی نے تھوڑی دیر بعد دوسرا سوال کیا ''گاڑی میں خرابی کیا تھی اور مستری کیا کہتا ہے؟''

شوہر نے مستری کے مشورہ کا بتایا، تو بیوی ہنسنے لگی۔ اس نے حیرت سے پوچھا ''اب تم کیوں ہنس رہی ہو؟''

بیوی نے جواب دیا ''آپ اپنے جاہل دوست کی باتوں پر غور کیجیے مستری کے پاس جانے اور اس کا مشورہ سننے سے پہلے ہی آپ کا دوست یہ مشورہ دے گیا تھا۔ جسے آپ جاہل کہہ رہے ہیں وہ آپ سے بہت زیادہ ذہین ہے۔''

یہ سن کر اس آدمی کی آنکھیں کھل گئیں۔ دوست نے شینخو کا مشورہ پلے باندھ لیا۔ اب وہ روزانہ صبح دفتر جانے سے قبل اپنی گاڑی کا تیل پانی چیک کرتا۔ کمی کی صورت میں اسے پورا کرتا، اگر ضرورت ہوتی تو ٹائروں میں ہوا بھرواتا، اب اسے بار بار کی پریشانی نہ ہوتی، کیوں کہ گاڑی صحیح طرح چل رہی تھی۔

یہ تو تھا شینخو اور اس کے دوست کا قصہ، لیکن ہمارے وطن عزیز میں نہ تو کوئی شینخو ہے اور نہ ہی اس کا دوست، تو بھلا حالات کیسے ٹھیک ہوں گے؟

بڑھتی مہنگائی، بھوک، بیروزگاری، لاقانونیت، کرپشن اور دہشت گردی کی بیماری ہمارے جسموں کو کوڑھ کے مرض سے بھی زیادہ بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ ہمارے ملک کو آزادی سے لے کر اب تک کوئی بھی شیخو نہیں مل سکا۔ آج تک برسر اقتدار رہنے والوں میں کوئی فالج زدہ، کوئی بھوک کا مارا ہوا تھا، تو کوئی سرمایہ اکٹھا کرنے کی ہوس میں مبتلا، تو چوتھا اقتدار کے ہاتھوں مجبور تو کوئی مارشل لا کا پروردہ۔ اسی باعث اس ملک میں رہنے والی مخلوق شیخو کی بھینس سے بھی زیادہ لاچار و بے بس نظر آتی ہے۔

ہمارے حکمران اقتدار کے نشے میں دھت اپنی قوم کو بھول بیٹھے۔ ان کی نظر میں یہ قوم جانوروں سے بھی بدتر ہے کیوں کہ جو لوگ مویشی پالیں، وہ ان کا خیال ہمارے ملک کے حکمرانوں سے اچھا رکھتے ہیں۔

حکمرانوں کی اس روش کا اگر تاریخی تجزیہ کیا جائے تو بھی ہمیں اپنی تاریخ میں بھی لوٹ کھسوٹ کرنے والے ملتے ہیں۔ حصول اقتدار کے بعد کسی نے کھوپڑیوں کے منار بنوائے، کسی نے باپ کو اندھا کروایا، تو کسی نے بھائیوں کو قتل کروایا۔ ہماری تاریخ میں جب معاش کی بات آئے، تو دو وقت پیٹ بھر کر کھانے ہی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے ماضی میں عام آدمی کی معاشی حالت کا اندازہ لگانا ممکن ہے۔ عام لوگوں میں تین وقت کے کھانے کا تصور ہی نہ تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد بھی دو وقت کے کھانے پر اکتفا کرتے۔ جسے دو وقت کا کھانا میسر رہا، وہ دوسروں کی نظر میں بہتر ہے اور تھا۔

پرانی روایات مدنظر رکھتے ہوئے آج بھی ہمارے سیاستدان الیکشن کو جنگ سمجھ کر لڑتے ہیں۔ انتخابات میں بھرپور طاقت کا استعمال ہوتا ہے۔ جو فتح حاصل کر لے، وہ پاکستان کے اداروں اور عوام کو مال غنیمت سمجھتا ہے۔ تخت و تاج حاصل کرنے کے بعد وہ تاریخ مدنظر رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اداروں کو لوٹنے اور مال غنیمت میں ملے عوام نما غلاموں (یا غلام صفت عوام) کو بڑی مہارت سے استعمال کرتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے رومن دور میں ہوتا تھا۔ امیر طبقہ ان سے بغیر معاوضہ محل تعمیر کرواتا اور سخت محنت و مشقت کرانے کے باوجود انھیں کوئی انعام نہ دیتا۔

آج بھی عوام اپنا خون پسینا ملک کے لیے بہا رہے ہیں۔ جبکہ حکمران ان کا بھرپور استحصال کرتے ہیں۔ وہ باخبر ہیں کہ اگلے پانچ سال میں پھر کوئی اور فاتح آئے گا۔ تخت و تاج اُس کے پاس چلا جائے گا، لہٰذا پانچ سال میں جو کچھ سمیٹ سکتے ہیں، سمیٹ لیں۔

بدقسمتی سے پاکستانی عوام کو پالتو جانور یا مشینری جتنی سہولتیں بھی میسر نہیں۔ اس ملک کو "شیخو" جیسا حکمران بھی نہیں ملا۔ اسے قوم کی بدنصیبی کہیے یا کچھ اور اس کا فیصلہ عوام ہی کر سکتی ہے مگر قوم کو اس وقت "شیخو" کی ضرورت ہے!

◆◆◆

لفظ لفظ موتی

- شرافت محض عقل و ادب سے ہے نہ کہ مال اور اعلیٰ منصب سے!
- جب توجہ کا مرکز اپنی ہی ذات کی خوبیاں ہوں تو انسان اپنی اصلاح میں سست اور تنقید میں چست ہو جاتا ہے۔
- جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں، وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ (رابعہ شکور، فیصل آباد)

آغا حشر کاشمیری کے دیس

بنارس کا کیا کہنا

ایک نامور سیاح کی زبانی مسلمانانِ ہند کے علمی و ادبی گہوارے کا معلومات افروز تذکرہ

رضا علی عابدی

الہ آباد سے آگے تک جہاں جہاں جی ٹی روڈ چلی، ساتھ ساتھ سیدھے سپاٹ کھیت نظر آتے رہے۔ تپتی دھوپ میں آنکھیں سائے کے منظر دیکھنے کو ترس گئی تھیں کہ اچانک درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ باغوں کی ٹھنڈی چھاؤں آئی اور ان کے ساتھ کوئل کی وہ پکار جسے سن کر آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے 'آنکھ کا نشہ' کا وہ گانا ذہن میں مچلا:

کوئلیا مت کر پکار...... کریجوا لاگے کٹار

پھر اچانک یاد آیا کہ یہی بنارس تو آغا حشر کا شہر ہے۔ بمبئی اور کلکتے کے تھیٹر سے نکل کر جس کی پکار ادب اور ناٹک کی دنیا کے کونے کونے تک گئی، یہ اسی آغا حشر کی بستی ہے۔ چلیں اور وہ گلیاں اور وہ در و دیوار ڈھونڈیں جن میں ایسا عہد ساز ذہن پروان چڑھا۔ گنگا کی لہروں کے دھیمے دھیمے تھپیڑوں اور باغوں میں کوئل کی پکاروں نے جس کے دل میں کیسا سوز و گداز نہ بھرا ہوگا۔ چناں چہ ہم گئے اور نہ صرف آغا حشر کی گلیاں ڈھونڈ نکالیں بلکہ ان کے

سوز و گداز کی داستانیں سنانے والی ایک شخصیت کو بھی پا لیا۔ وہ تھے آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کے بھتیجے آغا جمیل کاشمیری!

یہ بنارس کے محلہ گووند پورا کلاں کا ناریل بازار تھا جہاں ایک تختی لگی نظر آئی: آغا حشر لین۔ اسی گلی میں وہ مکان ابھی جوں کا توں موجود ہے جہاں ۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو آغا حشر پیدا ہوئے۔ ان کے کاغذات، تحریریں اور ڈراموں کے مسودے وہ سب اسی گھر میں محفوظ ہیں۔ صرف یہی نہیں، وہ مسہری بھی جس پر وہ سوتے، وہ آرام کرسی جس پر بیٹھتے، وہ میز جس پر لکھتے، وہ پیالیاں جن میں وہ چائے پیتے...... یہ ساری اشیا بڑی احتیاط سے رکھی گئی ہیں۔

دنیائے ادب کی یہ گرانقدر امانت سنبھالے آغا جمیل کاشمیری بے قدری کے اس دور میں ایسی شخصیت ہیں کہ اگر کسی کو دیکھنا ہو کہ امین کیسے ہوتے ہیں، وہ جا کر آغا حشر کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کے بیٹے کو دیکھے۔ ان کی زبان سے آغا حشر کی باتیں سنیے: بڑے ابا یوں تھے۔ یوں بیٹھتے، اس طرح خوش ہوتے، یوں ٹہل ٹہل کر منشیوں کو ڈرامے لکھواتے اور گھٹا گھر کر آئی ہو اور احباب کا جمگھٹا ہو تو یوں زبان کے تکلف اٹھا دیتے۔

میں پہنچا تو دیر تک بڑے ابا کے ناٹکوں کی باتیں سناتے رہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ میرے اصرار پر ناٹک کے بول سنائے۔ اسٹیج پر ہیروئن کس طرح بولتی تھی۔ کوملیا مت کر پکار، کریجوا لاگے کٹار، انھوں نے گا کر سنا دیا۔ پھر یہودی کی لڑکی کا ایک گانا، مجھ سے یہ وعدہ لے کر کہ میں ہنسوں گا نہیں، انھوں نے وہی تھیٹر کے انداز میں سنا دیا:

والی تو
جگ کا ہے والی تو
جنم جنم ترے نور کی تجلّی
ڈالی ڈالی، اعلیٰ اعلیٰ، کوملیا کو کے
تو جگ کا ہے والی تو

بنارس علم و ادب کا شہر رہا ہے۔ یہ کبیر، تلسی، چندر بھان، پریم چند کا شہر ہے۔ فارسی شاعر علی حزیں یہیں دفن ہیں۔ رجب علی بیگ سرور نے زندگی کے کتنے ہی برس یہاں گزارے۔ جگر مراد آبادی یہیں پیدا ہوئے۔ غالب کلکتے جاتے ہوئے صرف ایک مہینے بنارس میں رہے مگر وہ مہینا عمر بھر یاد رکھا۔

علم و ادب اور درس و تدریس کے اس شہر پر اب بڑی افتاد پڑی ہے۔ سفید پوشی کے لیے اور دو وقت پیٹ بھرنے کی خاطر اب گھروں کے لڑکے جولاہے اور ٹھٹھیرے بن چکے۔ سب سے برا حال مسلمانوں کا ہے۔ میں جن دنوں جرنیلی سڑک پر جا رہا تھا مجھ سے آگے آگے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد سفر کرتے رہے۔ ہر جگہ لوگ مجھے بتاتے کہ وہ آئے تھے۔ التجائیں کر رہے تھے کہ گھر کے لڑکوں کو دست کاری یقیناً سکھائیں مگر یونیورسٹی کی تعلیم بھی دلوائیں۔ روزی کی خاطر انھیں علم کی دولت سے محروم نہ رکھیں۔ علم پانے کی ضرورت کا احساس ایک نسل سے دوسری کو منتقل ہوتا ہے۔ اگر یہ کڑی ٹوٹ گئی تو ہمارے ہاتھوں میں صرف جہالت کی ڈور رہ جائے گی۔

چند دن بعد ہندوؤں کے علم کا حال دیکھنے بنارس ہندو یونیورسٹی پہنچا۔ شہر سے ذرا باہر گنگا کنارے نہایت صاف ستھرا اور آراستہ کیمپس۔ دائرے بناتی ہوئی سڑکیں، باغوں اور روشوں کے پچھواڑے سلیقے اور ترتیب سے بنی ہوئی عمارتیں۔ خالص ہندو طرز کے در، ویسے ہی ستون

بنارس میں مرکزی جامع دارالعلوم کی شاندار عمارت

اور ویسی ہی جالیاں۔ درس گاہوں، انتظامی دفتروں، رہائش گاہوں یہاں تک کہ معمولی خدمت گاروں کے کوارٹروں کی عمارتیں بھی اسی طرز تعمیر کا نمونہ تھیں۔

میں اردو کے نوجوان اور ہونہار استاد ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بتایئے بنارس میں تعلیم کا کیا حال ہے؟ انھوں نے بتایا:

"چونکہ یہاں بیشتر مسلم آبادی کی معیشت کا دارومدار دستکاری پر ہے، اس لیے ان لوگوں کی توجہ تعلیم کی طرف نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں تعلیمی اداروں میں بنارس ہندو یونیورسٹی بہت بڑا ادارہ ہے۔ اس میں بھی مسلمان طلبا کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اول تو تعلیم کی طرف ان کی توجہ کم ہے۔ دوسرے اس علاقے کے مسلمان طلبا زیادہ تر علی گڑھ کا رخ کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر باہر کسی سے ملاقات ہو تو وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ ہندو یونیورسٹی کے کس شعبے میں ہیں؟ جب عرض کروں کہ شعبۂ اردو سے متعلق ہوں تو بہت حیرت کے ساتھ دریافت کرتے ہیں کہ کیا بنارس میں اردو کا شعبہ بھی قائم ہے؟ میں ان کے سامنے اکثر و بیشتر یہ کہتا ہوں کہ صرف اُردو ہی نہیں یہاں فارسی اور عربی کے شعبے بھی ہیں۔ لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ آپ اس طرف آتے نہیں، توجہ نہیں دیتے۔ یہ صورت حال ہے۔"

چلیے مانا کہ ہندو یونیورسٹی کے نام میں کچھ ایسی تاثیر ہو گی کہ مسلمان نوجوان ادھر کا رخ نہیں کرتے، تو پھر شہر میں ایک مسلم جامعہ بھی ہے۔ چل کر اسے دیکھا جائے۔

بنارس کا مرکز دارالعلوم ریوڑی تالاب کے علاقے میں ہے۔ نہایت بڑی اور شاندار عمارت ہے۔ جماعتیں لگی ہیں، امتحان ہو رہے ہیں، تحقیق ہو رہی ہے، کتابیں چھاپی جا رہی ہیں، جریدے نکالے جا رہے ہیں، کتب خانہ آراستہ کیا جا رہا ہے، اقامت گاہیں بن رہی ہیں، جامعہ کا اسپتال تعمیر ہو رہا ہے اور فتاویٰ جاری ہو رہے ہیں۔

مگر یہ درس گاہ علمائے دین تو پیدا کر دے گی، آج کی دنیا کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والے نوجوان کہاں سے لائے گی؟ میں نے مرکز دارالعلوم کے استاد مولانا صفی الرحمٰن سے پوچھا کہ تنے بڑے ادارے میں پرائمری کے پانچ سال اور عربی تعلیم کے دس سال لگانے کے بعد لڑکے کیا کرتے ہیں؟

انھوں نے کہا: "عام طور پر کسی نہ کسی جگہ وہ تدریس

کا کام کرتے ہیں، تیئی بڑی تعداد ایسے طلبا کی ہے جو پڑھنے پڑھانے کا کام یا مساجد میں امامت اور خطابت کا بھی عمل انجام دیتے ہیں۔ کچھ تجارت میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ یہاں کی سند کی بنیاد پر کسی میڈیکل کالج میں داخلہ لیتے اور ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔ خاصی تعداد یہاں سے فارغ ہو کر کسی عرب ملک خاص طور پر سعودیہ میں مزید تعلیم پانے پہنچتی ہے۔ وہاں انھوں نے بہت کچھ آسانیاں اور سہولتیں حاصل کیں۔ کچھ لوگوں نے ایم اے کیا اور کچھ لوگ پی ایچ ڈی میں بھی پہنچے۔"

تو یہ تھا بنارس کا مرکزی دارالعلوم جس کی اعلیٰ جماعتوں میں تقریباً چار سو لڑکے زیر تعلیم تھے۔ ان میں سے ساڑھے تین سو گونڈہ، بہار اور بنگال سے آئے ہیں، خود بنارس کے بمشکل پچاس لڑکے ہیں۔ اس شہر کے لیے یہ معمولی نہیں، بڑی تشویش کی بات ہے۔

اور پھر منظر بدلا۔ یہ بنارس کے مشہور علاقے مدن پورہ میں پارچہ بافی کے پرانے تاجروں کی قدیم لیکن شاندار کوٹھیوں میں ایک وسیع و عریض کمرا ہے۔ اونچی اونچی چھتیں جن پر نقش و نگار ابھرے ہیں، رنگین شیشوں کی کھڑکیوں میں لوہے کے نفیس کام کی جالیاں لگی ہیں۔ دیواروں پر سبز روغن ہے اور سنہری بیلوں کے نقش و نگار بنے ہیں۔ اطالوی طرز کی ٹائلیں جو کنول کے پھولوں اور شہتوت کے پتوں سے مزین ہیں۔ دیواروں پر الماریاں جڑی ہیں جن میں کپڑے کے تھان لپٹے رکھے ہیں۔ ساڑیوں کے ہر ڈیزائن کا کوئی نام یا نمبر ہے۔ فرش پر سفید چاندنی بچھی ہے۔ ایک طرف مسند ہے جس پر لکڑی کا فرشی ڈیسک رکھا ہے، وہی جس پر بہی کھاتے لکھے جاتے ہیں۔

اسی کمرے میں ایک چھوٹی سی شعری نشست آراستہ ہے۔ ان تاجر گھرانوں کے ایک بزرگ، عبدالقدوس نسیم اپنی غزل پڑھ رہے ہیں۔ یوں بنارس میں مشاعرے کی روایت غنیمت ہے کہ ابھی تک چلی آرہی ہے۔

ہوش و خرد سے گزرے دیوانگی سے گزرے
کچھ بھی سمجھ نہ پائے اس برہمی سے گزرے
کس حال میں بتائیں تیری گلی سے گزرے
سب سے گزر گئے جب، تب اپنے جی سے گزرے
گر تم کو پوچھنا ہو، شام و سحر سے پوچھو
فرقت کے چار دن تھے کس بے کلی سے گزرے
آ کر نسیم ان کے دل کی کلی کھلا دو
برسوں گزر گئے ہیں راہ خوشی سے گزرے

یہ تھے عبدالقدوس نسیم نہایت شفیق، چھوٹوں کا بہت خیال رکھنے والے، نورانی ڈاڑھی اور اس پر ایک مسلسل مسکراہٹ جس میں سونے کے دانت جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ آنکھوں اور پیشانی سے جو نور پھوٹتا ہے، اس کا کیف سب سے جدا ہے۔

شعر و ادب کی بات چلی تو ہم کوچہ آغا حشر کاشمیری چلے۔ جہاں دال منڈی ختم ہوئی وہاں ناریل بازار شروع ہوا۔ اب آغا حشر کاشمیری مرحوم کی بیرونی بیٹھک تھی اور ان کے بھتیجے آغا جمیل احمد جن کی باتوں میں دال یا ناریل کی نہیں، گلوں کی خوشبو تھی۔ پرانے بنارس کی ساری تہذیب سمٹ کر ان کی گفتگو میں چلی آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس رات شمع کی روشنی میں آغا جمیل احمد شاہ کاشمیری نے بڑے ابا کی طرح مکالموں سے وہ منظر کھینچا کہ مرزا غالب کے کسی خط کا وہ فقرہ جی اٹھا:

"بنارس کا کیا کہنا! ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا، ادھر کو نہ آتا۔"

◆●●

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کی 3 بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بغور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے 2 سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے 6 شماروں کی اعزازی ترسیل کے علاوہ مطبوعات کی 2 خوبصورت کتابیں بھی دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ نومبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز 1۔ (الف) بوعلی سینا (ب) القانون فی الطب

قصہ کوئز 2۔ (الف) نیل آرمسٹرانگ (ب) اپالو II

قصہ کوئز 3۔ (الف) نیلسن منڈیلا (ب) افریقن نیشنل کانگریس

درست جوابات دینے والوں کے نام

محمد اسید خالد (ملتان)، ثاقب محمود بٹ (راولپنڈی)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، طٰہٰ لیسین (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، محمد منیر (حیدرآباد)، ماہ رخ (حیدرآباد)، عبدالسلیم انصاری (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، مرزا مسرت بیگ (حیدرآباد)، زاہد اقبال (آزاد کشمیر)، فائزہ بتول (فیصل آباد)، صادقہ احسان (اسلام آباد)، میاں محمد اویس مظہر (لاہور)، ملک ساجد ممتاز (چکوال)، نائلہ کوکب (لاہور)، اویس حبیب (فیصل آباد)، شمیم اختر (فیصل آباد)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، حمزہ غلام حسین (حیدرآباد)، محمد حبیب (فیصل آباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، محمد انیاس (منڈی بہاؤالدین)، منظور احمد بھگیو (نواب شاہ)، حامد محمود (جڑانوالہ)، محمود منور خان (سرگودھا)، محمد یوسف قریشی (حیدرآباد)، مہر محمد اقبال (جڑانوالہ)، آمنہ رمضان (عارف والا)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- زاہد اقبال (آزاد کشمیر)
- حامد محمود (جڑانوالہ)

آپ کو 6 ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

قصہ کوئز۔۱

بانی پاکستان۔ اصل نام محمد علی جناح۔ ''قائداعظم'' قومی خطاب تھا جو ۱۹۳۸ء سے ان کے اصل نام سے بھی زیادہ مشہور ہوگیا تھا۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے اپنے پہلے اجلاس میں اتفاق رائے سے اس عوامی خطاب کو سرکاری طور پر منظور کر لیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو بروز اتوار کراچی میں کھارادر کی بستی میں وزیر مینشن میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) تھا۔ ان کے والد چمڑے اور کھالوں کا کاروبار کرتے تھے اور چند برس پہلے ہی کاروبار میں توسیع کے لیے راج کوٹ سے کراچی منتقل ہوئے تھے اور کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔

محمد علی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ احمد علی اور بندے علی غیر معروف رہے۔ فاطمہ زندگی بھر ان کے ساتھ رہیں۔ مریم اور شیریں غیر معروف رہیں۔

(۱)۔ قائداعظم کے والد کا نام کیا تھا؟

(۲)۔ آپؒ کی تاریخ پیدائش و وفات بتایئے؟

قصہ کوئز۔۲

قائداعظم کی شخصیت پر پہلا سیاسی اثر دادا بھائی نوروجی کا ہوا جو انگلستان میں اس وقت پارلیمانی انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لے رہے تھے جب آپ لندن میں تعلیم پا رہے تھے۔ دادا بھائی کی انتخابی مہم میں آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ بعد میں دادا بھائی کے نجی سیکرٹری بن گئے۔ آپ نے سریندر ناتھ بینرجی گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتہ سے بھی اثر لیا۔ گوکھلے کے آپ زیادہ قریب تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''میں مسلم گوکھلے'' بننا چاہتا ہوں۔

بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۸۹۶ء میں واپس ہندوستان آ گئے۔ پہلے کراچی میں وکالت شروع کی۔ نہیں چلی تو ۱۸۹۷ء میں بمبئی جا کر دفتر کھول لیا لیکن تین سال تک مفلسی سے سابقہ پڑا رہا۔ ادھر کراچی میں ان کے والد کا کاروبار اچانک زبردست خسارے کی وجہ سے بیٹھ گیا تھا اور وہ گھر کا خرچہ چلانے کے لیے اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اس کی وکالت چلے تو گاڑی چلے۔ اتفاق سے بمبئی کے پریذیڈنسی مجسٹریٹ چھے ماہ کی رخصت پر چلے گئے تو ان کی جگہ عارضی طور پر آپ کو اس اسامی پر مامور کیا گیا۔ اس کے بعد آپ کی وکالت بھی چمکنے لگی۔

(۱)۔ آپ کی پہلی بیوی کا نام کیا تھا؟

(۲)۔ آپؒ نے رتی بائی سے شادی کب کی؟

قصہ کوئز۔۳

۱۹۴۶ء ۲۵ جون کو ''وزارتی مشن'' سے مایوس ہو کر انگریزوں اور کانگریس کی غلامی سے نجات پانے اور مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے ''راست اقدام'' کا اعلان کیا جو ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو منایا گیا۔

۱۹۴۷ء ۳ جون کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آل انڈیا ریڈیو پر قیام پاکستان کا اعلان کیا جس کا قائداعظم نے اپنی تقریر میں خیر مقدم کیا۔

آپ ۱۹۴۷ء ۱۴ اگست کو پاکستان کے گورنر جنرل بنے۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے لیکن وہ صرف ایک ہی اجلاس میں شریک ہو سکے کیونکہ تپ دق نے اور شدید مصروفیات نے انھیں تھکا دیا تھا۔ آپ آرام کی غرض سے بلوچستان کے صحت افزا مقام زیارت گئے اور وہیں پر وفات پائی۔ آپ کا مقبرہ کراچی کے قلب میں تعمیر کیا گیا۔

◆●●

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

وطنِ عزیز کا معیارِ تعلیم

طیب اعجاز قریشی نے بڑے اہم نکتے پر ایگزیکٹو نوٹ تحریر کیا۔ ہمارے ہاں تعلیم کاروبار بن چکی۔ اگر اس شعبے کی پڑتال کا کوئی مناسب نظام وضع نہیں ہوا' تو یہ شعبہ دن بدن تنزلی کا شکار رہے گا۔ اکیڈمیوں میں بھاری فیسیں لے کر پڑھانے والے اساتذہ سرکاری و نجی اداروں میں جان بوجھ کر طلبہ پہ اتنی توجہ نہیں دیتے جو انھیں دینی چاہیے۔ المیہ یہ ہے کہ وہ پھر ان اداروں سے تنخواہ کس بات کی لیتے ہیں؟

صغیرہ بانو شیریں کے انتقال پر دکھ ہوا۔ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اُن کے تجویز کردہ نسخے و مشورے انھیں سبھی کے دلوں میں زندہ رکھیں گے۔ ممکن ہو تو اُن کے مشوروں و نسخہ جات کو بطور قندِ مکرر شائع کیجیے۔ آزاد کشمیر کی سیاحت سے کئی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ زبردست تحریر ہے۔ کشمیر صحیح معنوں میں ایک جنت نظیر خطہ ہے۔ اسلامی زندگی کی تمام تحریریں و واقعات عمدہ سلسلہ ہے۔ اِن کی بدولت جہاں لوگوں کو اپنی زندگیاں اسلامی قواعد کے مطابق ڈھالنے میں مدد ملتی ہے' وہیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

صبا شفیق کا مضمون ''عرق النسا'' معلومات سے بھرپور تھا۔ سراج دین کی ''اپنی پہچان کبھی نہ بھولو'' ہماری ثقافت و روایات کو اجاگر کرتی زبردست تحریر ہے۔ وطن کی محبّت کے حوالے سے کسی نے زبردست بات کہی ہے:

''اپنی چھت اپنی ہوتی ہے' خواہ ٹپکنے والی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ٹپکنے لگے' تو اُسے چھوڑا نہیں بلکہ نقص دُور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اپنا ملک اپنا ہوتا ہے' اگر بگڑ

جائے تو چھوڑا نہیں بلکہ درست کیا جاتا ہے۔" اردو ڈائجسٹ کی خاص پہچان یہی ہے کہ یہ اپنی تہذیب و ثقافت سے جڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔

(رانا محمد شاہد' گلستان کالونی' بورے والا)

☆☆

وطن عزیز میں معیار تعلیم بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کرام کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کیا جائے۔ نیز ان سے غیر ضروری کام نہ کرائے جائیں۔ خاص طور پر محکمہ تعلیم پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کو بہت تنگ کرتا ہے۔ انھیں مانیٹرنگ کے نام پر تنگ کرنا معمول بن چکا۔ انھیں پریشان کرنے کی خاطر نئے حیلے بہانے گھڑے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ طلبہ کی حاضری کو لازمی بنانا ان کی ذمے داری ہے۔ حالانکہ جو طلبہ اسکول نہیں آتے' ان کے والدین کو اس امر کا پابند بنایا جائے کہ وہ مدرسے آئیں نہ کہ اساتذہ کو اس بات کا ذمے دار ٹھہرایا جائے۔

ماہ نومبر کا شمارہ معیاری تھا۔ صغیرہ آپا کی رحلت کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

(محمود منور خان' سنبلا نوالہ میانی' ضلع سرگودھا)

تصویر کا پہلا رخ

شمارہ اکتوبر ۲۰۱۴ء میں جناب طاہر مہدی کا مضمون "جب دونوں دشمن ڈوبیں گے" زیر مطالعہ آیا۔ مجھے نہیں معلوم طاہر صاحب نے عمر کی کتنی بہاریں دیکھی ہیں' لیکن اِن کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہوتی تو شاید انھیں تصویر کا پہلا رخ بھی یاد ہوتا۔ وہ اس قدر معصومیت سے ہر بات میں پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش نہ کرتے اور شاید انھیں بھارت کا گھناؤنا چہرہ بھی نظر آ جاتا۔

قصور پاکستان نہیں بلکہ اُس ہندو ذہنیت کا ہے جسے پاکستان کے نام ہی سے چڑ ہے۔ بھارتی نیتاؤں نے پہلے ہی دن اعلان کر دیا تھا کہ جب تک وہ پاکستان کا وجود ختم کر کے اکھنڈ بھارت نہیں بنا لیتے' وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ انھوں نے تاریخ بدل کر نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا برین واش کیا بلکہ متعدد پاکستانی بھی اپنی بھولی بھالی طبیعت کے باعث "امن کی آشا" کے جال میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔

سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

کاش ایسے لوگوں نے امت مسلمہ کا عظیم ہولوکاسٹ اور ۱۹۴۷ء کے المناک واقعات آنکھیں کھول کر پڑھے ہوتے تو امن کی آشا کے لاوے میں ڈوبنے سے پہلے اس کا کچھ سدباب کر لیتے۔ کاش وہ یہ سمجھ سکتے۔

مجھے مغلوب کرنے کو مرے دشمن کی جانب سے
کبھی نفرت کے تیر آئے کبھی چاہت کا دام آیا

مگر اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی اور یہ دام اس قدر خوش رنگ ہو چکا کہ شکار خود دوڑ کر اس میں پھنسنے کو تیار ہے۔ بھارت یہی چاہتا تھا۔

(ڈاکٹر سعید احمد ملک' ڈیفنس' لاہور)

تبصرہ کتب

اردو ڈائجسٹ میں تعارف کتب کا سلسلہ تسلسل سے ہر ماہ نہیں آ رہا' اس طرف توجہ دیجیے۔ ایک تجویز ہے کہ ہر ماہ انٹرنیٹ سے منتخب کردہ اردو زبان کی اچھی ویب سائٹس کا تفصیلی تعارف دیجیے۔

(محمد خلیل چودھری' دینہ)

تسنیم نورانی کا انٹرویو

طیب قریشی کا اداریہ ارباب و بست وکشاد کے لیے فکر و نظر کے کئی سنجیدہ در وا کر گیا۔ کاش اُسے سنجیدگی سے لیا جائے۔ جناب تسنیم نورانی کی داستانِ حیرت انگیز بھی دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ ان جیسے بیوروکریٹ کی پوری ٹیم اگر حکمرانوں کو مل جائے اور وہ ان کے تجربات' مشاہدات اور تصورات کو دل سے مان کر عمل درآمد کرائیں تو ہم بھی چین جیسا عظیم ملک بن سکتے ہیں۔ نورانی صاحب کے انٹرویو سے یہ بھی آشکار ہوا کہ ان جیسا وژن رکھنے اور عوام کی قسمت بدلنے والے منصوبہ ساز کئی سرکاری افسر حکمرانوں کی لالچ اور ہوسِ شہرت کی خو میں بہ گئے۔

> نورانی صاحب کے انٹرویو سے یہ بھی آشکار ہوا کہ ان جیسا وژن رکھنے اور عوام کی قسمت بدلنے والے منصوبہ ساز کئی سرکاری افسر حکمرانوں کی لالچ اور ہوسِ شہرت کی خو میں بہ گئے۔

''بھائی جی'' کے حالات پڑھ کر بہت سوں کو زندگی گزارنے کا وژن ملے گا' انتھک تگ و دو کا سبق اور یہ بھی کہ قناعت و صبر کا پہاڑ کیسے بنا جاتا ہے۔

علامہ اقبال سے متعلق ایم اسلم محترم کا پرانا واقعہ پڑھ کر میں بے حد اچھی اور پرانی یادوں میں کتنی ہی دیر کھویا رہا۔

(جاوید احمد صدیقی' مورگاہ' راولپنڈی)

قابلِ تقلید مثال

چند ماہ قبل پولیس کے نڈر جرنیل' ذوالفقار احمد چیمہ کا انٹرویو پڑھا۔ سابق ڈی آئی جی پنجاب' سید عنایت علی شاہ بھی ایسے ہی پولیس افسر تھے' نہایت دلیر' دیانت دار اور خوددار! ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی ان کے رعب و دبدبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ حالانکہ بڑے سے بڑا سرکاری افسر بھی ریٹائرڈ ہو جائے تو اسے چلا ہوا کارتوس کہتے ہیں اور اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

(سید مختار حسین کاظمی' سیدانوالہ' ضلع جہلم)

تندرستی کا ضامن

ایک شمارے میں لہسن' ادرک' شہد اور پھلوں کے سرکے پر مشتمل نسخہ پڑھا۔ یہ دل کی شریانیں صاف کرتا اور انسان کو تندرستی دیتا ہے۔ میں نے استعمال کیا' تو مجھے سرکہ موافق نہ آیا۔ اس کی تیزابیت نے جگر کو متاثر کیا۔

بعدازاں طب مشرق سے واقف ایک صاحب نے مشورہ دیا: شہد' لہسن و ادرک کا رس ایک ایک پیالی لیجیے۔ اس میں ایک پیالی انگور یا سیب کا رس ملایئے۔ پھر دو چمچ کلونجی اور ایک چمچ پسی دار چینی ڈال دیجیے۔ اس آمیزے کو اچھی طرح ملایئے اور پھر نوش جان کیجیے۔

الحمدللہ یہ نسخہ مجھے راس آیا۔ میرے دل کی دھڑکن معمول پہ ہے۔ نیز ڈاکٹر کے بقول شریانیں بھی صاف ہو چکیں۔

(نوال چودھری' فرینکفرٹ' جرمنی)

انسانی روح کی نشوونما

میری خواہش رہی ہے کہ کوئی ڈائجسٹ نوجوان طلبہ وطالبات کی علمی ضروریات پوری کر سکے۔ ماشاءاللہ اردو ڈائجسٹ صحیح معنوں میں انسانی روح کی نشوونما کرتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسالے کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق' واربرٹن)

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد تاج

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ نومبر میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز 1۔ (الف) حضرت ابوبکر صدیقؓ (ب) اُمیہ بن خلف

اسلامی کوئز 2۔ (الف) ابوجہل (ب) حضرت خدیجہؓ

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ فائزہ بتول (فیصل آباد) 2۔ صادقہ احسان (اسلام آباد) 3۔ عماد الاسلام (منڈی بہاؤالدین) 4۔ اطیب جان (واہ کینٹ)

درست جوابات دینے والوں کے نام

ماہ رخ (حیدرآباد)، اجلال سلیم (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، مرزا اسفار بیگ (حیدرآباد)، طہٰ یٰسین (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، محمد منیر (حیدرآباد)، ولی حسین (حیدرآباد)، فائزہ بتول (فیصل آباد)، صادقہ احسان (اسلام آباد)، ملک ساجد ممتاز (چکوال)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، عماد الاسلام (منڈی بہاؤالدین)، محسن حبیب (فیصل آباد)، ثاقب محمود بٹ (راولپنڈی)، محمد اسید خالد (ملتان)، میمونہ خالد (قصور)، اقصیٰ امتیاز (سیالکوٹ)، اطیب جان (واہ کینٹ)، اصدق امین (واہ کینٹ)، ازظفر وقاص (واہ کینٹ)، اشتیاق احمد (اوکاڑہ)، ڈاکٹر محمد افضل (اوکاڑہ)

اسلامی کوئز 1

کعبہ (بیت اللہ) مسلمانوں کا قبلہ، مکہ مکرمہ (حجاز مقدس) میں واقع ہے۔ تورات میں اسے "بیت ایل" کہا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اسے امن کی جگہ قرار دیا ہے۔ یہ مکعب شکل کی ایک عمارت ہے جو مختلف سائز کے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی ہے۔ 18 فٹ اور عرض 14 فٹ اور اونچائی 35 فٹ ہے۔ اس وقت اس پر چھت بھی ہے۔ تعمیر ابراہیمیؑ میں اس پر چھت نہیں ڈالی گئی تھی۔ اس میں ایک دروازہ ہے جو حرم شریف کی عام سطح سے 7/6 فٹ بلند ہے۔ دورِ نبویؐ میں اس کے دو دروازے ہوا کرتے تھے۔ ایک دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا تھا اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کا راستہ ہوتا تھا۔

(الف) کعبہ کی چوکھٹ کو کیا کہا جاتا ہے؟ (ب) تورات میں خانہ کعبہ کو کیا کہا گیا ہے؟

اسلامی کوئز 2

کفر، کفرانِ نعمت یعنی نعمت کی ناشکر گزاری کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے اور جو شخص اس فعل کا ارتکاب کرے اسے کافر کہا جاتا ہے۔ قرآن کے بیشتر مقامات میں اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو نہ ماننے کو کفر کہا گیا ہے جو وہ اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء اور رسل کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے تاکہ وہ راہِ راست اختیار کریں۔

سورۃ محمد کی آیت 1 میں نبی کریمؐ کی طرف سے پیش کردہ تعلیم و ہدایت کو نہ ماننے کو کفر کہا گیا ہے۔ اسی طرح آیت 8 میں اللہ کے دین کی مدد نہ کرنے کے فعل کو بھی کفر کہا گیا ہے۔

(الف) کفر کے لفظی معنی کیا ہیں؟ (ب) شرک کسے کہتے ہیں؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے وگرنہ TCS پہنچ نہیں پاتا اور گزشتہ کئی ماہ سے ہمیں TCS واپس مل رہے ہیں۔ (مدیر اُردو ڈائجسٹ لاہور)

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ لاہور